''چہارسُو''

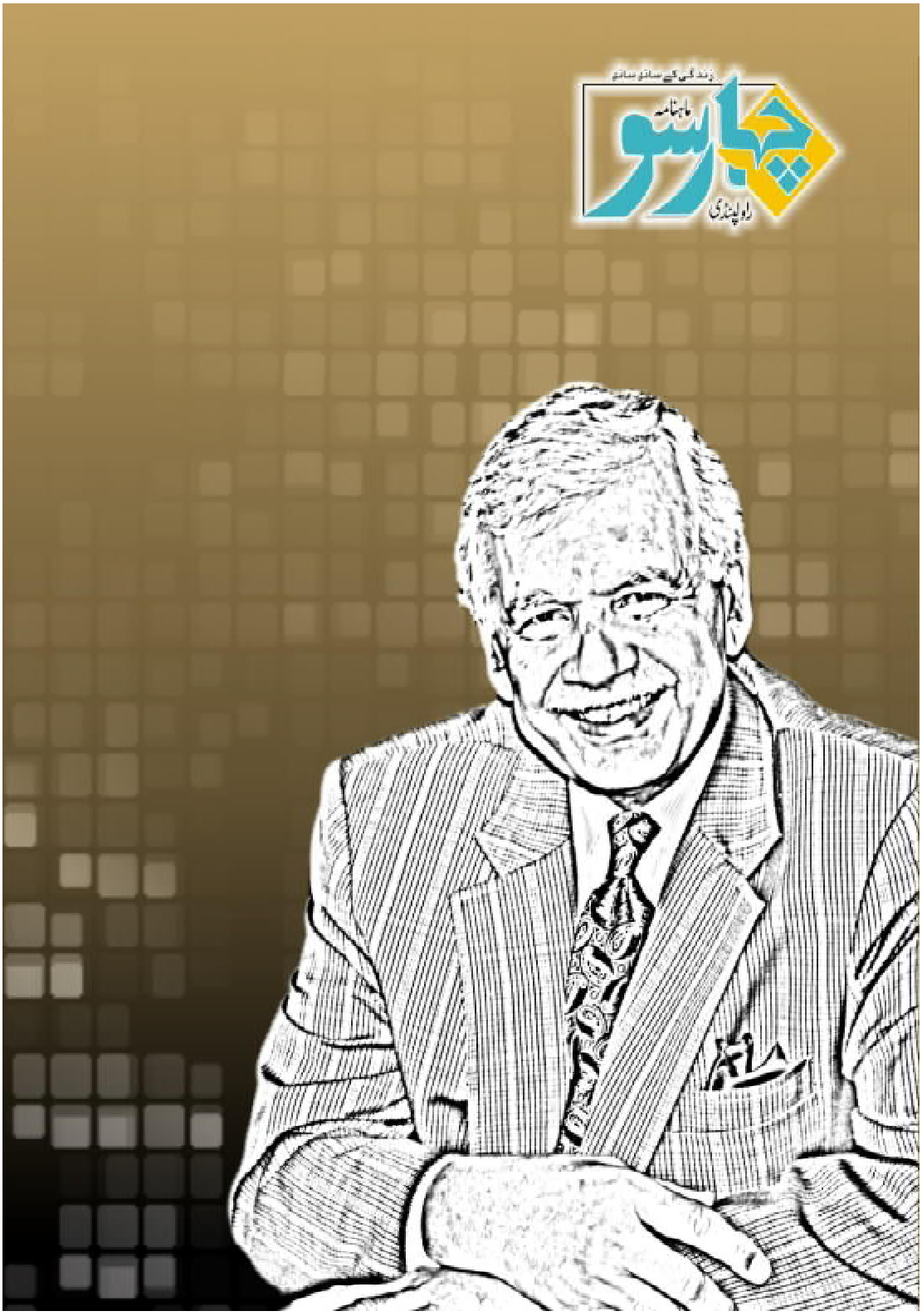

---- سراب منزل ----

اے خیّام کا شمار اردو کے بالغ نظر اور پڑھے لکھے اہلِ قلم میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں قاری کو چونکانے یا پند و نصیح کرنے کے بجائے بین السطور اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکثر وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہتے ہیں کہ قاری اُن کی کہانی پڑھنے کے بعد کچھ دیر سوچنے پر ضرور مجبور ہوتا ہے۔ ''سراب منزل'' خیّام صاحب کا پہلا اردو ناول ہے جس میں خیّام صاحب نے اپنے گھر بار اور وطن سے بے وفائی کرنے والوں کی روداد اس قدر حقیقت کے قریب لکھی ہے کہ پڑھنے والے کو ناول کے بجائے فلم کا گماں ہوتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ خیّام صاحب نے ناول میں وطن عزیز اور دیار غیر کے جن علاقوں کو ناول کے پلاٹ کے لیے چُنا ہے ان کی منظر کشی اور ترجمانی جزیات کے ساتھ حقیقت کے اس قدر قریب کی ہے کہ قاری کو خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوتی ہے کہ کوئی شخص ایک سے زائد تہذیب، تمدن اور علاقوں پر اس قدر علم اور عبور رکھ سکتا ہے؟ جی ہاں! خیّام صاحب نے اس حقیقت کو سچ کر دکھلایا ہے اور اُن کے ناول کا ہر ہر صفحہ، ہر ہر لائن اور ہر ہر لفظ اس کی گواہی چیخ چیخ کر دے رہا ہے۔

.....انوار شریف

اشاعت ۲۰۱۳ء، قیمت ۴۰۰، میڈیا گرافکس، A-997، سیکٹر 11-A، نارتھ ناظم آباد، کراچی۔

---- خاموش صدائیں ----

اردو ادب کی باقاعدہ ابتداء سے اساتذہ اور مستند جرائد سے نوجوان لکھنے والوں کا ایک طبقہ از خود منسلک ہو کر فیض یاب ہوا کرتا ہے۔ ہر چند اپنے گلزار جاوید جتھہ بندی سے کوسوں دور بھاگتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کے ہاں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی یا تربیت نہیں ہوتی۔ اس وقت حافظے میں ایسے بے شمار نام روشن ہو رہے ہیں جنہوں نے چہارسو کے پلیٹ فارم سے کچھ نہ کچھ شناخت اور پہچان ضرور حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر رینو بہل کو میں اس صف کی سردار کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحبہ قریب ڈیڑھ دہے سے افسانے لکھ رہی ہیں مگر گذشتہ چند سالوں میں اُن کے ہاں جو پختگی اور بالغ نظری دکھائی دی ہے اُس کے پیش نظر اردو ادب کو ایک بڑی خاتون افسانہ نگار کی نوید دینا ہر طرح سے قرین قیاس ہے۔ ہماری رائے کا جواز ڈاکٹر صاحبہ کی تازہ کتاب ''خاموش صدائے'' کی بیس کہانیاں بحسن و خوبی فراہم کر رہی ہیں۔

.....ڈاکٹر محمد علی صدیقی

اشاعت ۲۰۱۳ء، قیمت ۲۰۰، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، دہلی، بھارت۔

---- ''کانگاں'' ----

اردو ادب کے رسائل و جرائد کی ناگفتہ بہ حالت کسی بھی ادیب، شاعر، مدیر یا صاحب ذوق سے پوشیدہ نہیں ہے مگر علاقائی زبانوں کا جو حال ہے اُسے سوچ کر ہی دل ہولنے لگتا ہے۔ جناب افضل راز نہایت باقاعدگی سے پنجابی زبان کا جریدہ ''کانگاں'' شائع کر رہے ہیں۔ اس بار جریدہ ''کانگاں'' کا خاص شمارہ پنجابی کے نامور ادیب، شاعر، محقق، نقاد جناب اقبال زخمی کی شخصیت و فن کی نذر کیا گیا ہے۔ تین سو بارہ صفحات کے اس خاص شمارے میں جناب اقبال زخمی کے رشحات قلم کے علاوہ قریب پانچ درجن اہل قلم نے جناب اقبال زخمی کے شخصی و فنی کمالات پر روشنی ڈالی ہے۔ ''کانگاں'' کا یہ خاص شمارہ ایک جریدہ نہیں جناب اقبال زخمی کی حیات و کارنامے سے ممیز ایسی دستاویز ہے جو ہر ''ماں بولی دے عاشق'' کے گھر کی زینت ہونا لازمی ہے۔

.....محمد انعام الحق

اشاعت ۲۰۱۳ء، قیمت ۳۵۰، روزن بلڈنگ، ریلوے روڈ، گجرات۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۲' شمارہ: نومبر، دسمبر ۲۰۱۳ء

بانی مدیر اعلیٰ
سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل
گلزار جاوید

مدیران معاون
بینا جاوید
فاری شا
محمد انعام الحق

مجلسِ مشاورت

قارئین چہارسُو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ: 537/D-1' ویسٹریج-III' راولپنڈی، پاکستان۔
فون: 5462495,5490181-51-(92+)
فیکس: 5512172-(92+)
موبائل: 0558618-336-(92+)
ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز

شمع فروزاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر ریاض احمد ۵
خورشیدِ جہاں تاب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۶
محفلِ زیبا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۸
آپا تاج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر سید امجد حسین ۱۵
براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۶
قدیم سیّاحوں کی نظر میں۔۔۔۔ڈاکٹر سید امجد حسین ۲۶
MySprit۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ستیہ پال آنند ۲۸
محبت کی پکار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔منیب الرحمٰن ۳۶
بابائے پشاور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عبد الرحمٰن صاحبزادہ ۳۸
عشق بلاخیز۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ارشاد احمد صدیقی ۴۳
گلوبل انسان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر ظہور اعوان ۴۴
درِ مکتب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر اعجاز راہی ۴۶
رو میں ہے رخشِ عمر۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر سید امجد حسین ۴۷
تم میرے پاس ہوتے ہو۔۔۔۔ڈاکٹر سید امجد حسین ۵۰

نبوّت کا گلشن

صابر عظیم آبادی، ڈاکٹر انیس الرحمٰن۔ ۵۳

افسانے

غمِ حسین کے سوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اے خیام ۵۴
دھوپ کی تپش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سید سعید نقوی ۵۸
وقت نے کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر رینو بہل ۶۱
شہد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر شکیل احمد خان ۶۶

قول فقیہہ

محمود الحسن، عبداللہ جاوید، سرور انبالوی، غالب عرفان، آصف ثاقب، سریواستورند، خیال آفاقی، انتظار باقی، پرواز انبالوی، زہیر کنجاہی، صدیق شاہد، مقبول منظر، جاوید زیدی، عرش صہبائی۔ ۶۸

افسانے

میں بھی ڈیانا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فرخندہ شمیم ۷۶
ایڑی میں آنکھ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نجیب عمر ۷۷
مکمل ہوتا ہوا نوٹ۔۔۔۔۔۔۔۔۔نصرت بخاری ۷۹
وقت کی ریت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔احسان بن مجید ۸۱

دروازۂ دل

اجیت سنگھ حسرت، غلام نبی اعوان، نور زمان ناوک، عارف شفیق، جاوید رحمانی، نوید سروش، اسد بیگ، شگفتہ نازلی، ابراہیم عدیل، شائستہ سحر، سلیم ناز، ڈاکٹر فریاد آزر، حفیظ انجم، فرزانہ جاناں۔ ۸۳

ہوا کے دوش پر

ایک عام آدمی کی داستانِ حیات۔۔۔۔۔فیروز عالم ۸۸

شہرِ بسمل

ایوب خاور، یوگیندر بہل، انوار فیروز، یونس صابر، غالب عرفان، جاوید زیدی، جمال نقوی، فہیم شناس، حامد لطیف، جہانگیر اشرف، شگفتہ نازلی، زاہدہ عابد۔ ۹۲

آئینۂ فن

حدیثِ آرزومندی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سرور انبالوی ۱۰۰

نشانِ راہ

رباعی گوئی کا دلچسپ مظاہرہ۔۔۔۔۔ڈاکٹر تقی عابدی ۱۰۲

دستارِ حرّیت

وقت سے پرے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پروین شیر ۱۰۵

بساطِ بشاشت

پیشگی معذرت کے ساتھ۔۔۔ایس۔ایم معین قریشی ۱۰۷

ایک صدی کا قصّہ

ایس۔ڈی۔برمن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۰

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وقار جاوید ۱۱۴

☆

''شمعِ فروزاں''

جس شہر کا تو ایک باسی تھا
اُس شہر کی ہے پہچان ابھی
دل میں ہیں کچھ ارمان ابھی
تیری روح کبھی ٹولیڈو میں الریڈو میں
تاریخی شہر پشاور کے بازاروں میں
گردش کے موہنجوڈاروں میں
یا کھوئی ہوئی محبوبہ کے گلزاروں میں

تاریخ میں زندہ رہتا ہے
جو زیست میں مقصد رکھتا ہے
بے مقصد گرچہ بھٹکتا ہے

بچپن کی سنہری یادیں تھیں
انمول بہت سی باتیں تھیں
کچھ بچھڑ گئیں کچھ بکھر گئیں
کھوئیں بھی بہت پائیں بھی بہت
یادوں کی حسیں باراتیں تھیں

کیوں ڈھونڈ رہے ہو اے ہمدم
یادوں کے خزینے مدفن میں
جو بیت گیا سو بیت گیا
واپس نہیں آیا آنگن میں

دل باندھ رہے ہو اپنوں کے
تم اُلفت کی زنجیروں میں
جو سات سمندر پار ہیں وہ
رہتے ہیں تمہارے سپنوں میں

گر مشرق میں اور مغرب میں
برداشت بھی ہو اور پیار بھی ہو
رہنے کا سلیقہ جان لیں سب
پھر دھرتی جیسے جنت ہو

شب روز تمہارے آنے کی
یوں آس لگائے بیٹھے ہیں
اِک شمع فروزاں ہوتی ہے
اور آنگن جگمگ کرتے ہیں
احباب کی محفل سجتی ہے
سب دیپ بجھے جل اُٹھتے ہیں

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

اعجاز رحیم صاحب کی انگریزی نظم ڈاکٹر امجد حسین پشاوری سے ماخوذ

''خورشید جہاں تاب''

فاری شا (اسلام آباد)

نام: ڈاکٹر سید امجد حسین

ادبی شناخت: سید امجد زیدی (۱۹۴۸ء تا ۱۹۶۲ء)

والد: آغا سید گل بادشاہ (وفات ۱۹۴۴ء)

پیدائش: ۵/مارچ ۱۹۳۸ء پشاور شہر

تعلیم:

ایم بی بی ایس، خیبر میڈیکل کالج، پشاور ۱۹۶۲ء

آنرز اردو (ادیب عالم) سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ، پشاور ۱۹۶۳ء

ڈپلومیٹ امریکن بورڈ آف سرجری ۱۹۶۹ء

ڈپلومیٹ امریکن بورڈ آف کارڈیوواسکولر سرجری ۱۹۷۰ء

ایف آر سی ایس (کینیڈا) ۱۹۷۰ء

پیشہ وارانہ تعلیم:

جنرل سرجری اور کارڈیوواسکولر سرجری کی ٹریننگ امریکہ ۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۰ء

پیشہ وارانہ مصروفیات:

انسٹرکٹر سرجری، وین سٹیٹ یونیورسٹی، ڈیٹرائٹ، امریکہ	۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۰ء
اسسٹنٹ پروفیسر سرجری خیبر میڈیکل کالج، پشاور	۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۴ء
پروفیسر آف سرجری، یونیورسٹی آف ٹولیڈو	۱۹۷۵ء تا ۲۰۰۴ء
ایمریٹس پروفیسر آف کارڈیوتھوریسک سرجری، یونیورسٹی آف ٹولیڈو	۲۰۰۴ء تا حال
چیئرمین شعبہ سرجری، سینٹ چارلس ہسپتال، ٹولیڈو	۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۴ء
	۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۵ء
چیف آف میڈیکل سٹاف، سینٹ چارلس ہسپتال، ٹولیڈو	۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۲ء
ایمریٹس پروفیسر خیبر میڈیکل کالج، پشاور	
ایمریٹس پروفیسر خیبر میڈیکل یونیورسٹی، پشاور	

پیشہ ورانہ تحقیقی مقالات:

۵۰ تحقیقی اور سائنسی مقالات امریکن اور بین الاقوامی میڈیکل لٹریچر میں ۱۹۶۶ء سے ۱۹۹۹ء تک چھپے۔

میڈیکل مشن اور تدریس:

ڈومینیکن ری پبلک میں کئی سال میڈیکل مشن کے ساتھ کام کرتے رہے۔

۱۹۷۶ء سے ہر سال خیبر میڈیکل کالج میں ایک مہینہ تدریسی کی۔ اس کے علاوہ چین، لیبیاء، ہندوستان اور امریکہ کی کئی درسگاہوں میں وزیٹنگ پروفیسر رہے۔

ادبی مصروفیات (انگریزی اور اردو)

۔ایڈیٹر پیام عمل، پندرہ روزہ قلمی پوسٹر اخبار، گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ا پشاور	۱۹۵۰ء۔۱۹۵۳
۔ایڈیٹر مجلّہ خیبر (اردو سیکشن) اسلامیہ کالج، پشاور	۱۹۵۴۔۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۷
۔ایڈیٹر مجلّہ سینا (اردو سیکشن) خیبر میڈیکل کالج، پشاور	۱۹۵۹ء
۔کالمسٹ روزنامہ بلیڈ (انگریزی) ٹولیڈو، اوہایو	۱۹۹۴ء تا حال
۔کالمسٹ روزنامہ آج، پشاور	۲۰۰۹ء تا حال
۔کالمسٹ روزنامہ فرانٹیر پوسٹ، پشاور	۱۹۹۸ء تا ۲۰۰۱ء
۔کالمسٹ ہفتہ وار پاکستان لنک، کیلی فورنیا، امریکہ	۱۹۹۷ء تا ۲۰۱۰ء
۔ایڈیٹر دی آلٹرنیٹ وائس، سہ ماہی انگریزی مجلّہ، مذہبی روشن خیال کا علمبردار	۲۰۰۹ء۔۲۰۱۱ء

(اس کے علاوہ ٹولیڈو میگزین، نالج انٹرنیشنل، ایکسپلوزر جرنل، ہیرالڈ میگزین، سینا، پی آئی اے میگزین ہم سفر، اور دیگر کئی اخبارات ورسائل کے لیے بھی مضامین لکھے)

۔ایڈیٹر ٹولیڈو میڈیسن، اکادمی آف میڈیسن کا سہہ ماہی مجلّہ

۔معاون ایڈیٹر سہہ ماہی زاویہ، امریکہ ۱۹۹۹ء تا حال

مہم جوئی:

۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۶ء تک دریائے سندھ کی مہم جوئی کے سلسلے میں چار مختلف مہموں میں دریائے سندھ کی فوٹو گرافی کی اور دریا کے کنارے رہنے والے لوگوں کا مطالعہ کیا۔ ۱۹۹۶ء میں ٹیم اِنڈس، تبت کے مغربی پہاڑی سلسلے کائی لاش میں دریائے سندھ کے منبع کو پہنچی۔ ان مہموں کی داستان ایکسپلوزر کلب کے جرنل میں ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ کارکردگی امریکہ کے ایوان نمائندگان کی کاروائی میں ۱۹۹۷ء میں شامل و شائع ہوئی۔ ان مہمات کی ڈاکومنٹری امریکن پبلک ٹیلی ویژن (پی بی ایس) سے ۲۰۰۵ء میں نشر کی گئی۔

فوٹو گرافی:

۱۹۸۲ء سے لے کر ۲۰۰۶ء تک ڈاکٹر صاحب کی لی گئی تصویروں کی نمائش متعدد بار ہو چکی ہے اور فوٹو گرافی کے مقابلوں میں کئی انعام مل چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تصویریں ۳۲ میگزین سرورق اور ۶ کیلنڈروں میں چھپ چکی ہیں۔

سپورٹس:

آپ ۱۹۷۶ء سے سکوائش کھیل رہے ہیں اور کئی بار آپ نے سی لیول کی ٹورنمنٹ جیتی ہیں۔

تصنیفاتِ اردو:

۱ یک شہرآرزو (انعام یافتہ اباسین آرٹ کونسل، پشاور) ۱۹۹۶ء
۲ مٹی کا قرض (پشاور کے حوالے سے ضمیر جعفری، ضیاء محی الدین، ارشاد صدیقی اور باقی چند لکھاریوں کے ساتھ خط و کتابت) ۲۰۰۰ء
۳ چتراں والا کٹورہ (خاکے) ۲۰۰۳
۴ عالم میں انتخاب۔ پشاور (پشاور شہر کا مختصر انسائیکلوپیڈیا) ۲۰۰۹ء
۵ درِ کتب (اُن درسگاہوں اور اُن درسگاہوں کے چیدہ چیدہ استادوں کی داستان جہاں مصنف نے تعلیم حاصل کی) ۲۰۰۵
۶ شہوانی اردو شاعری (تالیف) ۲۰۱۲ء
۷ بھاکری منزل۔ پشاور کے علاقہ مچھی ہٹہ کے سید گھرانے کی داستان (اباسین انعام یافتہ)
(چھوٹی بہن ثریا منور شاہ کے اشتراک سے)

انگریزی

1	The frontier town of Peshawar. A brif History	1993
2	Of Home and Country (Essays)	1998
3	First 150 Years: A History of the Acadmey of Medicine of Toledo.	2004
4	APPNA QISSA: A History of the Assocation of Pakistani Physicians of North America	2004
5	The Taliban & Beyond	2001
6	Treading a fire line (collection of cloumns)	2009
7	With Whom Shall I Talk in the Dead of Night (Latters to departed wife)	2012

اعزازات:

سید امجد حسین کے نام معنون کی ہوئی مطبوعات:

ڈاکٹر ظہور ایوان کی کتاب، داستان رپورتاژ نگاری
تاج سعید کی کتاب شہرِ ہفت رنگ
سینا، مجلّہ خیبر میڈیکل کالج ۱۹۹۲ء شمارہ

متفرق اعزازات:

۱ خیبر میڈیکل کالج کا بہترین گریجویٹ، بہ موقع سلور جوبلی ۱۹۸۰ء
۲ اعزازی سند ریاست اوہایو کے ایوان نمائندگان کی طرف سے ۱۹۸۳ء
۳ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ کے ہال آف فیم (Fame) میں شمولیت ۱۹۸۶ء
۴ خیبر میڈیکل کالج کی جانب سے فرزند خیبر کا خطاب ۱۹۹۳ء
۵ گولڈ میڈل، ایسوسی ایشن آف پاکستان فزیشنز امریکہ ۱۹۹۵ء
۶ ٹیم انڈس کے دریائے سندھ کے منبع تک پہنچنے پر اوہایو ریاست کے ایوانِ نمائندگان کا ریزولوشن اور سند ۱۹۹۶ء
۷ گورنر صوبہ سرحد اور قلم قبیلے کی طرف سے بابائے پشاور کا خطاب ۱۹۹۸ء
۸ ٹولیڈو سرجیکل سوسائٹی کا (Meritorious) ایوارڈ ۲۰۰۱ء
۹ سینٹ چارلس ہسپتال کی واسکولر لیبارٹری امجد حسین کے نام معنون ۲۰۰۵ء
۱۰ یونیورسٹی آف ٹولیڈو کا کارڈیو واسکولر سرجری پروفیسر شپ سید امجد حسین کے نام پر قائم کرنے کا اعلان ۲۰۰۹ء
۱۱ یونیورسٹی آف ٹولیڈو کا سالانہ سید امجد حسین میڈیکل ہسٹری لیکچر قائم کرنے کا اعلان ۲۰۰۹ء
۱۲ میڈیکل مشن ہال آف فیم Medical Mission Hall of Fame میں داخلے کا اعلان ۲۰۱۲ء
۱۳ صوبہ سرحد کی تاریخ میں ۳۶ اہم شخصیات/ پشاور یونیورسٹی، پاکستان سٹڈی سنٹر کی کتاب میں ڈاکٹر امجد حسین کی شمولیت۔ ۲۰۰۵ء

''پشاور کی تاریخ''

ڈاکٹر سید امجد حسین نے پشاور کی سابقہ اور حالیہ تاریخ اس کلاسیکل شہر کی تہذیب اور خاص ثقافت کے بارے میں مختلف پشاوری اصحاب کے توسط سے لاتعداد حقائق اتنے سلیقے سے جمع کر دیئے ہیں کہ آنے والے مورخین کا کام آسان ہو گیا ہے۔ اس نوعیت کی کتابوں کے لیے مواد فراہم کرنے کی مہم کم ہی اصحاب سر کر پاتے ہیں مگر ڈاکٹر سید امجد حسین نے امریکہ میں بیٹھ کر اپنے بعض احباب کے تعاون سے پشاور اور اہل پشاور کے ہر پہلو، ہر رخ، ہر انداز کی بازیافت اتنے بھرپور انداز میں کی ہے کہ جیسے انہیں پشاور سے محض لگاؤ نہیں، عشق ہے۔ میں نے بھی پشاور میں دو برس گزارے ہیں چنانچہ اس کتاب کی ایک ایک سطر مجھے یہ گواہی دیتی محسوس ہوئی ہے کہ پشاور کے موضوع کو اتنی لگن اور اتنی حقیقت پسندی سے شاید ہی کسی نے برتا ہو ڈاکٹر سید امجد حسین اس تالیفی کارنامے پر آج کے علاوہ آئندہ نسلوں کی بھی تحسین کے مستحق ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

''محفلِ زیبا''

۔ ترتیب وتدوین ۔

عطیہ سکندر علی

(سکھر)

۲ر ستمبر ۱۹۹۷ء، نیویارک

بزرگوارم شاہ صاحب، تسلیمات۔

آپ سوچیں گے اچانک خط لے کر کیسے ٹپک پڑا ہوں۔ میرا خیال ہے کچھ عرصہ پہلے آپ سے عرض کر چکا تھا کہ خط وکتابت کا سلسلہ بحال کیا جانا چاہیے اور آپ نے اتفاق بھی کیا تھا۔ میں نے کہنے کو کہہ تو دیا مگر خط لکھنا جوئے شیر لانا بن گیا۔ لکھنے کو کئی باتیں سامنے رکھی تھیں مگر لکھوں کیسے؟ آج ایک ایسی بات ہوگئی کہ لکھنا ہی پڑ گیا۔ شام کو حضرت ضمیر جعفری صاحب کا فون آیا تھا۔ آپ کی کتاب ''یک شہر آرزو'' انہیں مل چکی تھی اور جب سے ملی تھی ان کے زیر مطالعہ تھی۔ وہ ہمارے خطوط پڑھ کر بے حد محظوظ ہوئے تھے۔ بڑی تعریف کر رہے تھے کہہ رہے تھے اپنی طرز کی بہت ہی عمدہ کتاب ہے۔ اپنے شہر اور اپنے گلی محلوں کی محبت کا بہت ہی متاثر کن تذکرہ ہے۔ کہہ رہے تھے میں اگر انہیں ایک گلی کی سیر کروا رہا تھا تو آپ کسی اور گلی میں انہیں گھما پھرا رہے تھے۔ آپ کے زور قلم کی تعریف کر رہے تھے۔ جعفری صاحب کو میں نے کتاب کا پس منظر سنایا تو انہیں کچھ حیرانی سی ہوئی کہ ہمارے درمیان کسی کتابی ارادے کے بغیر شروع ہونے والی خط وکتابت کس طرح کتاب کی شکل اختیار کر گئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ سلسلہ پھر شروع کرنے کا خیال ہے۔ مجھے امید ہے وہ اپنے کالم میں یک شہر آرزو کا تذکرہ کریں گے۔

حلقہ اربابِ ذوق کے گزشتہ اجلاس میں (۲۴ر اگست) پٹیالہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر آتم ہمراہی تشریف لائے تھے۔ لگ بھگ ۳۵ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے کارناموں میں سرفہرست کام یہ ہے کہ شاہنامہ فردوسی اور شاہنامہ حفیظ جالندھری پنجابی میں ترجمہ کروا چکنے کے بعد خود شاہنامہ پنجاب لکھ رہے ہیں۔ اپنے لیکچر میں پنجاب کا کوئی پانچ ہزار سال کا تاریخی جغرافیہ اور حدود اربعہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے پشاور کو بھی سمیٹ لیا تھا۔ پشاور پر سکھوں کی حکومت تو رہی ہے مگر اس حکومت سے پہلے کا پشاور کیا تھا؟ اور یہ پنجاب کا حصہ کیونکر تھا؟ ہندکو کے حوالے سے ہمارا دعویٰ تو یہی ہے کہ پشاور اپنے طور پر ایک تہذیب کا مرکز تھا۔ شمال سے جنوب کی طرف قافلوں، کاروانوں اور لشکروں کے سفر کو اگر زبان اور تہذیب کا سفر سمجھا جائے تو کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ پنجاب کے میدانی علاقوں میں جس تہذیب کو پنجابی تہذیب کا نام دیا گیا ہے اس کا اصل مرکز پشاور ہی تھا؟ یا پھر یہ کہ پشاور پنجاب ہی کی تہذیب کا ایک دور افتادہ حصہ تھا جو مرکز سے دور ہونے کی بنا پر اور وسطی ایشیا کے تہذیبی مراکز سے قربت کے علاوہ ایرانیوں اور یونانیوں کے اثر کی وجہ سے اپنی الگ شناخت بنا بیٹھا جو پنجابی تہذیب سے کسی قدر مختلف تھی۔ مجھے موخر الذکر شبہ درست نظر آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ گندھارا اور ہڑپہ کی تہذیبوں میں پائی جانی والی مماثلت اس شبے کی تائید کرتی ہے۔ آج کی پنجابی اور ہماری ہندکو میں مجھے تو بہت کم فرق نظر آتا ہے۔ لہجے کا فرق تو کسی بھی زبان میں چالیس میل کے فاصلے میں بدل جانے کی روایت موجود ہی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس خطے کی تہذیب تو ایک ہی ہو مگر فاصلوں اور قرب وجوار کے اثرات نے انہیں ایک دوسرے سے مختلف بنا دیا ہو؟

ہندکو بطور زبان کسی قابل ذکر علمی ادبی ذخیرے کی حامل نہیں ہے ہر چند کہیں ہے کہ نہیں ہے۔ سائیں احمد علی سے آگے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے اور سائیں احمد علی کل کی بات ہے۔ کوئی پچاس سال پہلے ہی تو فوت ہوئے تھے۔ سائیں احمد علی کی زندگی کا اہم حصہ پنڈی میں گزرا جہاں وہ ایک امیر کبیر سکھ سردار کے (سرداراں دے باغ میں) سالہا سال تک مہمان رہے۔ سائیں احمد علی کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ ان پر رائج الوقت پنجابی کا اثر کم اور فارسی کا اثر زیادہ تھا جس کی وجہ ان کا پشاوری ہونا تھا مگر ان کی پنجابیوں میں مقبولیت اور رہائش سے پتہ چلتا ہے کہ اگر ان کی شاعری ہندکو شاعری بھی تھی تو اسے پنجابی ہی کی ایک قسم سمجھا گیا ہوگا۔ جیسا کہ سرائیکی کو سمجھا جاتا ہے حالانکہ سرائیکی والے اسی طرح اپنے آپ کو پنجابی سمجھنے سے انکاری ہیں جس طرح ہم ہندکو والے۔ بدقسمتی سے ہم سرائیکی والوں جتنا علمی ادبی اثاثہ بھی نہیں رکھتے۔

مجھے ایک اور بات سے بھی پشاوری تہذیب اور معاشرت کے پنجابی توسیع ہونے کا شبہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں پنجابی آبادکاروں کا اثر ورسوخ بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ میں ذاتی طور پر ایسے کتنے خاندانوں کی نشاندہی کر سکتا ہوں جو پنجاب سے یہاں آ کر آباد ہوئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ سادات کا باہر سے آنا تو ثابت ہی ہے۔ قریشی، اعوان، میر، صدیقی، فاروقی یا پھر کشمیر سے ہجرت کر کے آبادکاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس کے باوجود ان پر پنجابی زبان اور تہذیب حاوی نظر آتی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ وہ کشمیر سے باہر اپنے مرکز سے دوری کی بنا پر اپنی زبان اور تہذیب سے کسی قدر کٹ گئے اور انہوں نے پنجابی اثر قبول کر لیا۔ جس طرح پشاور میں آباد ہونے والوں نے قبول کیا۔ مجھے نہیں معلوم میں جو کچھ کہنا چاہ رہا ہوں۔ کہہ بھی سکا ہوں یا نہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس اہم مسئلے پر روشنی ڈالیں بلکہ پشاور میں ہندکو کے اکابرین

سے بھی اظہار خیال کروائیں تا کہ اس کی تاریخ اور جغرافیے کا پتہ چل سکے۔

کوئی سال بھر پہلے کسی نے پشاور کے بارے میں جریدہ نامی کتابچہ شائع کیا تھا آپ نے تو دیکھا ہوگا۔ مجھے ارشاد صدیقی صاحب نے بھجوایا تھا۔ بے حد مایوسی ہوئی تھی اس کتابچے کا بیشتر مواد کم وبیش تیس پینتیس سال پرانا تھا اور وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ اس عرصے میں کوئی اور محقق سامنے نہیں آیا۔ جس نے ہندکو اور پنجابی میں بہت زیادہ مشابہت کے اسباب پر روشنی ڈالی ہو۔ یہ تو بارہا سن چکے ہیں کہ اردو زبان ہندکو ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہ دعویٰ ڈاکٹر محمود شیرانی مرحوم پنجابی کے حوالے سے بھی کر چکے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اردو پنجابی زبان کی ترقی یافتہ شکل ہو سکتی ہے تو پنجابی ہندکو کی ترقی یافتہ شکل کیوں نہیں ہو سکتی؟ ہندکو زبان کا کسی بڑے علمی اور ادبی اثاثے سے محروم ہونا یہی ثابت کرتا ہے کہ یہ اپنے موجودہ حلقہ اثر میں بول چال تک محدود رہی لیکن پنجاب میں جا کر اسے ترقی ملی۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پشاور کے بارے میں کسی کتاب یا کتابچے کی اشاعت کی غرض وغایت علمی اور تحقیقی مقصد کے تابع ہونی چاہیے۔ کہتے ہیں کسی مرد دانا کو سڑک پر گھوڑے کی نعل ہاتھ لگ گئی تھی اُس نے اس نعل کی خاطر گھوڑا خرید لیا۔ کچھ ایسی ہی مثال اس جریدے کی ہے جسے پشاور کے سر تھوپا گیا ہے۔ کوئی پوچھے ہمارے پیارے دوست ملک راحت کے مضمون ادیب پشاوری کا پشاور کی تہذیب اور ہندکو کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ ادیب پشاوری، پشاور کا رہنے والا فارسی کا ایک شاعر تھا جس نے ساری زندگی ایران میں گزاری۔ کسی محقق نے اس کی ہندکو پر تاحال کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ پروفیسر دانی کو بار بار بیچنا بھی ایسا ہی ہے درآنحال یہ کہ ہمارے کئی دانشوران کی تحقیق کو کئی مقامات پر متنازعہ قرار دے چکے ہیں۔ میرا خیال ہے اس بات کی اشد ضرورت تھی اور ہے کہ پروفیسر دانی سے آگے کچھ سوچا جائے، اگر پٹیالہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر آتم ہمراہی تحقیق جاری رکھ سکتے ہیں تو اس خطے کے شمال مغرب میں کوئی اور کیوں نہیں سوچ سکتا، کیوں نہیں لکھ سکتا؟

جوہر میر

یکم ستمبر ۱۹۹۷ء، نیویارک۔

آغا جان امجد حسین جی! دعائیں۔

یک شہر آرزو کا نسخہ (بلکہ نسخہ شفا) بھیجنے اور اس کے ساتھ اتنا میٹھا خط لکھنے کا یک صد ہزار شکریہ بھی ادا کروں تو کم ہوگا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے آپ نے تو ہمیں خوشحال کر دیا۔

جوہر میر صاحب اپنے خطوط میں آپ کو آغا جی، شاہ صاحب، سید صاحب اور زیدی صاحب کے القابات سے یاد کرتے ہیں۔ ہم آپ کو آغا جان کہیں گے۔

تو آغا جان! جب سے یک شہر آرزو ملی (بلکہ ایک پٹھان کی تصنیف کے ناتے سے) ملا ہے اس نے مجھے کوئی اور کام نہیں کرنے دیا۔ نیویارک میں پیر خانہ یعنی جوہر میر کا گھر ہمارے لیے پیر خانہ بن گیا ہے کہ ہر پیر کی رات ان کے ہاں جسے حجرہ قصہ خوانی بھی کہتے ہیں چند درویشوں کا رت جگا رہتا ہے، اس محفل میں بڑے سیاست دان اور دانشور اور مفکر زیر بحث رہتے ہیں ایک سے ایک اہم قومی مسئلے پر گفتگو ہوتی ہے مگر گذشتہ پیر کو یک شہر آرزو کے سوا کوئی مسئلہ یا شخص حجرہ قصہ خوانی میں داخل نہ ہو سکا۔ نیویارک میں ڈاکٹروں کے کنونشن میں آپ کے نثر پارے نے چونکایا تو تھا جس کا ذکر ہم نے روزنامہ خبریں لاہور میں اپنے کالم میں بھی کیا مگر یہ اندازہ اب کتاب سے ہوا کہ آپ کٹ پیس Cut piece ہی نہیں ''بلکہ تھان کے تھان'' ایسے شوخ شنگ رنگ کے نکالنے پر قادر ہیں ایسی دلچسپ کتاب کو ہم ترسے ہوئے تھے اس کتاب میں تو کئی کتابیں ہیں یہ تو گویا آپ نے کتابوں کی ماں لکھ دی ہے۔ ایک ہی دیگ میں کئی ذائقوں والی بریانی پکا ڈالی۔ جوہر میر نے آپ کی انگلی چھوڑی تو پروفیسر ظہور احمد اعوان نے تھام لی اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر روپ کے سندر مکھ، کتاب نے مجھے کوئی کام کرنے دیا نہ پشاور سے نکلنے دیا جس طرح محمود غزنوی کے ہندوستان پر سترہ حملوں میں سومنات تک غزنی اس کے ساتھ ساتھ رہا اسی طرح آپ جہاں بھی ہوں پشاور آپ کے ساتھ رہتا ہے آپ کو پشاور نے ہیرا تو آپ نے پشاور کی مٹی کے ذرے ذرے کو موتی بنا دیا۔ سچ کہتا ہوں کہ کتاب کا دیباچہ پڑھنے کے بعد جب میں باہر نکلا تو نیویارک مجھے پشاور سے چھوٹا بلکہ ہیچ معلوم ہونے لگا۔ شہر صرف دیواروں کو نہیں دیواروں کے پیچھے اس کلچر کو کہتے ہیں جو گھروں کے اندر ہوتا ہے۔ شہر دیواروں کا سایہ نہیں دیواروں کی چھاؤں ہوتا ہے نیویارک کی دیواروں کے آگے جو کچھ بھی ہو پیچھے کچھ بھی نہیں ہے۔ نپولین قد میں اپنے بہت سے معاصر جرنیلوں سے چھوٹا تھا مگر کارکردگی میں سب سے عظیم تھا پشاور کی گلیوں میں تاریخ انسان کی کئی صدیاں جھاڑو دے رہی ہیں۔ وسطی ایشیا سے آنے والے قافلوں کے اونٹ اپنی سوغاتیں اسی شہر کے بازاروں میں اتارتے رہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر درہ خیبر نہ ہوتا تو پاکستان بھی شاید معرض وجود میں نہ آتا۔ آپ نے شہر کی کہانی اس محبت اور ہنرمندی سے بیان کی ہے کہ اینٹیں بولنے لگتی ہیں۔ ڈاکٹر امجد لکھتے رہو کہ تمہارے قلم سے درہ خیبر سے آنے والی تازہ اور طاقت ور ہوا آ رہی ہے۔ اپنی ہندکو کی گلابی پیوند کاری سے آپ اردو کو ایک نئی مٹھاس دے رہے ہیں۔ مٹھاس کے علاوہ اپنائیت کی چاندنی بھی۔ یہ درخواست میں کروں گا کہ مزاح جم کر لکھیں۔ مجھے آپ کے اندر ایک دوسرا شفیق الرحمٰن دکھائی دے رہا ہے اس کتاب میں میری محویت کا یہ عالم رہا کہ جب کسی نے کچھ خلل ڈالنا چاہا ہم نے اپنا یہ شعر گنگنا دیا۔

موت سے کہہ دو ابھی بیرون در ٹھہری رہے
زندگی کی محفل زیبا ہے میرے سامنے

سید ضمیر جعفری

''چہارسُو''

۱۶/اکتوبر ۱۹۹۷ء، پشاور۔

برادرم، السلام علیکم!

آپ کا خط ملا میں نے دو تین مرتبہ سہیل سے رابطہ کرنے کی کوشش کی اس کا فون آج کل نہیں ہے، میڈیکل سنٹر ڈبگری والی دکان اس نے چھوڑ دی ہے گھر پر فون نہیں لگا ابھی ابھی میں نے اس کی والدہ کے گھر فون کیا تو اتفاق سے مجھے وہ مل گیا۔ جمعہ کے روز وہ بعد از دوپہر اکثر یہاں ہوتا ہے میں نے خط کا تذکرہ کیا تو اس نے کہا کہ ساری کتابیں زبیر لے کر چلا گیا ہے اور اس کے پاس ہیں جلد ساز کی رقم کے بارے میں کہا کہ میں نے پرنٹرز کو دے دی تھی وہ اس نے اس کے (جلد ساز) کو دے دی ہے۔

تبصرے کے لیے کتابوں کے بارے میں بتایا کہ اس نے دو فرمان فتح پوری کو اور دو دو اوراق اور فنون کو بھجوا دی ہیں مزید بھیج دوں گا۔

ہند کو ادبی بورڈ کے بارے میں عرض ہے کہ صرف ایک ہی میٹنگ ہوئی جو مختار علی نیئر کے گھر پر تھی یہ رمضان کی بات ہے اس وقت نیوز لیٹر (دو ورقی) چھپا تھا کچھ فیصلے کئے تھے اس میں میرے علاوہ ظہور احمد اعوان اور ناز درانی تھے۔ باقی حضرات میں سے کوئی بھی تشریف نہ لائے۔

بورڈ کی کارروائی کچھ آگے نہیں بڑھی سہیل کہہ رہا تھا کہ وہ دو ماہ سے گوجرانوالہ میں تھا اس لیے کچھ کام نہ کر سکا۔

(یہ خط میں نے اتنا لکھا تھا کہ مختار علی نیئر کا خیال آیا اور میں نے ان سے تفصیلات پوچھیں) ان کا کہنا ہے کہ پرسوں سہیل ان کے پاس گیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ پشاور سے ایک طویل عرصہ تک غائب رہا اس لیے کوئی میٹنگ نہ ہو سکی اس کا ارادہ ہے کہ جلد ہی میٹنگ بلائے گا۔ میں نے نیئر صاحب سے کہا کہ آپ کو وہ بھی تفصیلی خط لکھ کر تمام حالات سے آگاہ کر دیں امید ہے ان کی جانب سے بھی آپ کو کوئی اطلاع موصول ہو۔ پشاور والی کتاب کا معاملہ بھی کچھ آگے نہیں بڑھا میٹنگ میں طے کریں گے کہ کیا کرنا ہے خدا کرے یہ جلد ہو سکے۔

سچی بات یہ ہے کہ آپ انگل دے کر چلے جاتے ہیں اور ہمارا سب کا حال یہ ہے کہ انگل ہی غائب ہو جاتی ہے شاید عمر کا تقاضا ہے۔

ابا سین ادبی انعام کے فارم ارسال کرتا ہوں آپ دیکھ لیجیے اور پھر ارسال کر دیں باقی احباب خیریت سے ہیں سنا ہے گذشتہ دنوں آپ کے بھائی صاحب کا انتقال ہو گیا بہت افسوس ہوا خدا مغفرت کرے آپ کے لیے یہ دوری عذاب جان سے کم تو نہیں۔ موسم کافی تبدیل ہو گیا ہے گرمی کے آثار بڑھتے جا رہے ہیں آپ کب تک آنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ آپ کی کتاب پر شوکت واسطی کا تبصرہ موصول ہوا یہ ان کے رسالے گل بکف میں چھپ گیا ہے میں نے آپ کے توسط سے جو کتابیں صبیحہ صبا کے لیے ارسال کی تھیں ان کی رسید انہوں نے ابھی تک نہیں بھجوائی کیا یہ ڈاک کی نذر ہو گئیں یا وہ لکھنا بھول گئیں۔

محسن احسان

۲۵/فروری ۱۹۹۶ء، اسلام آباد۔

بھئی ڈاکٹر امجد میاں!

تالیف کہہ لو یا تصنیف ''یک شہر آرزو'' ماتم اس پر اس کر کے کوئی کرے کہ محسن احسان نے جب کرم کیا کہو کہ ستم ڈھایا۔ مجھے لا کر دی تو ورق گردانی کو کھولی۔ سرسری نظر دوڑائی تو ایسی ٹکی جب تک ساری کی ساری پڑھ نہ ڈالی ہاتھ سے رکھی نہ گئی اور کتنے بہت سے اپنے کرنے کے کام میرے رہ گئے ہوں گے!

یہ نسخہ ترتیب کا ایک انوکھا اور دلچسپ کارنامہ ہے معلوماتی اپنے ڈھب سے خیر یہ ہے ہی جیسا کہ اسے نوعیت کے اعتبار سے ہونا چاہیے تھا انتہائی ذاتی معاملات و معمولات سے بھی اٹا ہوا ہے لیکن ہا ایں ترکیب کہ بالکل ہی غیر متعلق شخص بھی چاہے تو صرف نظر ان سے نہ کر پائے کیونکہ انداز اور اندازے سب کے سب من و عن ایک ایسی تہذیب کی منہ بولتی تصویر بناتے ہیں جو دیکھنے کو بہت کچھ مدھم ہو چکی ہے لیکن مطالعہ کی حد تک اپنی دلکشی برقرار رکھے ہوئے ہے۔

میں پشاوری نہیں ہوں۔ لیکن سابقہ یا علاقہ اس دیار سے میرا کوئی پانچ چھ دہائیوں پر محیط ہے یعنی وہ لگاؤ جسے فطری کہتے ہیں خاک وطن زملک سلیماں خوشتر وہ تو یہاں سے میرا نہیں گویا وہ جذبہ جس نے اتنی وارفتگی سے ایسی تصنیف امجد کے لیے ممکن بنا دی تاہم اتنے زمانے کی بود و باش مجھ پر اثر انداز ہوئے بغیر بھی نہیں رہ سکی یہ شہر اپنے میں سمو لینے کی خوبیاں ضرور رکھتا ہے لیکن یہاں کے رہنے والے سمائی نہیں رکھتے یہ سمائی ہماری طرف کا ایک ٹھیٹھ اظہار ہے جو لگ بھگ برداشت کا مترادف ہے۔ ۱۹۴۲ء میں جب میں یہاں پہنچا تھا تو اس ماحول اور فضا میں عجیب محو و مبتلا ہو گیا تھا۔

میرا ایک دوست شہرت بخاری چند ماہ یہاں آ کر رہا۔ وہ لاہوری تھا چلا گیا تو اشتیاق سے مجھے وہاں بلایا میں لوٹا تو اسے یہ شعر لکھ کر بھجوا دیا:

بھئی شہرت تمہارا شکریہ لاہور بھی دیکھا
خدا رکھے پشاور کو پشاور پھر پشاور ہے

بہار کی آمد ہوتی اور میں پشاور سے باہر ہوتا تو یہاں کی مہکتی فضا کی یاد دیوانہ بنا دیتی۔

ع کرنا چھوٹا رستے مہکے یاد پشاور آتی ہے!

پھر مجھے یہاں سے ہجرت کرنا پڑی کن صبر آزما حالات میں۔ یہاں زندگی کی اور کیونکر آخر کار نکلنا ہوا یہ ایک طویل داستان ہے جو میں نے بہ ہیئت سوانح ''کہتا ہوں سچ میں'' سب کی سب قلمبند کر دی ہے۔ وہ اس لئے دہراتا ہوں کبھی اگر ممکن ہوا تو یہ کتاب پہنچانے کی کوشش کروں گا کہ بچشم خود دیکھ لی جائے۔ لب لباب اس تمام کیفیت کا یہ بیان کروں:

قائم ہے پشاور سے محبت وہی شوکت
دکھ گرچہ بہت اہل پشاور نے دیئے ہیں

بات ہو رہی تھی یک شہر آرزو کی اور میں کہنے چل پڑا آرزوئے یک شہر کی کہ وہ کیسا ہوتا۔ ایسا ہوتا۔ کاش ویسا ہوتا بہر حال ڈاکٹر نے اپنی آسودہ زندگی باہمہ مصروفیات جس سودمندی سے گزاری ہے۔ یہ کتاب اس کی بھرپور آئینہ دار ہے وہ لوگ جو اپنی تہذیب، زبان اور روایت کے پودے کو اجنبی فضا میں یوں لہلہاتے رکھے ہیں غنیمت ہے اس لیے بھی کہ یہاں ہم اس بارے میں سخت خلفشار کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں لیکن یہ تو میرے اب کے موضوع سے باہر کا مسئلہ ہے۔ مجھے تو اس عجیب وغریب تصنیف کے بارے میں کچھ کہنا ہے جو بین السطور تو شاید میں نے کہہ بھی دیا ہے جو ہر میر سے میں آشنا نہیں۔ خاطر غزنوی کے ہاں پچھلے دنوں ایک تقریب میں سرسری ملنا ہوا جو ذکر اذکار اس حوالے سے شامل کتاب ہے ادبی ادبیاتی ہے۔ واقعاتی ہے جذباتی ہے عبارت بیشتر پشاوری باتیں سناتی ہے لہٰذا من بھاتی ہے پھر ظہور اعوان کا نسبتاً دراز سلسلہ درپیش آتا ہے ایک کیفیت ملاحظہ میں آیا کرتی ہے:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

یہ خط میں نے قلم برداشتہ لکھ دیا ہے ندیم سے کسی خاص کلام کا ارادہ قطعاً مدنظر نہیں تھا نامہ بر کو سلام کہنے کے مصداق بھی نہیں ہاں یک شہر آرزو اپنی قسم کی ایک ایسی تخلیق ہے کہ اس کی ترغیب پر یہ سب کچھ لکھنے میں آ گیا یہ کتاب اپنے منفرد اسلوب کے باعث قاری کو آخر تک منہمک رکھتی ہے اس میں متفرق دلچسپ اور مفید معلومات کا اندوختہ جا بجا منتشر ہے اپنے پاکستان کا پشاور کے حوالہ خاص کے ساتھ اور امریکہ یعنی ریاست ہائے متحدہ کا مصنف مؤلف کی وہاں مسلسل موجودگی کے سبب جملہ اگر نہیں تو بیشتر ماجرہ اور بیان تو ہے ہی لیکن میکسیکو، چین اور دیگر متعدد ممالک ومسالک کی دلنشیں روداد اسے ایک وقیع توقیع اور دلآویز دستاویز بنا دیتی ہے اور اس پر یقیناً کھل کر مبسوط اور مفصل رائے زنی ہونا چاہیے چاہے دیگر مصروفیات کتنی ہی آڑے آئیں کتابیں ڈھیروں کے حساب سے آئیں دن سامنے آتی رہتی ہیں مگر شہر یک آرزو ایسی تمثال دار تو خال خال اور کبھی کبھار!

شوکت واسطی

۲۲/اکتوبر ۱۹۹۶ء، پشاور۔

امجد جی، جینوندے رہو۔

تمہارا خط ملا۔ شکریہ مضامین تو میں لکھنا چاہ رہی ہوں مگر اتنے موضوعات سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ میں لاجواب ہو جاتی ہوں۔ تم کہتے ہو عمر رفتہ کو آواز دینا۔ عمر رفتہ کوئی ساعت غیر تو نہیں کہ ایک مورخ کی حیثیت سے داستان لکھ ڈالوں۔ عمر رفتہ تو ایک تجربہ گاہ تھی۔ میری فتوحات کی میری سرفرازیوں کی میری نااہلیوں کی اور ناکامیوں کی ان تمام منزلوں کو آواز دینا کیسی کیسی سرشاریوں سے ہم کنار کرتا ہے اور کیسے کیسے کرب سے گزارتا ہے۔ اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ اس معاملہ میں، میں بہت بہکنے کی عادی ہوں۔ لمحہ موجود سے بچ کے ساعت گزشتہ کی ہمراہی آسان کام نہیں ہے مگر یہ تجربہ ہے گو کہ وقت طلب ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی لکھنے کی۔ کانونٹ کے زمانے کی منظر کشی ہو جب ہیوبرٹ گوڈین ہمیں ہاکی کی چنگ کرواتے تھے۔ ہم لڑکیاں (یعنی اس وقت کی لڑکیاں) برقعے پہن کر سٹیڈیم جایا کرتیں تھیں۔ ہاتھ میں باقاعدہ ہاکی سٹک ہوا کرتی تھیں۔ ہیوبرٹ خوبصورت بھی بہت تھے۔ ہر لڑکی پسند کرتی تھی ایک صاحبہ بہانے سے غالب کے خیال کو تقویت پہنچانے کے سامان مہیا کرتی نظر آتیں کہ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے اور ہم قصہ خوانی کے من چلوں کی طرح دور دور سے آوازے کستے ہمیں بھی ہاکی کی ٹیوشن چاہیے۔ یہ Late fifties کی باتیں ہیں۔ بھائی چھیلا پٹیالے والے کلاسیکل ڈانس سیکھانے آتے تھے۔ کالج لائبریری میں کیا محفل جمتی۔ گھنگھرو پہنے تیرتی ہوئی لڑکیاں دیکھی اور سنی جا سکتی تھیں۔ آوازیں تو چار دیواری کے حصار سے سدا کی متنفر ہیں۔ ارباب روڈ کے راہرو گھنگھروؤں کی چھنکار سے برابر محظوظ ہوتے۔ تانتے بندھے رہتے معاملہ ان ہی کے درمیان رہتا تو کوئی بات نہ تھی تیسرے فرد کا آدھمکنا ان محفلوں کو چٹ کر گیا یعنی الفلاح اخبار میں کفر و بے دینی کی تہمتوں کے اطلاق کے بعد کانونٹ کو بند کرنے کی دھمکیاں ملنے لگیں المختصر یہ سلسلہ منقطع ہوا اور ہم سب نامراد تتر بتر ہو گئے اللہ خوش رکھے کانونٹ والوں کو اور کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو بھائی چھیلا کو جنہوں نے ہمیں سرتال سے متعارف کروایا کہ ہم سب نے اپنے اپنے گھروں میں موسیقی سیکھنے کا بندوبست کر لیا اس زمانے میں گانا ہارمونیم بجانا اور ستار چھیڑنا یعنی مہارت شائستگی کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ خواتین محفلوں پہ چھاتی تھیں تو ان ہی خوبیوں سے۔ نہ پاؤ بھر کا غازہ دلالی نہ بیش قیمت گاڑی کی سواری جو کچھ تھا اندر کا مال تھا۔ چوری کا دور دور تک خطرہ نہ تھا کہ شائستگی کون اڑا لے جائے گا۔ بات کرنے کا سلیقہ، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے ان سب پر دھیان خبط اختیار کر چکا تھا۔ یہاں تک کہ مردوں کی خوش پوشی سے سڑکیں سجی سجی لگتی تھی۔ ہر ایک کے پاس ایک ہی خزانہ تھا اور وہ تھا اپنی ذات کا۔ جب سے ہم نے اپنی ذات سے باہر آرائش وزیبائش کے سامان اکٹھے کر لیے ہیں اور ان پر توجہ دینے لگے ہیں ذات کھنڈر سے بدتر شہر تاراج ہے۔ عہد گزشتہ کے آثار کے لیے تو جانے کیا کیا کہا جاتا ہے کہ عظمت رفتہ کے نقوش ہاتھ لگیں گو کہ اب سے تب کا رشتہ استوار ہو ہی نہیں سکتا۔ صرف خبر وامکانات کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ ذات اپنی تمام تشنگیوں اور ناقدریوں، بے توجہیوں اور پائمالیوں کا شکوہ کس سے کرے کہ آئے دن کی خون ریزیاں اور نفرتیں بربریت اور چیرہ دستیاں بھی انسان کو سوچنے پر مجبور نہیں کر سکتیں۔

امجد، سلمٰی لوگوں کا فون آئے نہ آئے تم ان کو فون کرتے رہنا۔ کبھی چلے بھی جانا اس نے ماموں نہیں دیکھے۔ تم ماموں ہو یہ بات دھیان میں رکھنا۔ محبت میں خدا نے یہ کمال رکھا ہے۔ جس کو دو وہ بھی خوش دینے والا بھی خوش۔ عمر

کے اس حصہ میں کہ تم داخل ہونے والے ہو اور ہم تو کبھی کے داخل ہو چکے ہیں یہ محبت کام میں لا کر دیکھو۔

فرمان فتح پوری کا خط بھجوا رہی ہوں تم نے کتاب کے بارے میں لوگوں کی رائے نہیں لکھی کہ کیا رائے تھی۔ خدا توفیق دے تو خط لکھتے رہو فون بھی کر لیا کرو۔ میں سیدھی بات ہے کہ ریٹائرڈ ہو گئی ہوں۔ لہٰذا محتاط ہو گئی ہوں دعا کرو جلد ہی اگلی تین چار کتابیں بھی چھپ جائیں تمہارے لیے مضمون جلدی لکھ کر بھیجوں گی دعا کرو ہر طرف خیریت رہے۔ عمر کا یہ حصہ سوچوں کو کتنا Fragile کر دیتا ہے شاید تم یہاں تک نہیں پہنچے۔ ڈائی کو دعا بچوں کو پیار۔ کب آ رہے ہو؟

وحیدہ غفور

۱۰ر جون ۱۹۹۵ء، پشاور۔

برادرِ عزیز سلامت باشد۔

آپ کا گرامی نامہ نظر نواز ہوا، شکریہ۔

گزشتہ خط کی نقل بھی موصول ہو گئی ہے۔ یہ کارآمد خط میری فائل میں ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے کرم کیا جو اس کی نقل فراہم کر دی میری ادبی خدمات جو کچھ بھی ہیں وہ سب پر عیاں ہیں سب لوگ آپ کی طرح فراخدلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے آپ نے جس انداز سے فراز نمبر کو سراہا اس کا بہت بہت شکریہ۔

پشاور میں فراز کے ساتھ خاطر صاحب نے ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا جتنے بھی مقررین تھے ان سب کو میں نے فراز نمبر دیا تھا۔ سوائے ظہور اعوان کے کہ اس سے میں نے بطور خاص فرمائش کی تھی۔ کسی نے دو لفظ بھی فراز نمبر یا میرے بارے میں کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی حالانکہ فراز کو جتنے ایوارڈ یا انعامات ملے ہیں وہ انہیں بہت پہلے مل جانے چاہیے تھے لیکن موجودہ صورت میں یہ سب کچھ جریدہ کے نمبر کے بعد ہی ہوا ہے۔ سو اس صورت میں بھی اس نمبر کا تذکرہ ضروری تھا۔ لیکن کوئی بھی کچھ کہہ نہ پایا میں بھی زیادہ پرواہ نہیں کرتا جو قدر و منزلت باہر کے ادیب اور شاعر کرتے ہیں وہی کافی ہے دعا کریں کہ کچھ کام بھی انجام دے سکوں۔ جو آپ کے معیار اور ذوق کے مطابق ہوں۔

آپ کی کتاب کی اشاعت کی خبر ظہور اعوان نے دی تھی۔ اس بارے میں اگر آپ مجھ سے دریافت کرتے تو میرا مشورہ یہ ہوتا کہ پہلے آپ اباسین پر اپنی تحریر مکمل کریں۔ (انگریزی میں) وہ باہر آسانی سے چھپ جائے گی اور وہ آپ کی قد و قامت بنانے میں بھی مددگار ہو گی بعد میں اس کا اردو ترجمہ اور اس کے بعد کوئی اور تحریر سامنے آنی چاہیے دوسروں کے خطوط منظر عام پر لانا اچھی بات تو ہے لیکن اس سے آپ کو کوئی ادبی فائدہ نہیں پہنچ پائے گا پھر آپ اپنا مسودہ ایک ایسے اناڑی ناشر کے حوالے کر گئے ہیں جسے اس میدان میں آئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ ہی دن ہوئے ہیں اور یہ غالباً آپ نے محسن احسان کے مشورے پر کیا ہے۔

مجھے معمولی سی تکلیف اور ہو گئی تھی مہینہ بھر پریشانی رہی۔ ہڈی میں جو تاریں تھیں ان کی وجہ سے زخم ہرا ہو گیا تھا۔ پہلے دو تاریں نکالی گئیں تب بھی زخم مندمل نہیں ہو پایا بعد میں چھوٹا اپریشن کر کے ساری تاریں نکال دی گئی ہیں کوئی دس دن اسپتال گزارنے کے بعد آیا ہوں ابھی ایک معمولی سا زخم مندمل ہونا باقی ہے دوائی اور علاج جاری ہے دعا کرتے رہا کریں باقی صحت ٹھیک ہے۔ بابر سعید اور بانو سلام لکھوا رہے ہیں گھر بھر کے لیے دعائیں۔

تاج سعید

یکم نومبر ۱۹۹۷ء، لندن۔

شاہ جی، سلامت رہیے۔

بہت دنوں سے میرا جی چاہ رہا تھا کہ آپ کو لکھوں نہ جانے کیوں طبیعت اداس سی تھی۔ گھڑی گھڑی پلکیں بھیگ سی جاتی ہیں۔ نماز پڑھوں تو دعا کو ہاتھ اٹھاتے ہی گلا بندھ سا جاتا ہے۔ سوچا کہ آپ کا نام بھی اللہ کے نام کی طرح الف سے شروع ہوتا ہے تو کیوں نہ آپ کو کہوں کہ میرے لیے دعا کریں۔

آپ کی کتاب یک شہر آرزو پڑھتا ہوں تو نہ جانے کیوں میرا دل بھٹک سا جاتا ہے۔ اس خط میں دماغ کی باتیں کم اور دل کے بیان کثرت سے بیان ہوں گے۔ اردو بولنا تو کم ہی ہے لیکن پڑھنا مزید کم اس لئے نہ تو لکھنے کی مہارت ہے اور نہ ہی ہجوں کی۔ یہ ساری غلطیاں درگزر کیجیے۔

جب میں بولتا ہوں تب بھی اور لکھنے کی سعی کرتا ہوں جب بھی میرا ذہن متواتر بھٹکتا ہے۔ بات کہاں سے اٹھتی ہے اور خیالوں کی لہریں اسے اچھال کر نہ جانے کہاں کہاں لے جاتی ہیں۔

سرورق تصویر دیکھتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ گھنٹہ گھر کے نیچے قلفیوں کی دکان تھی۔ جہاں ٹین کی قلفیوں پر آٹے کی سیل لگتی تھی۔ شام کو ہم کریم پورے سے چل کر وہاں قلفیاں کھانے آتے تھے۔ قریب ہی چوزے اور انڈے بکتے تھے۔ انڈوں کی بات چلی تو مجھے اپنی والدہ (اللہ بخشے) یاد آئیں۔ چُلے والے دالان میں صبح توے دیاں روٹیاں اور نکی ولے انڈے کا ناشتہ ہوتا تھا۔ آپا (ہم والدہ کو آپا کہتے تھے) تین انڈوں کو پہلے ہی سے ایک کٹوری میں پھینٹ دیتی تھیں توے پر مہارت سے تھواڑ سا مکسچر ڈالتیں اور نہایت عمدہ دائرہ انڈوں کا بنتا۔ ہم سمجھتے کہ سب کو ایک ایک انڈہ کھانے کو ملا ہے۔ لیکن بات کچھ یوں نہ تھی۔ گھنٹہ گھر کے نیچے (میں نے کہا نا کہ میرا ذہن بھٹکتا ہے) مچھیروں کی دکانیں تھیں۔ دریا کی نہایت عمدہ مچھلی بکتی تھی۔ جس کو تل کر ہمارے گھر میں کھاتے تھے۔ گھنٹہ گھر سے تحصیل کی طرف چلیں تو ہمارے زمانے میں دائیں ہاتھ پر قرہ قل کی دکانیں تھیں۔ حلوائی کی دکان اور فوراً آپ کے محلے کی گلی میں (آپ کی گلی کا ذکر دانستہ نہیں کرتا اس لیے آپ اپنی بھنویں نہ سکیڑیں) لالے امجد کیا آپ کو یاد ہے کہ مچھی ہٹے کے بالکل سامنے ایک بالا خانہ تھا۔ جس کی پہلی منزل پر ایک شخص (Alternative practice) کرتا تھا اس کا نام مجھے یاد پڑتا ہے شیخ جان تھا۔ میں جب بھی دکھ سے کہتا ہوں کہ یہ امر درست ہے تو اس میں مبالغے کا عنصر

ضرور ہوتا ہے۔ دروغ برگردن راوی کہتے ہیں کہ بڑا بااثر طبیب تھا میری بڑی بہن آپا گل کہتی تھیں کہ مرغوب تو بڑی شوخیاں کرناوے۔ تینوں میں شیخ جان کول لے جانی آں۔ یہاں میں دھیمی آواز میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میرے گھر والے مجھے شفقت نہیں بلکہ مرغوب کہتے ہیں۔ تفصیل اس واردات کی آگے عرض کروں گا۔ شیخ جان پڑھ کے پھونکتے پھر تعویذ پانی میں گھول کے پلاتے بات یہاں ختم نہیں ہوئی تھی۔ اللہ تو اڈی پلی وار کرے کنسلیشن کی اس سٹیج پر شیخ جان میرے ماتھے پر بھنوؤں کے درمیان ایک لمبی لکیر گلاتے تھے جس کو ہم شیخ جان کا خال کہتے تھے۔ تصور کریں آپ میرے بھائی کہ ایک دس سال کا بچہ اپنی بڑی بہن کی انگلی پکڑ کے بازار میں اترتا ہے اور اس کے ماتھے پر یہ نشان! اللہ کا شکر ہے کہ ان دنوں میرے ماتھے پر بالوں کی کثرت تھی جو اس خال کو چھپا دیتے تھے۔

اسی سڑک پر آگے چلیں تو دائیں ہاتھ پر ایک چھابڑی والا پتیسا اور ریوڑیاں بیچتا تھا۔ دائیں ہاتھ پر ایک مسجد اور اس کے سامنے ایک ڈسپنسری ہوتی تھی۔ میرے چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ آ رہی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ الفاظ پڑھ کر آپ بھی میری مسکراہٹ میں شامل ہوں۔ وجہ یوں ہے کہ مسجد کے سامنے ایک نہایت نستعلیق تلوے کی دکان تھی۔ مجھے اس کی شکل یاد آ رہی ہے بات چالیس سال سے اوپر کی ہے قد تو مجھے اس کا یاد نہیں کیونکہ میں نے اسے ہمیشہ بیٹھے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ لیکن اس کے گھنے بال اور بودی بنی ہوئی ہوتی تھی۔ بوسکی کی قمیض لٹھے کی شلوار اور سونے کا دانت مجھے یوں دکھائی دے رہا ہے جیسے اس وقت مجھے میرے گھر کے Pinkroom کی French window کے باہر چمکتی ہوئی دھوپ نظر آ رہی ہے۔ یہ بھنڈی، آلو، بینگن اور گوبھی کے پھول بیسن میں تلتا تھا۔ پکے دل والے پشوری تلی ہوئی چڑیاں بھی خرید کر کھاتے تھے۔ یاد ہے آپ کو آگے چل کر سڑک کے بائیں ہاتھ پر سیٹھیوں کی گلی اور وہ خوشنما گھر جو Chelsea کے Georgian Houses کو مات کریں۔ اس سے آگے سڑک کی چڑھائی شروع ہوتی تھی اور تانگوں کو چڑھائی چڑھتے دشواری ہوتی تھی یہاں چڑھائی پر بائیں ہاتھ ڈاکٹر مجید کا کلینک تھا۔ پشاور کی نوجوان مائیں اپنے نوزائیدہ بچوں کو افیون کی گولیاں کھلاتی تھی۔ عجب نہیں کہ اب بھی کھلاتی ہوں ڈاکٹر مجید کا کلینک نہایت خوشنما سیڑھیوں کو عبور کر کے پہلی منزل پر تھا۔ کہتے تھے ماؤں کو تم افیم اس لیے دیتی ہو کہ تمہارا بچہ روتا ہے اور تمہاری نیند خراب ہوتی ہے۔ تمہیں چاہیے کہ تم افیم خود کھا لیا کرو تمہیں نیند بھی آ جائے گی اور بچے پر بُرا اثر بھی نہ ہوگا۔

چڑھائی کے سامنے تحصیل تھی۔ ہم یہاں سے دائیں ہاتھ کو مڑتے تھے۔ سامنے تیلیوں کی گلی اور کونے پر گھوڑوں کے پانی پینے کی جگہ۔ اس کے سامنے آغا ضیا کا کلینک اور ساتھ ہی ان کا گھر۔ میرے ماموں فقیر حسین مرحوم اُن کے مرید تھے اور ہم وہاں پر قوالیاں سننے جاتے تھے۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یہاں میرا قلم قدرے رکتا ہے یوں یاد پڑتا ہے کہ اس سڑک کے دوسرے کونے پر ایک محلّہ تھا جسے ہم قادر دی موری کہتے ہیں یہاں ہمارا ایک عظیم و شان مکان تھا۔ یہ بٹوارے سے پہلے کی بات ہے۔ اس مکان میں صحن کے دونوں طرف اوپر والی منزل کو جانے والی سیڑھیاں تھیں اس گلی میں سیٹھیوں کے مکان تھے اور گردونواح میں ہندوؤں کے محلے۔ ہمارے گھر سے ساتھ والے گھروں کو جانے کے لیے چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں (باریاں) تھیں۔ ہندوؤں کے رسوئی گھروں میں جانے سے قبل جوتے اتارنے کی ہدایت تھی۔

یہاں مجھے سعادت حسن منٹو کا افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ یاد آ رہا ہے جو بٹوارے پر لکھا گیا تھا۔ ان دنوں ہمارے ہندو ہمسائے کہتے تھے کہ اگر ہمیں کچھ ہوا تو ہم اس کھڑکی سے آپ کے گھر آ جائیں گے۔ جب آگ لگی تو اس کہرام میں ہم نے کسی کو نہ پہچانا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے پاگلوں کی طرح یہ سمجھ نہ آئی کہ کون کہاں جائے؟

ڈاکٹر شفقت حسین

۶ رفروری ۱۹۹۷ء، لاہور۔

ڈاکٹر امجد حسین سید کو سلام پہنچے۔

میں فیکس اور کمپیوٹر سے اس طرح کتراتا ہوں جیسے پرانی وضع کے لوگ پتلون کوٹ سے۔ گو آج کل کی ریت میں اس کی اجازت نہیں۔ امریکہ میں تو خاص طور پر نہیں۔ خدا کرے میرا یہ خط آپ کو مل جائے گو اس کی امید کم ہے۔ آپ نے اپنی کتاب میں جو پرچہ لکھا تھا اس پر کوئی پتہ نہ تھا۔ یہ خط اس پتے پر بھیج رہا ہوں جو کتاب میں لکھا ہے۔

میں زندگی میں ایک بار ہی پشاور گیا۔ لوگوں کی محبت سے بہت متاثر ہوا۔ آپ کی کتاب پڑھنے کے بعد پشاور سے اور بھی انس ہو گیا۔ آپ کا پشاور قلہ پانچہ اور پیچک اور روغنیوں کا پشاور ہے۔ اب وہ سقاوے کہاں، کہاں تلاولا اور کہاں بلورے والی سوڈے کی بوتل، اماں مریاں بھی باسودے کی مریم ہیں۔

پہلی پتلون پر استری کر کے پہننے کا نشہ صرف انہی لوگوں کو نصیب ہوا ہے جو ایسے خاندانوں میں پیدا ہوئے جہاں بڑوں کے کپڑے کٹوا کر چھوٹوں کے حصے میں آتے ہیں۔ ہمارے ہاں سردیوں کے کپڑے جاڑا ختم ہونے پر لکڑی کے ایک ٹرنک میں رکھ دیے جاتے تھے۔ چند فینائل کی گولیاں اوپر ڈال دی جاتی تھیں۔ ایک سال میرے والد کی فلالین کی ایک پتلون جب بکس سے نکالی گئی تو اس کا پائنچہ کسی ٹڈی کی نذر ہو چکا تھا۔ پتلون درزی کو دی گئی۔ اسے کاٹ کر میرے لیے ایک نیکر بنا دے۔ ایسی یادوں کو آپ خوب گدگداتے ہیں۔ آپ کی تحریر جیتی جاگتی گفتگو کی تحریر ہے۔

آپ کی امّاں کی کہانی پڑھ کر میری آنکھیں بھر آئیں۔ میری

والدہ نے اپنی شادی کے بعد ''الف ب'' پڑھنا شروع کی۔ان کی تعلیم اس حد تک تھی۔کبھی کبھار ٹیڑھے میڑھے حروف میں مجھے تین چار سطروں کا خط ولایت لکھ بھیجتی تھیں۔فی الفور کو ''فل فور'' لکھتی تھیں۔میں نے کبھی زندگی میں انہیں کسی کی برائی کرتے نہ سنا۔کیا ایک زمانے میں سبھی عورتیں ایسی جنتی ہوا کرتی تھیں؟

اپنے پیشے میں تو آپ نے جھنڈے گاڑ دیئے۔کئی شہروں کی کنجیاں آپ پر نچھاور کی گئیں۔لیکن ادب، تاریخ، عمرانیات، مہم جوئی، دریاؤں اور ماخذوں کی کھوج میں بھی آپ پیش پیش ہیں۔اس کا اندازہ مجھے آپ کی کتاب سے ہوا۔آپ کی دوسری کتاب کا انتظار رہے گا۔آپ جگر تشنہ اعزاز تسلی نہ ہوا کے قائل ہیں۔آپ کو اس کے بغیر چین نہ آئے گا۔

میں نے ادب (نثر اور نظم) پڑھنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اسے اب دس برس ہونے کو آئے۔ایک ارادہ ہے کہ ان دس سالوں میں ان تحریروں میں سے جن نے لوگوں پر زیادہ اثر چھوڑا ایک گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا انتخاب کروں۔کیلی فورنیا میں ایک دوست ہیں جن کا اصرار ہے کہ اس سال وہاں کسی جگہ اپنا انتخاب پیش کروں۔ستمبر میں امریکہ آنے کا ایک سبب پیدا ہو رہا ہے۔اگر آپ کے شہر میں اس قسم کی تقریب کی گنجائش ہو تو اس بہانے وہاں آ کر آپ سے ملاقات کی صورت بھی نکل آئے گی۔لیکن اس چیز کو بوجھ نہ بنایئے۔

ربط یک شیزاہ وحشت ہے اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ گل ناآشنا

ضیاء محی الدین

۳۰ر جولائی ۱۹۹۹ء، لندن۔

برادرم عزیز امجد جان، السلام علیکم!

فون کرنے کا شکریہ۔یہاں شہر کے کئی پرانے گھنگار ہیں۔جن سے وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔کبھی کبھی چری بری بھی ہوتی ہے۔کھانا، پینا، گپ شپ اور نکی نکی۔نکی نکی سیپ سے ذرا مختلف کھیل ہے۔تین پتوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔البتہ پچھلے چند سالوں سے ہماری محفلوں میں وہ جوش اور ولولہ نہیں رہا۔عمر کا تقاضا، گرتی ہوئی صحتیں، گھریلو ناچاقیاں اور دنیا کیا کہے گی کا ''ڈر''۔جب میں اپنے ہم عصروں کو دیکھتا ہوں تو فراز یاد آ جاتا ہے۔

زندہ دلان شہر کو کیا ہو گیا فراز
آنکھیں بجھی بجھی ہیں تو چہرے مرے مرے

اب سوچا ہے کہ پاکستان زیادہ وقت گزارا جائے۔حیات آباد میں غفران اللہ نے زمین خرید وائی ہے اور ظہور سیٹھی کی مدد سے ایک پرانی طرز کا مکان بنوانے کا منصوبہ ہے۔تین بیڈ روم کا چھوٹا سا گھر، چاروں طرف برآمدے، محرابیں، اروسیاں اور شاید ممٹی بھی۔چمن کافی بڑا ہوگا۔مالی چوکیدار فل ٹائم ہوگا۔کرس (Chris) خوش ہے کہ وہ Pukki میم بن جائے گی۔اس نے Raj کی کافی کتابیں پڑھی ہیں اور ان کے مطابق چوکیدار Status Symbol ہے۔کرس کو ان باتوں کی کوئی خاص پرواہ نہیں۔اسے پتہ ہے کہ میری دیرینہ خواہشات میں سے ایک یہ گھر ہے (نسیم دلیپ کی ساس سے شادی بچپن کا خواب تھا)

پچھلے چھتیس سال میں جون ۱۹۹۹ء میں تین دن کا قیام سب سے لمبا عرصہ تھا۔انشاء اللہ اگلی دفعہ ایک ہفتے کا خیال ہے۔اس دفعہ کئی پرانے دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔اکثر غمزدہ کر گئیں۔اگلی دفعہ کچھ کرنے کی کوشش کروں گا۔پشاور کی بہار کے بعد وہاں کے لوگوں اور ہندکو کا نمبر ہے۔پیار اور خلوص بھرے لوگ جن میں سے اکثر اپنی پیاری زبان ہچکچا کے بولتے ہیں۔ہندکو سے میرا پہلا Encounter ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ماسی خیر (تکیہ کلام) کی خاص دعا۔''ماں صدقے تے پیو قربان'' مجھے پیاری بھی لگی اور عجیب بھی۔ماسی سے پوچھا کہ اگر میری ماں نے ہی صدقے اور باپ نے قربان ہونا ہے تو اس میں تمہارا کیا کمال۔ہائے بچہ اتنی سی عمر اور اتنی لمبی زبان۔ماسی کا جوابی حملہ خالص پشاوری خلوص۔معنی سے بے نیاز نیت ایک سو پچاس فیصد میری والدہ بحیات ہیں اور ہم سب کے لیے برکتوں کا خزانہ۔یک شہر آرزو میں ماں کے باب نے بہت رُلایا جس کے لیے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔

ہم لوگ ۵۷ء میں کوچہ شاہنچہ باشی (لکڑ منڈی کی ایک Posh بند گلی Cul-du-sac) سے کوچہ سیٹھیاں میں منتقل ہو گئے۔میرے رشتے کے ماموں خواجہ محمد شریف مرحوم کے عالی شان مکان کے بازو میں ہمارا چھوٹا سا گھر تھا۔خواجہ صاحب لاولد تھے۔ان کے ورثاء نے ان کا مکان ایک لالچی اور بے حس انسان کو بیچ دیا۔ایک قومی خزانے کو بڑی بے دردی سے پامال کیا گیا۔مکان کا ملبہ بنا، ملبہ بکا اور ایک عالی شان مکان کی جگہ ایک بے حد بھدی سی بلڈنگ کھڑی کر دی گئی جسے دیکھ کر پہلے تے اور پھر درد ہوتا ہے۔خدا خوش رکھے سیٹھی خاندان کو جس نے اب بھی بڑے مکانوں کو پیار اور احتیاط سے محفوظ رکھا ہے۔آپ نے یہ مکان ضرور دیکھے ہوں گے اگر نہیں تو اگلے وِزٹ میں ضرور ظہور سیٹھی سے ملیں۔اسماعیل سیٹھی مرحوم کا مکان خاص طور پر قابلِ دید ہے۔

کرس میرے ساتھ فروری میں پاکستان اور دو بئی گئی تھی۔اس کی اور بچوں کی خواہش ہے کہ پشاور میں ہمارا مکان بنے اور میں اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گزار سکوں۔ہم یار دوست عزیز میاں کا کلام سنیں۔ٹینا ثانی کی لاجواب آواز میں فیض، پروین شاکر اور نئے شاعروں کا کلام سن سکیں۔کئی ارمان ہیں۔دل حب وطن اور پشاور سے لبریز ہے۔دعا ہے کہ ہم بہت سارے غریب الوطن کبھی پشاور میں مل بیٹھیں۔پرانی باتیں یاد کریں چاہے موجودہ شہری پکار اٹھیں ''اس دا مغز خراب اے''۔

نسیم احمد خواجہ

☆

آپا تاج

ڈاکٹر سید امجد حسین

میں جب بھی پشاور جاتا آپا تاج کو کسی نہ کسی طریقے سے معلوم ہو جاتا کہ میں پشاور آیا ہوا ہوں۔ وہ سنتے ہی دوڑی دوڑی مجھے ملنے (یا پشاوری کہنے کے مطابق مجھے دیکھنے) آجاتی۔ میرا سر ماتھا چومتی۔ ڈھیروں دعائیں دیتی۔ میری ''میم'' کا پوچھتی میں جواب دیتا اور وہ سننے کی بجائے مجھے دعائیں دیتی جاتی۔ اس کا پوچھنا اور خیریت دریافت کرنا محض رسمی ہوتا تھا۔ اس کی دعائیں ہمیشہ صدق دل سے نکلتی تھیں۔

سنا ہے میری یادداشت سے بہت پہلے کے زمانے میں وہ ایک خوبصورت عورت ہوتی تھی۔ اب بھی بڑھاپے کی قربت نے چہرے پر لکیریں تو بنا دیں لیکن چہرے کی شگفتگی آنکھوں کی چمک اور زبان کی مٹھاس میں فرق نہیں آنے دیا۔ وہ ٹھگنے قد اور کاٹھے جسم کی عورت تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن چہرے پر دو روشن آنکھوں نے اسے قدرے خوبصورت بنا دیا تھا۔ ٹھوڑی کے قریب دائیں طرف ایک تل میں سے چند بال نکلے ہوئے تھے۔

آپا تاج ہمارے آبائی مکان واقع مسلم مینا بازار کے قریب سبزی منڈی کی سڑک کی دوسری طرف پھوڑگروں کے محلے میں رہتی تھی۔ یہ تمام علاقہ چوک ناصر خان کہلاتا ہے۔ الف شاہ کے عمارتی لکڑی کے گودام سے ذرا آگے چاچے سلمان کی بساط سے پہلے بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی گلی میں اس کا گھر تھا۔ اردگرد کے گھر بھی اپنی برادری کے تھے۔ ان کے باپ دادا چٹائی، ٹوکریاں اور ہاتھ کے پنکھے بنانے کا کام کرتے تھے اور اسی مناسبت سے پھوڑگر کہلاتے تھے۔

پھوڑگروں کا ہمارے گھرانے سے گہرا تعلق تھا۔ اس گھرانے کے بچوں نے ہمارے گھر سے قرآن پڑھا تھا۔ پشاور میں (اور شاید برصغیر ہند پاکستان کے اور شہروں میں بھی) یہ رواج تھا کہ گلی محلے کے بچے سیدوں کے گھر قرآن پڑھنے آتے تھے۔ ہمارے گھر سہ پہر کو بچے بچیاں سکول ختم کرنے کے بعد چند گھنٹوں کے لیے آتی تھیں اور میری والدہ، بھابھی اور پھوپھیاں انہیں قرآن پڑھنا سکھاتی تھیں۔ یہ بچے (خصوصاً بچیاں) گھر کے کام میں بیبیوں کا ہاتھ بھی بٹاتی تھیں۔ ایک لحاظ سے یہ ایک دینی تعلیم بھی تھی اور خانہ داری کی تعلیم بھی۔ اور گھرانوں کے علاوہ پھوڑگروں کے گھرانے کے بچے بھی ہمارے ہاں یہ تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ آپا تاج کی بہنوں اور بھائیوں نے بھی ہمارے گھر میں امور خانہ داری سیکھے اور قرآن پڑھا۔ اس رشتہ کے حوالے سے وہ ہمیشہ کے لیے ہمارے خاندان کے ممبر بن گئے۔ مرتے دم تک ان میں سے اکثر نے وہ رشتہ اور تعلق قائم رکھا۔ ہمارے ہاں خوشی کا موقع ہوتا یا غمی کا ہماری شاگردیں جواب خود مائیں بن چکی تھیں اپنا گھر چھوڑ کر ہمارے ہاں آجاتیں اور گھر کا بندوبست سنبھال لیتیں۔ آپا تاج تو اس سے بھی زیادہ کرتی تھی۔ جب بھی میری چھوٹی بہن ہمارے پاس امریکہ آتی، آپا تاج اس کا گھر سنبھال لیتی۔ دو وقت کی ہانڈی، گھر کی صفائی اور کپڑوں کی دھلائی کرتی۔ صبح آتی تو سہ پہر کو اپنے گھر لوٹتی۔ واپس جانے کے بعد میری بہن اسے پیسے دینے کی کوشش کرتی تو ناراض ہو جاتی۔ بہت مشکل سے کچھ رقم لینے کو تیار ہوتی۔ آپا تاج کے لیے ان کی بیبیوں اور بیبیوں کی اولاد کی خدمت اس کے ایمان کا حصہ تھی۔

آپا تاج کی شادی اپنے ہی پھوڑگروں کے خاندان میں ہوئی تھی۔ ایک اکلوتا بیٹا تھا جو ماں باپ نے بچپن میں ہی لاڈ پیار سے بگاڑ دیا تھا۔ تعلیم کی جگہ گلی محلے میں کھیل کود میں مصروف رہتا۔ ماں باپ نے بھی بیٹے کو تعلیم دلانے پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ جب کمسنی سے لڑکپن میں داخل ہونے لگا تو رنگ روغن کی ایک دکان پر معمولی تنخواہ پر ملازم ہو گیا۔ پشاوری ماں باپ اپنے بچوں کے بیاہ کرنے میں ذرا جلدی ہی کرتے ہیں۔ جونہی بیٹے کی مسیں بھیگیں اس کے لیے بیوی لے کر آگئے۔ دراصل والدین بچوں کی آڑ میں اپنے ارمان پورے کرتے ہیں۔ آپا تاج نے بیٹے کی شادی تو کر دی لیکن اس کی تگ و دو، محنت اور پریشانی میں کمی نہ ہوئی بلکہ بہو کے گھر آنے سے اس کی پریشانیاں بڑھ گئیں۔ جب بھی وہ ہمارے ہاں آتی باتی باتوں کے علاوہ بیٹے اور بہو کی شکایتیں بھی کرتی۔

۱۹۹۵ء میں میری کتاب ''یک شہر آرزو'' چھپی تو پشاور کے لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ کتاب جوہر میر، ظہور اعوان اور وحیدہ غفور کے ساتھ میری خط و کتاب پر مبنی تھی۔ خط و کتابت کا موضوع پشاور شہر اور شہر کے لوگ تھے۔ جوہر میر کے نام ایک خط میں، میں نے محلہ پھوڑگراں کے ایک اور باسی جان گل کا ذکر کیا تھا۔ کتاب کے شائع ہونے کے بعد آپا تاج مجھ سے ملنے آئی تو ہنس ہنس کر شکوہ کرنے لگی کہ تم نے میرے ساتھ بے انصافی کی ہے۔ میں نے تو آپ کے خاندان کی جان گل سے زیادہ خدمت کی ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ تمہاری کتاب میں جان گل کا ذکر تو موجود ہے میرا کوئی ذکر نہیں۔ آپا تاج خود تو پڑھ نہیں سکتی تھی کسی نے اسے بتایا ہوگا۔ میں نے اس کی بات کو ہنسی مذاق میں ٹال دیا۔ پشاور کے بارے میں جب میں اپنی تیسری کتاب ''مٹی کا قرض'' ترتیب دے رہا تھا تو مجھے احساس تھا کہ مجھ پر پشاور کی مٹی کے علاوہ آپا تاج کا قرض بھی واجب الادا ہے۔ یہ اس کتاب کا انتساب ہے۔

''کوئی تین برس پہلے کی بات ہے، میں اپنی بہن بیگو کے باورچی خانے میں خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ آپا تاج ہانپتی کانپتی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی۔ برقعہ ایک طرف پھینک کر مجھے گلے لگایا، پیشانی کو بوسہ دیا، بلائیں لیں

باقی صفحہ ۳۷ پر ملاحظہ کیجیے

براہِ راست

''چہارسو'' کے مدیرِ معاون عزیزی فاری شا نے **ڈاکٹر سید امجد حسین** کے حالاتِ زندگی کو ''خورشیدِ جہاں تاب'' کے عنوان سے موسوم کیا ہے۔ ہمارے خیال میں ڈاکٹر صاحب کی فتوحات، جستجو، تڑپ، طلب اور کارناموں کی روشنی میں اس سے بہتر، مناسب اور موزوں عنوان تجویز کرنا دشوار بھی ہے اور دقّت طلب بھی۔ آج کے عالمی منظر نامے میں تیسری دنیا، مسلمان بالخصوص پاکستانی کی تصویر جس طور دھندلا گئی ہے اُس کے پیشِ نظر **ڈاکٹر سید امجد حسین** جیسے روشن فکر اہلِ ہنر و اہلِ قلم کا علمی اور ادبی حلقوں میں تعارف نہ صرف اس دھند کو کم کرنے میں معاون ہوسکتا ہے بلکہ روشنی کا اک ایسا در بھی وا کرسکتا ہے جس سے بہت سے غلط اندازے اور تصورات از خود جواز سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ دعویٰ ہے، دلیل نہ خوش فہمی بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے جو فقط اس خاص شمارے کے مطالعے سے مشروط ہے!!!

☆ قلہ پانجہ، لواش اور سویپ کیا ہوتے ہیں اور ان کا طریقۂ استعمال کیا ہے نیز ان سے ہٹ کر بچپن کی کچھ خوشگوار یادیں حافظے میں محفوظ ہوں تو ضرور بتلایئے؟

☆☆ گلزار صاحب آپ نے قلہ پانچہ اور لواش کا ذکر کیا کیا میرے لئے یادوں کے بے شمار دریچے کھول دئے۔ قلہ پانچہ ہندکو زبان میں سری پائے کو کہتے ہیں۔ لواش تندوری روٹی کو کہتے ہیں جیسے پھیل کر تندور میں لگایا گیا ہو۔ یعنی گوندھے ہوئے آٹے کی مقدار وہی ہوتی ہے لیکن اسے نانبائی خوب پھیل کر لگاتا ہے۔ یہ روٹی Crips ہوتی ہے اور سہہ پہر کی چائے کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ پشاور جانا ہو تو کوشش ہوتی ہے کہ بازو میں نانبائی کی دکان سے تازہ لواش منگوا کر سہہ پہر کی چائے کے ساتھ نوش جان کروں۔

سویپ تاش کا کھیل ہے جو پاکستان اور ہندوستان میں مقبول تھا۔ گذشتہ تیس (۳۰) سالوں سے میں اور میرے چار دوست ہر جمعرات کی شام کو کھانے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اور پھر سویپ کھیلتے ہیں۔

☆ آپ کے اجداد عراق سے ہجرت کر کے بھکّر، بارہ مولا، لاہور سے ہوتے ہوئے پشاور میں مقیم ہوئے۔ اوّل اس کا جواز کیا تھا، دوئم آپ نے کبھی اہلِ خانہ کے رہن سہن، رسوم و رواج اور مزاج میں عرب روایات کی نسبت کسی طرح کا رجحان یا اشتیاق محسوس کیا؟

☆☆ میں نے بھاکری منزل لکھتے وقت کافی تحقیق کی تھی لیکن مجھے اپنے آباء کی عراق سے ہندوستان ہجرت کی وجہ کا سراغ نہ مل سکا۔ اس وقت (اٹھارویں صدی میں) عراق اور باقی مشرق وسطی سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ ہو سکتا ہے ہمارے بزرگوں میں کوئی صاحب سیلانی طبیعت رکھتے ہوں اور انہوں نے ہندوستان جانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ چند خاندانوں نے اکٹھے یہ سفر کیا۔ اُن میں سے کچھ تو پہلے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر جنوبی پنجاب کے شہر بھکر میں آباد ہو گئے۔ اور بعد میں بوجوہ وہ لاہور کے قریب شاہدرہ منتقل ہو گئے۔ اُن میں سے چند لوگ بھکر سے بارامولا کشمیر چلے گئے اور سید ہونے کے ناطے وہاں پیری مریدی شروع کی اور ایک گدی قائم کی۔

میرے پڑدادا سید قطب شاہ پرانے شہر لاہور میں حکیم تھے۔ اُن کا مکان بھاٹی دروازے کے اندر محلّہ ستھاں میں واقع تھا اور میرے بچپن تک موجود تھا۔ میرے دادا ڈاکٹر سید شبیر شاہ نے ۱۸۶۰ میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے گریجویشن کی اور سرکار برطانیہ کی ملازمت اختیار کر لی اور پشاور میں آباد ہو گئے۔ اُنہوں نے بارامولا والے خاندان میں شادی کی جو کشمیر سے مراجعت کر کے پشاور آباد ہو چکا تھا۔

ہمارے گھرانے کے رسم و رواج خالص پشاوری یعنی ہندوان تھے۔ ان پر نہ تو عرب چھاپ تھی اور نہ ہی پنجابی۔ گھر کے اندر ہم ہندکو زبان بولتے تھے۔ لیکن پشتو زبان بھی بولی جاتی تھی خصوصاً شاگرد پیشہ لوگوں کے ساتھ اور باہر بازار میں۔

☆ ''بھاکری منزل'' اور اس کے مکینوں کی نسبت آپ کے دل میں جو تڑپ اور احساسِ محرومی پایا جاتا ہے اُس کے پیشِ نظر یہ مناسب نہ تھا کہ آپ ''بھاکری منزل'' کو خرید کر اپنی اور اپنے بزرگوں کی یادوں کو ورثہ کی شکل میں محفوظ کر لیتے؟

☆☆ میری خواہش تو تھی کہ بھاکری منزل کو نہ بیچا جائے لیکن ۱۵۰ سالہ مکان بہت ضعیف ہو چکا تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ مرمت وغیرہ کرانے کے بعد وہ رہائش کے قابل ہو جاتا۔ اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ اسے گرا کر ازسرِنو بنایا جائے۔ اس صورت میں، وہ وہ گھر نہ ہوتا جو میری زندگی کی بنیاد تھا اور جس کے ساتھ میری انتہا کی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں اور جس کے خواب میں تمام عمر دیکھتا آیا تھا (اور اب بھی دیکھتا ہوں) دوسری بات یہ تھی کہ وہ تمام علاقہ اب کمرشل ہو چکا ہے۔ اس لئے وہاں بہت کم رہائشی مکان دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میرے دوست مرحوم جوہر میر کے اپنی ایک نظم ''پشاور شہر صحرا ہو گیا ہے'' میں یہی رونا رویا ہے۔ اس نظم کے چند شعر ہیں۔

فصیلیں توڑ کر کیا ہوگیا ہے　　پشاور شہر صحرا ہو گیا ہے
یہ شہر گلفروشاں تھا ، چمن تھا　　بکھر کر پتا پتا ہو گیا ہے
مکانوں میں دکانیں بن گئی ہیں　　سرِ بازار رسوا ہو گیاہے
ہوتی ہے روشنی اتنی زیادہ　　گھروں میں گھپ اندھیرا ہوگیاہے

☆ ہماری اطلاع کے مطابق آپ کے ادبی ذوق کو مہمیز دینے کا کریڈٹ عذرا بھابی کو جاتا ہے۔ اگلے پڑاؤ اور منازل پر دیگر احباب نے بھی آپ کی ادبی نک سک درست کرنے میں اہم کردار نبھایا ہوگا؟

☆☆ میری بھابھی عذرا بتول، پاکستان کے مشہور شاعر فارغ بخاری مرحوم کی بھانجی ہیں۔ بھابھی کی پرورش ادبی ماحول میں نہیں ہوئی۔ لیکن قدرت نے انہیں بہت ہی اعلیٰ ادبی ذوق سے نوازا ہے۔ وہ جب بھاکری منزل آئیں تو میں اُن دنوں دسویں جماعت میں تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں چند سال بڑی تھیں اس لیے بھابھی دیور کے رشتے کے علاوہ ہم دوست بھی بن گئے۔ ہم گھنٹوں علم وادب کی باتیں کرتے۔ ریڈیو پاکستان پشاور سے نشر ہونے والے ڈراموں اور گیتوں بھری کہانیوں پر بحث کرتے۔ بھاکری منزل میں علم تو تھا، ادب نہیں تھا۔ بدذوقی تو نہ تھی لیکن بے ذوقی ضرور تھی۔ والد صاحب کا انتقال میرے بچپنے میں ہو گیا تھا۔ بڑے بھائیوں کو ادب سے کوئی لگاؤ نہیں تھا حالانکہ والد صاحب کی زندگی میں گھر میں بیسوی صدی، نگار اور ادب لطیف آتے تھے۔ والد صاحب ہی پڑھتے ہوں گے۔ انہوں نے پرانے اردو ادب کی کئی کتابیں بھی جمع کر رکھی تھیں۔ بھابھی عذرا کے ہمارے گھر آنے سے پہلے میں وہ کتابیں پڑھ چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ آٹھویں جماعت میں، میں نے نولکشور پریس لکھنو سے شائع شدہ بڑے جہازی سائز کی الف لیلیٰ دو بار پڑھی تھی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پھر ہائی سکول میں ہی کسی حد تک اردو ادب سے متعارف ہو چکا تھا۔ عذرا بھابھی کی رفاقت نے اس شوق کو جلا دی۔ ابھی چند ہفتے پہلے میں اپنے بزرگ دوست و شاعر منیب الرحمٰن کی کتاب سڑکوں کے چراغ کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ ان کی نظم ''سند باد کا آخری سفر'' نظر آئی۔ اُس نظم نے مجبور کیا کہ پھر سے الف لیلیٰ کا مطالعہ کروں۔ یہ عمل کئی بار ہو چکا ہے۔

عذرا بھابھی کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں نے ادبی سفر میں میری راہنمائی کی۔ اُن میں میرے ادنیٰ جماعت کے استاد لال شاہ جگر تھے، جو ایک زمانہ میں داغ دہلوی سے اصلاح لے چکے تھے۔ کالج میں زولوجی کے پروفیسر عزیز احمد صاحب نے غالب سے روشناس کرایا۔ پروفیسر نذیر احمد مرزا برلاس اور پروفیسر طاہر فاروقی نے اسلامیہ کالج کے زمانہ طالب علمی میں مجھے اردو ادب کی نت نئی راہیں دکھائیں۔ یہ دونوں کالج میگزین خیبر کے نگران تھے اور میں مدیر تھا۔ کالج کے دنوں میں، میں ریڈیو پاکستان کے لیے فیچر اور ڈرامے لکھا کرتا تھا اور ریڈیو کے یونیورسٹی میگزین پروگرام میں بھی حصہ لیا کرتا تھا۔ ان دنوں ابوسعید قریشی ریڈیو پاکستان پشاور کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ ابوسعید صاحب شاعر تھے اور سعادت حسن منٹو کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے بھی میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ انہی کے ایماء پر میں نے ریڈیائی ڈرامہ ڈاکٹر لکھا۔ جو بعد میں سٹیج بھی ہوا۔ نقوش میں میرا ایک افسانہ بھی اُنہی کی کوششوں سے چھپا۔ تو آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اپنی زندگی کے ہر موڑ پر اور ہر چوک میں مجھے بہت اچھے استاد اور راہنما ملے، میری اردو کتاب ''درکتب'' اُن درسگاہوں کی جہاں میں نے تعلیم حاصل کی (بشمول ریڈیو پاکستان پشاور کے) اور اُن درسگاہوں کے چیدہ چیدہ استادوں کی داستان ہے۔

☆ وقت گزرنے کے ساتھ آپ کے ادبی سفر نے کیا رخ اختیار کیا اور آپ نے کن اصناف میں طبع آزمائی کی نیز اُن کی اشاعت اور پذیرائی کی بابت کچھ روشنی ڈالیے؟

☆☆ میرا قدرتی رجحان افسانے کی طرف تھا۔ اس بات کی نشاندہی میرے اسلامیہ کالج کے ایک استاد ڈاکٹر نذیر میرزا برلاس نے بھی اپنے ایک مضمون میں کی تھی۔ میرا ادبی سفر شروع تو افسانے سے ہوا تھا لیکن کالج کے دنوں میں ریڈیو پاکستان پشاور سے تعلق گہرا ہوا تو پھر رجحان فیچر اور ڈرامے کی جانب ہوا۔ سن ستر کی دہائی میں جب میں نے اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی کو بھی ذریعہ اظہار بنایا تو پھر مسائل حاضرہ، سیاسی تجزیہ، کلچر، مذہب اور فلسفے کے موضوعات پر بھی لکھنا شروع کیا۔ راستہ جو بدلا تو افسانہ، ڈرامہ پیچھے رہ گئے۔

☆ احمد ندیم قاسمی، رضیہ بٹ اور باسط سلیم صدیقی کی موجودگی میں آپ کا ڈرامہ ''ڈاکٹر'' بہترین ڈراموں میں شامل کیا گیا تو آپ کے احساسات کیا تھے؟

☆☆ آپ نے بہت ہی دلچسپ لیکن کٹھن سوال کیا۔ بھئی مجھے تو ہمیشہ سے اپنی ادبی کم مائیگی کا احساس رہا ہے۔ اس لئے جب فرمائشی ڈراموں کے انتخاب میں میرا ڈرامہ بھی شامل کیا گیا تو پہلے تو میں سمجھا کہ ریڈیو والوں سے غلطی ہوگئی ہے کیونکہ جیسا کہ آپ نے کہا اُن سات ڈراموں کے لکھنے والوں میں مشہور ادیب اور ڈرامہ نگار رضیہ بٹ، باسط سلیم صدیقی، احمد ندیم قاسمی اور محمد شفیع صابر کا نام شامل تھا۔ ایک ۲۲ سالہ جوان کے لیے اس سے زیادہ کیا اعزاز ہوسکتا ہے کہ اس کا نام اردو ادب کی قدآور شخصیات کے ساتھ لکھا جائے۔ من آنم کہ من دانم والی بات ہے۔

یہ اعزاز اپنی جگہ لیکن ڈرامہ ڈاکٹر کا پس منظر بہت دلچسپ ہے۔ ریڈیو پاکستان کے اسسٹنٹ سٹیشن منیجر ابوسعید قریشی نے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ایک انگریزی کہانی کے پس منظر میں یہ ڈرامہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے ڈرامہ لکھا اور سکرپٹ لے کر ان کے پاس گیا۔ انہوں نے میری موجودگی میں ڈرامہ پڑھا لیکن متاثر نہیں ہوئے۔ میرے چہرے پر ناامیدی دیکھ کر انہوں نے پوچھا کہ میں نے گزشتہ ہفتے نشر ہونے والے والا ڈرامہ ورجینا سنا ہے۔ میں نے پشاور کے نامور لکھاری مظہر گیلانی کا لکھا ہوا ڈرامہ سنا تھا اور مجھے بہت پسند آیا

تھا۔ جب میں نے ڈرامے کی تعریف کی تو ابوسعید صاحب نے بتایا کہ مظہر گیلانی صاحب نے وہ ڈرامہ چار مرتبہ Revise کیا تھا۔ میں بہت شرمندہ ہوا کہ اگر مظہر گیلانی اپنا ڈرامہ چار دفعہ Revise کر سکتے ہیں تو میں کس کھیت کی مولی ہوں۔ بہر حال انہوں نے مجھے ایک اہم سبق سکھانا تھا وہ انہوں نے مظہر گیلانی صاحب کے حوالے سے سکھا دیا۔ وہ واقعہ اب بھی میرے لیے مشعلِ راہ ہے۔

☆ گورنمنٹ ہائی سکول پشاور کے مجلّے "پیامِ عمل"، اسلامیہ کالج کے "خیبر"، میڈیکل کالج کے "سینا"، اسلامک سینٹر کے "Greater Toledo" زاویہ اور "Alternete voice" کے تجربات کا آپ کی زندگی میں کیا رول ہے؟

☆☆ ان تمام رسالوں اور مطبوعات نے میرے ادبی سفر میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ ابتداء گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ا پشاور کے ادبی پوسٹر پیام عمل سے ہوئی۔ یہ پندرہ روزہ پوسٹر تھا جس کی ادارت کے لیے شرط یہ تھی کہ مدیر خوش نویس ہو۔ اس طرح ہم تین یا چار لڑکے یہ پوسٹر بناتے تھے اور یہ پوسٹر سکول کے نوٹس بورڈز پر چسپاں کئے جاتے تھے۔

اسلامیہ کالج کے مجلّہ خیبر سے میں پہلے ہی سے مانوس تھا۔ میرے دو بڑے بھائی اسلامیہ کالج کے پڑھے ہوئے تھے۔ میری دلی خواہش تھی کہ اگر مجھے اسلامیہ کالج میں داخلہ مل گیا تو کوشش کروں گا کہ خیبر کے ایڈیٹوریل بورڈ کا ممبر بن جاؤں۔ گلزار صاحب، یہ میری خوش قسمتی سمجھیں کہ میری دونوں خواہشیں پوری ہوئیں۔

اسلامیہ کالج کے بعد میرا اگلا پڑاؤ خیبر میڈیکل کالج پشاور تھا۔ یہ کالج دو سال پرانا تھا جب میں داخل ہوا۔ میرے داخلے کے دوسرے سال ہم نے کالج کے رسالے سینا کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ لٹریری سوسائٹی کے اکثر ممبران کو ایک ادبی رسالے کو ترتیب دینے کا تجربہ نہ تھا۔ مجھے خیبر کی ادارت کا کچھ تجربہ تھا اس لیے مجھے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل کر دیا گیا۔ ایڈیٹرز کا چناؤ لٹریری سیکرٹری کرتے تھے۔ اور لٹریری سیکرٹری کا انتخاب سٹوڈنٹ باڈی الیکشن کے ذریعے کرتی تھی۔ اس لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک بار آپ ایڈیٹر بن گئے تو آئندہ چند سال بھی ایڈیٹر رہیں گے۔ میں نے صرف سینا کا پہلا شمارہ ترتیب دیا۔ اس کے بعد سینا کو آگے بڑھانے کا موقع نہ مل سکا۔

خیبر میڈیکل کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد میں امریکہ آ گیا۔ اور پندرہ سال میں نے اسلامک سنٹر آف ٹولیڈو کے مجلّے مانیٹر کی ادارت کی۔ اسی مجلّے کی وجہ سے میں نے انگریزی میں لکھنا شروع کیا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ باقی انگریزی اخبارات اور مطبوعات کے لیے بھی لکھنا شروع کیا۔

۲۰۰۵ء میں، میں نے ایک انگریزی رسالہ شائع کرنا شروع کیا۔ پس منظر یہ تھا کہ امریکہ میں اسلامی روشن خیالی کے پرچار کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ میری کوشش تھی کہ اجتہاد کو بنیاد بنا کر ایسے موضوعات پر بحث کی جائے جو روزمرہ کی زندگی میں اہم ہونے کے باوجود رسمِ تحریم اور قدامت پسندی کا شکار ہیں۔ مثلاً بنکاری منافع، بنک سے قرضہ لینا، سائنسی طریقہ سے اسلامی تہواروں کا تعین کرنا وغیرہ وغیرہ۔ دی الٹرنیٹ وائس (The Alternage Voice) ہر دو مہینوں کے بعد چھپتا تھا اور آٹھ سے بارہ صفحوں پر مشتمل یہ رسالہ دو ہزار مسلم اور غیر مسلم ہاتھوں میں پہنچتا تھا۔ رسالہ بہت پسند کیا گیا بدقسمتی سے مالی مشکلات کی وجہ سے یہ رسالہ اب تعطل میں چلا گیا ہے۔

اب بات کرتا ہوں زاویہ کی۔ یہ رسالہ میرے محترم دوست جوہر میر مرحوم نے نیویارک سے جاری کیا تھا۔ یہ سہ ماہی ادبی رسالہ تھا جو کوالٹی اور طباعت کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ جوہر میر نے یہ رسالہ چند سال چلایا لیکن ان کی بے وقت موت سے یہ رسالہ بند ہو گیا۔ ادبی رسالہ نکالنا تو گلزار صاحب آپ کو معلوم ہے گھاٹے کا سودا ہوتا ہے۔ جوہر میر نے اپنی ساری پونجی اس رسالے میں لگا دی تھی۔ اُن کی وفات کے بعد ارشاد احمد صدیقی، عتیق صدیقی اور میں نے رسالہ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اب یہ رسالہ ارشاد احمد صدیقی کی ادارت میں ہر تیسرے مہینے شائع ہوتا ہے۔ ہم تین دوست اپنے عزیز مرحوم دوست جوہر میر کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری کر رہے ہیں۔

☆ میڈیکل کا طالب علم بی۔اے۔ آنرز اور ادیب فاضل کس جذبے اور ضرورت کے تحت کرتا ہے اور آگے چل کر یہ تعلیم کس طرح اُس کے لیے کارآمد ثابت ہوتی ہے؟

☆☆ گلزار صاحب آپ نے یہ سوال اس خیال سے تو نہیں کیا کہ یہ کیسا ہونق آدمی ہے کہ ڈاکٹر بننے کے بعد ادیب عالم بننے کا سوچتا ہے۔ بعینہ یہی بات مجھ سے میرے اسلامیہ کالج کے اردو کے پروفیسر طاہر فاروقی نے بھی کی تھی۔ جب میں اُن کے پاس ادیب عالم کرنے کے بارے میں مشورہ کرنے گیا تھا۔

ادیب عالم کرنے کے پیچھے یہ بات بھی تھی اور میں یہ بات ازراہ تفنن کہتا ہوں کہ اسلامیہ کالج میں خیبر کی ادارت کے وقت انگریزی سیکشن کے ایڈیٹر داؤد کمال ایک منجھے ہوئے شاعر تھے اور وہ بعد میں یونیورسٹی آف پشاور کے شعبہ انگریزی کے چیئرمین بنے۔ پشتو کے ایڈیٹر محمد نواز طاہر بھی زمانہ طالب علمی میں پشتو ادب میں نام پیدا کر چکے تھے۔ بعد میں وہ پشتو اکادمی کے ڈائریکٹر اور شعبہ پشتو کے چیئرمین بھی رہے۔ ان کے مقابلے میں میری قابلیت اور کوالیفیکیشن نہ ہونے کے برابر تھی۔ شاید میں خیبر کی ادارت کے آٹھ سال بعد اپنے کاغذات درست کر رہا تھا۔ اسے انگریزی میں Ex-post-facto کہتے ہیں۔

فاروقی صاحب نے کہا کہ نثر اور نظم کے پرچوں کی تیاری میں وقت ضائع مت کرو، اردو ادب کی تاریخ پڑھ لو۔ ان کی بات ابھی تک یاد ہے کہ

گرائمر کے پرچے کی تیاری مت کرو۔ گرائمر نہ تو تمہیں پہلے آتی تھی، اب کیا سیکھو گے۔ اگر کچھ نہ کرسکو تو فوراً پرچہ دے دینا۔ تو میں نے یہی کیا گرائمر کا پرچہ کورے کا کورا دے دیا۔ اب ستم ظریفی دیکھئے کہ نہ صرف پاس ہو گیا بلکہ اول پوزیشن بھی حاصل کی۔

☆ آپ اپنے دو استاد پروفیسر فلوز اور پروفیسر حبیب الرحمٰن سے متاثر رہے ہیں۔ کچھ یادیں اُن کی نسبت ہمارے قارئین سے شیئر کیجیے؟

☆☆ ارے گلزار صاحب آپ نے یہ دو نام لے کر مجھے ساحر لدھیانوی کی نظم اے نئی نسل یاد دلا دی۔ جو انہوں نے گورنمنٹ کالج لدھیانہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر ۱۹۷۰ء میں لکھی تھی۔ نظم کا شعر ملاحظہ کریں۔

یاد آتے ہیں ان فضاؤں میں
کتنے نزدیک اور دور کے نام

مائیکل فلوز اسلامیہ کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ ۱۹۳۸ء میں ہندوستان آئے اور بٹوارے سے پہلے دلی کے سینٹ سٹیفن کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں اسلامیہ کالج پشاور سے وابستہ ہوئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ کیا ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انگریزی پڑھانے کے علاوہ وہ سوشل ورکس کے انچارج تھے اور ہر سال موسم گرما کی تعطیلات میں طلباء کو ہزارہ کے پہاڑوں میں ملیریا کے خاتمے کے لیے سپرے کرانے لے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ پشاور کے لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے لیے خون کے عطیات کی فراہمی کا بندوبست کرتے تھے اور خود بھی سینکڑوں بار خون کا عطیہ دیتے تھے۔ اپاہج بچوں کو آرتھو پیڈک سرجن کے پاس لے جانے کا اور آپریشن کرانے کا بندوبست بھی کرتے تھے۔ غرض کیا کچھ تھا جو انہوں نے نہ کیا۔ غریب اور نادار طلباء کی فیس اپنی جیب سے دیتے تھے۔ ان کی مخصوص سواری سائیکل تھی۔ کیمپس میں شہر اور صدر میں وہ سائیکل پر گھومتے تھے۔ اسلامیہ کالج کے بعد کا ذکر ہے ایک بار وہ مجھے ملنے یونیورسٹی ہاسٹل آئے۔ میرے پاس چابی والا گراموفون دیکھ کر حیران ہوئے۔ انہوں نے مجھے میرے عزیز دوست سراج کو مدعو کیا کہ ہم اپنے پسندیدہ ریکارڈ لے کر ان کے فلیٹ آئیں۔ تو ہم اگلے ہفتے سہگل، جگ موہن، پنکج ملک، کملا جھریا اور ملکہ پکھراج کے ریکارڈ بغل میں دبائے اُن کے اسلامیہ کالج والے فلیٹ پہنچ گئے۔ انہوں نے جب ہمارے ریکارڈ اپنی الیکٹرانک ریکارڈ پلیر پر بجائے تو لطف آ گیا۔ واقعی سہگل اور جگ موہن کی آوازیں چمک اٹھیں۔

ایک بار وہ امریکہ میرے پاس آئے۔ میں ان کو کینیڈا لے گیا جہاں ہم نے سٹیڈفورڈ اُپان ایوان (Stratford upon avon) کے شیکسپیئر تھیٹر میں دو ڈرامے دیکھے۔ ان کی وفات تک ہمارا تعلق قائم رہا۔

فلوز صاحب کے بارے میں ایک اور بات یاد آ گئی۔ یہ شاید ۱۹۸۰ء کی دہائی کا ذکر ہے۔ میں نے اخبار میں پڑھا کہ ملکہ الزبتھ نے اپنے سالانہ اعزازات کی فہرست میں ایک اعزاز بکنگھم پیلس کی ایک خادمہ کو بھی دیا۔ پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا کہ حکومت برطانیہ نے ان انگریزوں کو نظر انداز کر دیا ہے جنہوں نے تقسیم ہند کے بعد انگلستان جانے کی بجائے ہندوستان اور پاکستان میں رُک کر وہیں لوگوں کی خدمت کرتے رہے اور اس طرح انگریز قوم کا نام، جو بٹوارے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی جانبدارانہ مداخلت سے پائمال ہو چکا تھا، روشن کرتے رہے۔ میں نے اس مضمون کا خط اس وقت کی برطانوی پرائم منسٹر مارگریٹ تھیچر کو لکھا۔ معلوم نہیں یہ میرے خط کا نتیجہ تھا یا حکومت برطانیہ اپنے طور پر فلوز صاحب کی خدامت کا اعتراف کرنے والی تھی۔ اگلے انعامات کی فہرست میں فلوز صاحب کو آفیسر آف دی برٹش ایمپائر (OBE) کا خطاب دیا گیا۔ اس کے تھوڑے عرصے کے بعد حکومت پاکستان نے بھی اُنہیں ستارۂ امتیاز کا ایوارڈ دیا۔

اب آتا ہوں دوسری شخصیت کی طرف جن کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ سر جن حبیب الرحمٰن میرے استاد تھے اور میں نے اُن کے ساتھ ایک سال ٹریننگ (ہاؤس جاب) بھی کی تھی۔ وہ خوش لباس، خوش گفتار، بذلہ سنج، خوبرو، متین اور سلجھے ہوئے انسان تھے۔ وہ با اصول انسان تھے اور اصولوں کی خاطر وہ بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر لینے کو تیار رہتے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خان کے مارشل لاء کے زمانہ میں تمام سرکاری ہسپتالوں میں فوجی افسروں کو تعینات کیا گیا۔ ہماری قسمت میں کرنل نورالدین لکھے ہوئے تھے وہ لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ فوجی لوگ سمجھتے ہیں کہ زندگی کی ہر مشکل کا علاج ڈنڈے میں ہے۔ انہوں نے حکم صادر کر دیا کہ تمام پروفیسران ہر روز صبح اُن کے دفتر میں آ کر رجسٹر پر دستخط کریں۔ شاید اُن کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ چند پروفیسران وقت پر ہسپتال نہیں آتے۔ سب پروفیسروں نے مرغ باد نما بن کر حکم کی تعمیل شروع کر دی۔ حبیب الرحمٰن صاحب نے انکار کر دیا۔ اُن کے لیے یہ ایک پروفیسر کی شان کے خلاف تھا کہ وہ ایک ایڈمنسٹریٹر کے دفتر جا کر حاضری لگائے۔ دوسرا یہ بھی کہ حبیب الرحمٰن ہمیشہ وقت سے پہلے ہسپتال آتے تھے اور چھٹی کے وقت سے بعد میں جاتے تھے۔ وہ شاید ایک ہی پروفیسر تھے جو شام کو راؤنڈ کرنے آتے تھے۔ کرنل صاحب نے حکم عدولی کا نوٹس لیا اور فرمان جاری کیا کہ اگر ایک ہفتے کے اندر اندر اُن کے حکم کی تعمیل نہ کی گئی تو حبیب الرحمٰن کو ملازمت سے الگ کر دیا جائے گا۔

حبیب الرحمٰن نے خان عبدالقیوم کو اپنا وکیل مقرر کیا اور پشاور ہائی کورٹ میں رِٹ دائر کر دی۔ اب کرنل صاحب کو بھی ہوش آیا کہ سویلین زندگی میں ہر کام ڈنڈے کے زور سے نہیں ہو سکتا۔ کرنل صاحب نے اپنا حکم واپس لے لیا اور مرغ باد نما بھی اپنی پرانی روش پر آ گئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد حبیب الرحمٰن صاحب منصورہ لاہور میں جماعت اسلامی کے ہسپتال میں اعزازی طور پر کام کرنے لگے۔ میں پاکستان

جاتا تو لاہور جا کر اُن کی قدم بوسی کرتا تھا۔ ہمیشہ محبت سے پیش آتے۔ اپنے سٹاف سے میرا تعارف اس طور پر کراتے جیسے میں بہت اہم ہوں۔ حالانکہ میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ ان کا طالبِ علم سمجھا۔ اسی طرح ۲۰۰۲ء میں لاہور جانا ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ اسی سال انتقال کر گئے تھے۔

☆ طب کی تعلیم آپ کی چوائس تھی یا بزرگوں کی خواہش کی تکمیل؟

☆☆ میری چوائس تھی لیکن اس میں میرے گھر والوں کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ میرے دادا ہمارے خاندان کے پہلے ڈاکٹر تھے۔ اُن کے والد اور دادا لاہور میں حکمت کرتے تھے۔ دادا کی وفات کے وقت میرے والد ۱۴ یا ۱۵ سال کے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد بہنوں کی کفالت کا بوجھ میرے والد صاحب کے سر پڑ گیا۔ بمشکل میٹرک کی اور پھر ملازمت کر لی اور حکومت کی نوکری میں ترقی کرتے اعلیٰ عہدے پر پہنچے لیکن خاندان والوں کو قلق تھا کہ دادا کے بعد اُن کے پوتوں میں سے کوئی ڈاکٹر نہیں بنا۔ اس لئے بچپن سے ہی میرے متعلق پھوپھیاں کہتی تھیں کہ میں ڈاکٹر بن کر دادا کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔ اس طرح بار بار کی تکرار اور تاکید نے میرے مستقبل کا تعین کر دیا۔

☆ ۱۹۶۳ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ کس وسیلے سے آئے اور Materialistic سوسائٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کن مسائل اور مشکلات کا سامنا رہا؟

☆☆ گلزار صاحب! آپ بھی اُس غلط فہمی بلکہ دشنام طرازی کے مرتکب ہو گئے ہیں جو پاکستان میں بہت عام ہے وہ یہ کہ مغربی اقوام مادہ پرستی اور حرص و ہوس کا شکار ہیں۔ میں مغربی دنیا کے تمام ممالک کے بارے میں نہیں کہہ سکتا لیکن امریکہ اور کینیڈا کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان دو ملکوں میں اگر مادہ پرستی ہے تو وہ مشرقی ممالک سے بہت کم ہے۔ ہاں اگر آپ ماضی بعید کی بات کر رہے ہیں تو میں کسی حد تک آپ سے اتفاق کر سکتا ہوں لیکن ماضی قریب اور حال میں تو ہم لوگ مادہ پرستی، حرص و ہوس کے میدان میں ان تمام اقوام سے بہت آگے نکل چکے ہیں تو ان کلمات کی روشنی میں، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ امریکن لوگوں نے ہمیشہ میری مدد کی اور میرے تعلیمی سفر میں ہر قدم پر میری راہنمائی کی۔

☆ تعلیم کے بعد واپسی کی وجوہات کیا تھیں اور اس حوالے سے ڈاکٹر رضا علی خاں کا کردار کس نوعیت کا تھا؟

☆☆ امریکہ میں سات سالہ قیام (۱۹۶۳ء۔۔۱۹۷۰ء) کے دوران میں نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ میں امریکہ کی شہریت اختیار کر لوں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں سرجری ٹریننگ کے آخری سال میں تھا تو مجھے ایک یونیورسٹی سے جاب آفر آئی۔ یونیورسٹی کے چیئرمین مشہور زمانہ سرجن تھے۔ میں اُن سے ملنے گیا اور اُن کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا کہ میں اُن کی آفر قبول نہیں کر سکتا کیونکہ میں ٹریننگ ختم ہونے کے بعد واپس پاکستان جا رہا ہوں۔ پوچھا پاکستان میں تمہارے پاس جاب ہے میں نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کہ پشاور یونیورسٹی والوں نے جاب دینے کا وعدہ کیا ہوا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ وہ حیران ہوئے اور پوچھا کہ تمہیں جاب ملنے میں دقت تو نہیں ہوگی؟ میں نے جواب دیا معلوم نہیں۔ یہ سن کر وہ کنفیوژ ہو گئے۔ کہنے لگے تم جیسا ڈم فول میں نے پہلے نہیں دیکھا۔ میں تم کو اسسٹنٹ پروفیسر کی جاب آفر کر رہا ہوں اور تم اس آفر کو مسترد کر کے ایک غیر یقینی مستقبل کو چن رہے ہو۔ میں نے اُنہیں کہا کہ اگر میں واپس نہ گیا تو اس کا مجھے عمر بھر افسوس رہے گا۔ مستقبل غیر یقینی سہی لیکن میں نے کوشش ضرور کرنی ہے۔ انہوں نے کہا جاؤ لیکن اگر پاکستان میں بات نہ بن سکے تو واپس آ جانا جاب آفر بدستور رہے گی۔

اُن دنوں خیبر میڈیکل کالج، پشاور کے پرنسپل میرے استاد پروفیسر سید رضا علی تھے۔ یونیورسٹی نے ہارٹ سرجن کے لیے ایک جاب کا اشتہار بھی دیا تھا میں نے درخواست دی ہوئی تھی۔ رضا صاحب نے انٹرویو کے لیے امیدواروں کو بلانے سے انکار کر دیا۔ کہا کہ جاب غلطی سے ایڈورٹائز ہو گئی تھی۔ میں نے مزید اٹھارہ مہینے انتظار کیا اور جنرل سرجری کی جاب کے لیے درخواست دے دی۔ تب بھی باقی پروفیسروں نے میرا پتہ کاٹنے کی کوشش کی لیکن اس جاب پر میرا تقرر ہو گیا۔ میں نے ایک سال بطور جنرل سرجن کام کیا لیکن ساتھ ساتھ ہارٹ سرجری بھی شروع کر دی۔ یہاں بھی سید رضا علی صاحب نے مری مخالفت کی کہ میں ہارٹ سرجری نہ کروں بلکہ میڈیسن ڈیپارٹمنٹ کے تمام پروفیسروں کو نوٹس بھیجا کہ وہ مجھے ہارٹ سرجری کے مریض مت بھیجیں کیونکہ ہسپتال میں ہارٹ سرجری کی سہولتیں ابھی موجود نہیں تھیں۔

ایک سال کے بعد میں نے لمبی چھٹی لے لی۔ اس وقت کے پرنسپل ڈاکٹر جنرل ایوب نے وعدہ کیا کہ آئندہ سال کے اندر ہم ہارٹ سرجری کا شعبہ کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جب یہ ہو جائے تو تم واپس آ جانا۔ اس اثناء میں تم امریکہ میں ہارٹ سرجری کا مزید تجربہ حاصل کرو۔ یہ میری بدقسمتی سمجھیں کہ جنرل ایوب کے بعد رضا صاحب دوبارہ پرنسپل ہو گئے۔ انہوں نے میری چھٹی میں توسیع کرنے سے انکار کر دیا بلکہ نوٹس دیا کہ میں چھٹی کی معیاد ختم ہونے کے بعد واپس آ کر بطور جنرل سرجن کام شروع کروں اور اس میں یہ شرط بھی لگائی کہ میں ہارٹ سرجری نہیں کروں گا۔ ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے استعفیٰ دے دیا۔

استعفیٰ کے بعد دو ایک سال میں میڈیکل کالج سے شاکی رہا لیکن میں نے یہ سوچ کر کہ رضا صاحب کی طرز کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں درسگاہ اپنی جگہ موجود رہتی ہے۔ میری وفاداری اور Dedication درسگاہ کے ساتھ ہے۔ درسگاہ کے متعلق لوگوں کے ساتھ نہیں۔ ایک بار میری سوچ اس سطح پر ہوئی تو میں نے ہر سال ایک مہینے کے لیے پشاور جا کر کالج میں اعزازی طور پر پڑھانا شروع کیا اور گزشتہ پچیس سالوں سے پڑھا رہا ہوں۔ کالج اور

یونیورسٹی کے ارباب اختیار کے ساتھ میرے بہت اچھے مراسم ہیں۔ ڈاکٹر رضا صاحب بھی جب ملتے ہیں محبت سے ملتے ہیں اور میں بھی نہیں بہت عزت دیتا ہوں کہ میرے استاد تھے اور بہت اچھے استاد تھے۔

☆ Madam Dottie سے آپ کی ملاقات کب، کہاں اور کیسے ہوئی اور دوستی کے کتنے عرصہ بعد معاملات شادی تک پہنچے اور یہ پیشکش کس کی جانب سے ہوئی؟

☆☆ میری ملاقات میری مستقبل کی بیوی کے ساتھ مامی ویلی ہسپتال میں ہوئی جب میں ۱۹۶۴ء میں وہاں سرجری کی ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ پہلی نظر والی محبت نہیں تھی، دوستی ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ دوستی رومانیت کے دائرے میں داخل ہوگئی۔ ایک سال کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ ڈاٹی براؤن ہی میرے مستقبل کی ساتھی ہے۔ میری شرط یہ تھی کہ شادی کے بعد وہ میرے ساتھ پاکستان جائے گی اور اہم اپنی زندگی پاکستان میں گزاریں گے، تین سال کی ہچکچاہٹ کے بعد اُس نے میری شرط منظور کر لی اور ۱۹۶۸ء کے اوائل میں ہماری شادی ہوگئی۔

☆ شادی کس عقیدے کے تحت ہوئی، شادی کے بعد آپ اور آپ کی اہلیہ کس عقیدے پر کاربند رہے؟

☆☆ ہمارا نکاح ٹولیڈو کی مسجد کے امام عادل العیر نے پڑھایا۔ شادی کے بعد ہم نے فی الوقتی کوشش کی کہ گھر میں اسلامی ماحول ہو۔ ہمارے بچوں کی پرورش بھی ایسے ہی ماحول میں ہوئی۔

☆ ایک پاکستانی بالخصوص مسلمان اور پٹھان سے شادی کے بعد آپ کی بیگم کے پاکستان، مسلمان اور پختون تہذیب وتمدن اور بود وباش کی بابت In the whole کیا رائے تھی؟

☆☆ شادی تو میں نے کر لی، لیکن پشاور میں خاندان کو اطلاع شادی کے بعد دی۔ مجھے ڈر تھا کہ بڑے بھائی جنہیں میں والد کا درجہ دیتا تھا، کسی نہ کسی طرح مجھ پر زور ڈال کر مجھے شادی کرنے سے روکیں گے۔ بہر حال جب اطلاع پہنچی تو ہمارے گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ دوست احباب، رشتہ دار افسوس اور تعزیت کے لیے آنے لگے۔ اُن کی ناراضگی کے باوجود میں اپنے پروگرام کے مطابق دو سال کے بعد بمعہ بیوی بچوں کے پاکستان چلا گیا۔ اسے میری خوش قسمتی سمجھیں کہ تھوڑے عرصہ ہی میں میری بیوی گھر والوں کے ساتھ گھل مل گئی۔ خاندان والوں نے اُسے کھلے دل سے قبول کیا اور اپنے گھرانے کی بہوؤں سے بھی زیادہ عزت اور محبت دی۔ پشاور میں چار سال قیام کرنے کے بعد چند وجوہات کی وجہ سے جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، ہم واپس امریکہ چلے گئے لیکن ہر سال ایک مہینے کے لیے ہم پاکستان جاتے رہے۔ اس طرح ڈاٹی کا تعلق گھر والوں کے ساتھ جُڑا رہا۔

☆ Inter Religion Marriages کے بعد جو بچے وجود میں آتے ہیں اُن کی نفسیات اور روزمرّہ کا برتاؤ کس طرح کا ہوتا ہے؟

☆☆ ہمارا گھر پاکستانی اور امریکن رسم و رواج کا امتزاج تھا۔ ہماری کوشش تھی کہ ہمارے بچے امریکن ہونے کے ساتھ کسی حد تک اپنا اسلامی اور پاکستانی تشخص قائم رکھیں۔

☆ آپ اپنی والدہ کے بارے بہت حساس اور جذباتی واقع ہوئے ہیں، ہونا بھی چاہیے۔ بادلِ نخواستہ آپ کو اپنی اور اپنے بچوں کی والدہ کا موازنہ کرنا پڑے تو نتائج کیا برآمد ہوں گے؟

☆☆ میری والدہ غیر تعلیم یافتہ تھیں۔ قرآن کے علاوہ وہ کچھ نہیں پڑھ سکتی تھیں (انگریزی میں ہم Unlettered کہہ سکتے ہیں) لیکن وقار، متانت، مہمانوازی اور میل جول میں وہ غیر تعلیم یافتہ نہیں لگتی تھیں۔ یہ قدریں بہت حد تک میری بیوی میں بھی تھیں۔ اس لیے ان دونوں کے درمیان جو رشتہ قائم ہوا وہ میری والدہ کی ۱۹۹۲ء میں وفات تک قائم رہا۔

☆ شریکِ حیات کی وفات کے بعد آپ پر ہجر وفراق کی جو کیفیت طاری رہی اُس سے آپ نے خود کو کس طور نجات دلائی اور آج کل آپ کے محسوسات کیا ہیں؟

☆☆ ہمارا چالیس (۴۰) سال کا ساتھ۔ ازدواجی بندھن کے علاوہ ہم قریبی دوست بھی تھے۔ انگریزی میں اس رشتے کو Soul Mates بھی کہہ سکتے ہیں یعنی روحوں کے ساتھی۔ ڈاٹی کی وفات کے بعد مجھ پر ایک گہری ڈیپریشن (Depression) طاری ہوگئی۔ ایک دن یکا یک خیال آیا کہ کیوں نہ میں اُسے خط لکھوں اور بتاؤں کہ اُس کے جانے کے بعد کیا ہو رہا ہے۔ دو سال تک میں یک طرفہ خط وکتابت کرتا رہا۔ اسی مشق نے مجھے ڈیپریشن کے عمیق غار سے نکال کر دوبارہ زندگی کی دوڑ میں لا کھڑا کیا۔ اُن خطوں پر مشتمل میری کتاب With Whom Shall I Talk in The Dead of Night پچھلے سال یونیورسٹی آف ٹولیڈو پریس نے شائع کیا۔

☆ Bycycle آپ کی زندگی میں اہم کردار کی حامل رہی ہے۔ کچھ اس شوق کے حوالے سے معلومات فراہم کیجیے؟

☆☆ ہائی اسکول میں تھا تو پیدل سکول جاتا تھا۔ فاصلہ تقریباً ایک میل تھا۔ ریڈیو پاکستان پشاور کوئی دو (۲) میل دور تھا۔ وہاں بھی بچوں کے پروگراموں اور بعد میں ڈراموں میں حصہ لینے کے لیے پیدل ہی جاتا تھا۔ پہلی سائیکل کالج میں داخل ہونے کے بعد ملی۔ یہ پرانی سائیکل تھی لیکن میری تھی۔ پہلی سائیکل کا نقشہ اُن لوگوں کو معلوم ہوتا ہے جو ایک عرصہ سے سائیکل کا خواب دیکھ رہے ہوں اور اُس خواب کی تعبیر ہو جائے۔ پشاور شہر سے اسلامیہ کالج کوئی آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ گرمی سردی میں چند دوستوں کے ساتھ مل کر سائیکل پر کالج جایا کرتا تھا۔

اب میں شوقیہ سائیکل چلاتا ہوں۔ ہفتے میں تین چار مرتبہ موقع ملتا

ہےاور ہر بارتقریباً پچیس میل چلاتا ہوں۔سکوائش بھی کھیلتا ہوں، پیدل بھی چلتا ہوں،ان سب کاموں سے میرے ہاتھ پاؤں حرکت میں رہتے ہیں۔

☆ کیلی گرافی کا شغف بھی آپ کے ہاں سنجیدگی کا حامل رہا ہےاس حوالے سے بھی ہمارے قارئین کو باخبر کیجیے؟

☆☆ خوشخطی کا ذوق میرے اندر دوسری جماعت کے استاد لال شاہ جگر کاظمی نے پیدا کیا۔ میں کورے کاغذ پر کوئی شعر یا کہاوت لکھ کر اور اُس کے گرد پھول بوٹے بنا کر اُن کی میز پر رکھ دیتا۔ وہ دیکھتے اگر پسند کرتے تو اپنی میز کے ساتھ دیوار پر ٹانک دیتے۔ مجھے ایسا لگتا گویا میرے فن کی نمائش کسی شہرہ آفاق آرٹ گیلری میں ہوگی۔ وہیں سے خوشخطی سے لگاؤ پیدا ہوا اور اب تک جاری ہے۔ انگریزی میں بھی کیلی گرافی کرتا ہوں اور اگر قریبی دوست یا رشتہ دار کی شادی ہو رہی ہو تو میں انہیں دعوت ناموں پر کیلی گرافی کا تحفہ دیتا ہوں۔ قریبی دوستوں کے بچوں کی شادیوں پر سہرا بھی لکھ کر اور فریم کرا کر تحفتاً دیتا ہوں۔ شاعری کسی دوست سے کراتا ہوں کہ مجھے شعر کہنے کا ڈھنگ نہیں ہے۔

☆ فوٹو گرافی میں آپ نے عالمی سطح کے انعامات اور اعزازات حاصل کیے ہیں آپ ہمیں شوق کی ابتدا سے انتہا تک کی کہانی بتلائیے؟

☆☆ فوٹوگرافی کی ابتداء پروانی باکس کیمرے سے ہوئی جو بڑے بھائی نے مجھے تحفتاً دیا تھا۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ ہائی سکول کے دنوں میں پرنٹنگ وغیرہ بھی خود کرتا تھا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں، میں نے لیبارٹری بنائی تھی۔ وہیں پرنٹنگ کرتا تھا۔ والدہ بہت ناراض ہوتی تھیں کہ میں اچھی کراکری کی رکابیاں کیوں استعمال کرتا ہوں لیکن ان کے بغیر کام نہیں چلتا تھا۔

میری بہت ساری تصویروں کو انعام ملے اور میری لی ہوئیں ۳۳ تصویریں رسالوں کے سرورق پر اور ۶ کلینڈروں میں چھپ چکی ہیں۔ جب کوئی مجھ سے پوچھتا ہے اچھی تصویر لینے کا راز کیا ہے تو میں انہیں کہتا ہوں کہ میری فوٹو گرافی بالکل اس طرح ہے جس طرح میں شکار کھیلتا ہوں۔ بندوق لے کر ہوا میں فائر کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ کوئی بدقسمت پرندہ چھروں کی زد میں آجائے۔

☆ خیبر پختونخوا نے سکوائش کے نامور کھلاڑی ہر دور میں پیدا کیے ہیں۔ آپ کا اس کھیل سے لگاؤ کس جذبے کا عکاس ہے اور آپ نے یہ کھیل کس درجے تک کھیلا ہے؟

☆☆ میں نے سکوائش کا کھیل پہلی بار امریکہ میں دیکھا۔ ہاشم خان صاحب ایک نمائشی میچ کھیلنے کے لیے ہمارے شہر آئے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ پوچھا کب سے تم یہاں ہو؟ میں نے کہا ایک سال سے۔ تو برجستہ کہا کہ پہلے کیوں رابطہ نہیں کیا۔ اُن کے لہجے میں مہمانوازی اور محبت کی جھلک تھی۔ وہیں سے ہماری دوستی کا آغاز ہوا۔ اور ابھی تک وہ تعلق قائم رہے۔ ۱۹۷۶ء میں ، میں نے سکوائش کھیلنی شروع کیا۔ ہاشم صاحب نے ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھایا اور جب کبھی ٹولیڈو آئے، میرے ساتھ سکوائش کھیلی اور مجھے سکوائش کے باریک نقطے سمجھائے۔ میں سی ڈویژن کا کھلاڑی ہوں۔ ہفتے میں دو تین بار کھیلتا ہوں۔ گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے میرا کھیل ڈھل گیا ہے۔ لیکن پھر بھی شوق ہے۔ ہاشم صاحب اب ۹۰ کے پیٹے میں ہیں۔ جب بھی فون پر بات ہوتی ہے پہلا سوال یہ کرتے ہیں سکوائش اب بھی کھیل رہے ہو۔

☆ کوہ پیمائی سے آپ کا رومانس کب اور کیونکر شروع ہوا۔ ۱۹۸۶ء میں انڈس ہائی وے کی نسبت جو ٹیم آپ نے بنائی تھی اُس کے اغراض ومقاصد کیا تھے نیز ویسٹرن تبت کی جانب آپ نے جو شارٹ کٹ دریافت کیا تھا اُس سے استفادے کی کیا صورت رہی؟

☆☆ میرے بھائی سید نذیر حسین فٹ بال کے اعلیٰ کھلاڑی تھے، وہ پاکستان کی ٹیم میں بھی کھیلے۔ انہیں کوہ پیمائی کا شوق بھی تھا۔ ہر سال گرمیوں کی تعطیلات میں وہ مجھے اور ہمارے سانجھے دوستوں کو لے کر شمالی علاقہ جات ہائکنگ کے لیے لے جایا کرتے تھے۔ وہیں سے مجھے یہ شوق ہوا۔ لیکن اس شوق کی انتہا دریائے سندھ کی مہم جوئی کے ساتھ ہوئی۔ بچپن سے شوق تھا کہ دیکھوں دریائے کابل (جو پشاور کے قریب بہتا ہے) کہاں دریائے سندھ میں ملتا ہے اور پھر دریائے سندھ کی منزلیں کون کون سی ہیں۔

۱۹۸۷ء مین ہم نے دریائے سندھ کی مہم جوئی کا آغاز کیا اور تین مہموں میں دریائے سندھ کو پاکستان میں کور کیا۔ دریا کی فوٹو گرافی کی اور دریا کے کنارے بسنے والے لوگوں کو سٹڈی کیا۔ ۱۹۹۶ء میں ہماری ٹیم جو ٹیم انڈس کہلاتی ہے مغربی تبت کے کائی لاش پہاڑوں میں دریائے سندھ کے منبع تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ٹیم انڈس کی مہمات کی تفصیلات امریکی کانگریس کے ریکارڈ میں داخل کی گئیں اور عالمی مہم جوئی کی سب سے بڑی تنظیم ایکسپلورز کلب نے ہماری مہم جوئی کی کہانی اپنے مجلّے میں سرورق کہانی کے طور پر شائع کی۔ ہم نے سندھ کے منبع تک پہنچنے کے لیے ایک مختصر راستہ بھی دریافت کیا۔ فرق صرف دس میل کا تھا لیکن ۱۷ ہزار فٹ کی بلندی پر جہاں ہر قدم کٹھن اور دشوار ہوتا ہے دس میل کا فرق بہت ہی اہم ہے۔

☆ قائداعظم پر بننے والی انٹرنیشنل فلم ''جناح''میں آپ کے اشتراک کی نوعیت کیا تھی اس حوالے سے آپ کو کن تجربات اور حالات سے گزرنا پڑا؟

☆☆ فلم گاندھی کی بے حد مقبولیت کے بعد چند لوگوں کو خیال آیا کہ قائد اعظم پر بھی فلم بننی چاہیے۔ اکبر احمد نے فلم کا سکرپٹ لکھا اور جمیل دھلوی نے فلم ڈائرکٹ کی۔ اداکاروں میں کرسٹوفرلی، ششی کپور، جمیز فاکس اور مرّ یا ایٹکنز شامل تھے۔ اکبر احمد نے کوشش کی کہ حکومت پاکستان اس پراجیکٹ میں حصہ لے۔ نواز شریف صاحب نے جو ان دنوں وزیراعظم تھے وعدہ بھی کیا تھا لیکن وہ رقم نہیں ملی۔ فلم آخری مرحلوں میں رُک گئی۔ بھلا ہو میرے دوست ڈاکٹر نسیم اشرف کا کہ انہوں نے ڈیڑھ ملین ڈالر جمع کرنے کا ذمہ لے لیا۔ انہوں نے اپنے دس بارہ دوستوں کو آمادہ کیا کہ وہ اس فلم میں رقم لگائیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ یہ گھاٹے کا

سودا ہے نہ تو منافع ہوگا اور نہ ہی ہمارا سرمایہ واپس آئے گا۔ وہی ہوا لیکن بدقسمتی سے اکبر احمد اور نسیم اشرف اور باقی چند لوگوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے فلم بن تو گئی لیکن کامیاب نہ ہوسکی۔

فلم کا پلاٹ بچگانہ تھا۔ سکرپٹ میں بہت سی خامیاں تھیں۔ اگر مجھے ان باتوں کا علم ہوتا تو میں اس میں حصہ نہ لیتا۔ ایسے کاموں میں انوسٹمنٹ سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ فلم فلاپ ہوئی۔

☆ حکومت پاکستان نے ہیلتھ پالیسی بنانے کی جو ذمہ داری سونپی تھی اُس میں آپ کس طور پورا اُترے اور آپ کی بنائی ہوئی پالیسی کا حشر کیا ہوا؟

☆☆ ضیاء الحق کی حکومت کے ابتدائی سالوں میں، میں امریکہ میں پاکستانی ڈاکٹروں کی ایسوسی ایشن کا صدر تھا۔ ان کے امریکہ کے دورے کے دوران میری اُن سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے دعوت دی کہ ہم حکومت پاکستان کے پانچ سالہ صحت کے منصوبے میں اُن کی مدد کریں۔ مجھے اور میرے ساتھ ڈاکٹر اسلم ملک کو اس کمیٹی کا ممبر بنایا گیا جس نے یہ پالیسی بنانی تھی۔ کمیٹی کے اجلاسوں میں شرکت کرنے کے لیے ہم دونوں دو یا تین بار پاکستان گئے۔ یہ سعی لاحاصل تھی۔ پالیسی بن تو گئی اس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔

☆ لگ بھگ چار عشروں سے آپ پاکستان اور پاکستان سے باہر کن کن ممالک میں بلامعاوضہ طبی خدمات فراہم کر رہے ہیں اور اس کے کیا نتائج برآمد ہو رہے ہیں؟

☆☆ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں امریکہ میں سرجری کی تعلیم اور ٹریننگ ختم کرنے کے بعد میں نے چار سال پاکستان میں گزارے۔ امریکہ واپس لوٹنے کے بعد مجھے احساس تھا کہ میں نے پاکستان کے لیے کچھ نہیں کیا۔ حالانکہ اس ملک نے مجھے مفت تعلیم دے کر اس قابل بنایا کہ میں بین الاقوامی میدان میں پاکستان کا نام روشن کرسکوں۔ تو ۱۹۷۸ء سے میں ہر سال پاکستان جاتا ہوں اور خیبر میڈیکل کالج میں پڑھاتا ہوں۔ پاکستان کے دوسری میڈیکل کالجوں میں بھی میں نے اعزازی طور پر پڑھایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی تھا کہ دنیا کے کئی ممالک میں صحت کی سہولتیں کم معیار کی ہیں اور غریب و نادار لوگوں کو صحت کی سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ تو کئی سالوں تک میں نے ڈاکٹروں اور نرسوں کی ایک ٹیم کے ساتھ جنوبی امریکہ کے چند ممالک میں بلامعاوضہ طبی خدمات فراہم کی ہیں۔ اسی سلسلے میں، میں بطور وزیٹنگ پروفیسر چین، لیبیا اور ہندوستان بھی گیا ہوں۔

☆ پاکستان کے مختلف میڈیکل کالجز کو مفت طبی آلات اور مالی تعاون فراہم کرنے کا طریقہ کار کیا ہے اور یہ سلسلہ کب سے جاری ہے؟

☆☆ امریکہ میں سرجری کے آلات اور باقی میٹریل Disposable ہوتا ہے۔ وہ اس لئے کہ انہیں دوبارہ استعمال کے لیے تیار کرنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ ڈسپوزایبل میٹریل اس لحاظ سے سستا پڑتا ہے چونکہ میں ہر سال پاکستان جاتا رہا ہوں۔ میں یہ میٹریل جمع کرتا رہتا تھا اور وہ ساتھ پاکستان لے جاتا تھا۔ اس طرح اپریشن تھیٹر اور وارڈز میں استعمال ہونے والی مشینری بھی چند سالوں کے بعد بدل دی جاتی ہے۔ وہ بھی میں مرمت وغیرہ کرا کے پاکستان بھجوا دیتا تھا۔ اس میں خرچہ صرف بھجوانے کا آتا تھا۔ جو سامان پاکستان بھیجا جاتا تھا اس میں سرجری کے دوران استعمال ہونے والے دھاگے اور سوئیاں، پیس میکر، دل کی رگوں کو کھولنے والے Cathetor وغیرہ بھی شامل ہوتے تھے۔

آج کل امریکہ میں پاکستانی کارڈیالوجسٹ پاکستان کے مختلف میڈیکل کالجوں کو اس قسم کا سامان بھیجتے رہتے ہیں۔

☆ آپ نے میڈیکل کے شعبہ میں Special Endotracheal Tube اور Pleuroperitoneal Shunt کی ایجاد کب اور کن وجوہات کی بنا پر کیں اور میڈیکل کی دنیا میں آپ کی ایجاد کو کس نظر سے دیکھا گیا نیز ان سے استفادہ کی صورت کیا ہے؟

☆☆ سپیشل اوزاروں کی ایجاد کا تو یہ سلسلہ میری پیشہ وارانہ زندگی میں ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ان میں سے دو اوزار جن کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ اپنے وقت میں کافی مقبول ہوئے لیکن بہتر اوزار ایجاد ہونے کی وجہ سے وہ اب متروک ہو چکے ہیں۔

☆ طب کے شعبے کا مشہور و معروف اور مصروف ترین معالج عالمی معیار کے چار صد مقالات کب اور کیسے تحریر کر لیتا ہے اور اُن کی اشاعت کے بعد کیا نتائج سامنے آتے ہیں؟

☆☆ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں مجھے بچپن سے لکھنے کا شوق ہے۔ ۱۹۷۶ء کے لگ بھگ میں نے اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی لکھنا شروع کیا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے مقامی انگریزی اخبار بلیڈ کے مالک نے مجھے دعوت دی کہ میں اخبار کے لیے باقاعدگی سے کالم لکھوں۔ یہ سلسلہ ۱۹۹۲ء میں شروع ہوا تھا اور اب بھی جاری ہے۔ میرا کالم ہر دو ہفتے کے بعد چھپتا ہے۔ بلیڈ کے علاوہ میں باقی چند انگریزی اخبارات کے لیے بھی لکھتا ہوں۔ ان میں پاکستانی اخبارات بھی شامل ہیں۔ کوئی پانچ سال پہلے میں نے روزنامہ آج، پشاور کے ایڈیٹر عبدالواحد یوسفی کے اصرار پر اُن کے اخبار کے لیے بھی لکھنا شروع کیا۔

وقت کی پابندی میرے دانست میں ایک مذہبی فریضے کا درجہ رکھتی ہے۔ اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو گھڑی کی ٹک ٹک سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ وقت کی پابندی تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ اپریشن تھیٹر میں مریض کو نشہ دیتے وقت کچھ نشہ دینے والے ڈاکٹر انتہائی سست رفتاری سے کام کرتے ہیں۔ ٹولیڈو کے سینٹ ونسنٹ میڈیکل سنٹر میں مجھے بہت کوفت ہوئی تھی کہ ایک گھنٹہ نشہ دینے والے ڈاکٹروں کی سست رفتاری کی نظر ہو جاتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ان لوگوں کو تو راہ پر لگانے سے رہا۔ کیوں نہ میں وہ گھنٹہ لکھائی کا کام کروں۔

میں نے اپنے ساتھ زیرِ ترتیب کتاب کا مسودہ لے جانا شروع کیا۔ نشہ دینے والے جتنی دیر مریض کو نشہ دینے میں لگاتے، میں اپنے مسودے پر کام کرتا رہتا۔ اسی طرح سرجری کے انتظار میں، میں نے عالم میں انتخاب، پشاور کا مسودہ مکمل کیا۔ غلطی یہ ہوئی کہ مجھے وہ کتاب نشہ دینے والے ڈاکٹروں کے نام منسوب کرنی چاہیے تھی۔

☆ ایک امریکی دانشور آپ کی انگریزی تحریروں کی کلیات مرتب کر رہے تھے وہ پراجیکٹ کہاں تک پہنچا؟

☆☆ انگریزی تحریروں کے دو کلیات چھپ چکے ہیں۔ پہلی کتاب Of Home & Country: Jounrey of a Native son کوئی بارہ سال پہلے چھپی تھی۔ دوسری کتاب Treading a Fire line چند سال پہلے چھپی۔

☆ کچھ تفصیل AAPNA میں ادا کیے گئے کردار کے حوالے سے بتلایئے اور یہ بھی فرمایئے کہ اس قدر مہذب اور پڑھے لکھے لوگوں کی یہ تنظیم سیاست کا شکار کیوں ہے؟

☆☆ ۱۹۷۶ء میں ہم چند پاکستانی ڈاکٹروں نے رسیاست مشی گن کے شہر ڈیٹرائٹ میں اپنا کی بنیاد رکھی۔ گزشتہ ۳۷ سالوں میں اپنا نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اب یہ تنظیم پانچ ہزار پاکستانی ڈاکٹروں کی تنظیم ہے۔ یہ ڈیمو کریٹک تنظیم ہے جس کے الیکشن ہر سال ہوتے ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں مجھے اپنا کا چوتھا صدر منتخب کیا گیا۔ ۲۰۰۴ء میں، میں نے اپنا کی مبسوط تاریخ بھی لکھی۔

سیاست کے بارے میں آپ کا سوال بہت معصومانہ ہے۔ ہم پاکستانی لوگ جہاں کہیں بھی ہوں سیاست سے الگ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے میرے لئے یہ حیرت کی بات نہیں کہ اپنا میں بھی پاکستانی انداز کی سیاست چلتی ہے۔ ذاتی طور پر میں اس کا مخالف ہوں لیکن نقار خانے والی بات ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہی ڈاکٹر حضرات جو ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں اپنی امریکن پیشہ ورانہ تنظیموں میں فراست، بردباری اور ایمانداری سے کام کرتے ہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ رفتہ رفتہ گندی سیاست کو اپنا سے نکال دیں۔

☆ ٹولیڈو میں اسلامک مرکز بنانے کا خیال آپ کے ذہن میں کب آیا، یہ مرکز نارتھ امریکہ کا Greatest مرکز کیونکر بنا، اس مرکز کا دائرہ کار اور آپ کی ذمہ داری کی نوعیت کیا ہے؟

☆☆ جب ۱۹۶۳ء میں، میں ٹولیڈو آیا تو یہاں ایک چھوٹی مسجد موجود تھی جو دس سال پہلے لبنان اور شام کے لوگوں نے بنائی تھی۔ میری شادی اسی مسجد میں ہوئی تھی۔ پاکستان میں چار سال گزارنے کے بعد جب میں ۱۹۷۴ء میں ٹولیڈو واپس آیا تو پرانی مسجد بدستور استعمال میں تھی لیکن اس اثناء میں ٹولیڈو میں مسلمانوں کی آبادی کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ میری واپسی سے پہلے ہی مسجد کے لیڈر ایک بڑی مسجد بنانے کا سوچ رہے تھے۔ میں نے بھی اس پراجیکٹ کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ دو سپر ہائی ویز کے سنگھم پر ہمیں پچاس ایکڑ زمین مل گئی۔ ایک ترکی نژاد آرکیٹیکٹ نے نقشہ بنایا اور ۱۹۸۰ء میں تعمیر شروع ہوگئی۔ تین سال کی محنت، ریاضت اور مشقت کے بعد ٹولیڈو کا اسلامک سنٹر وجود میں آ گیا۔

شروع ہی سے ہمارا مقصد نہ صرف ایک خوبصورت مرکز بنانا تھا بلکہ اس مرکز میں ایسی روایات قائم کرنا تھیں جو اعلیٰ اسلامی اقدار کی مظہر ہوں۔ اس سلسلے میں ہمارا ہاتھ اُس وقت ہمارے امام عبدالمنعم خطاب نے بٹایا۔ امام مرحوم قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے اور اس کے علاوہ سوشل ورک میں ماسٹرز ڈگری بھی لے چکے تھے۔

یہ مرکز شاید امریکہ میں واحد اسلامی مرکز ہے جہاں ایک گنبد کے نیچے مرد اور عورتیں نماز پڑھتے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے سیکشن کے درمیان تین فٹ اونچی پارٹیشن ہے۔ علاوہ ازیں ہمارا مرکز سائنسی طریقے سے اسلامی تہواروں کا تعین بھی کرتا ہے۔ ہم نے مرکز، بنک سے قرضہ لے کر بنایا۔ ہماری دو خواتین مرکز کی صدر رہ چکی ہیں۔ میں دو بار مرکز کا صدر رہ چکا ہوں۔ اب ایک عام ممبر کی حیثیت سے مرکز کی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہوں۔

☆ تیسری دنیا بالخصوص پاکستان کے جو لوگ مغرب میں بس جاتے ہیں اُن کی شخصیت کئی حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ کہیں وہ مشرقی تہذیب کے دلدادہ نظر آتے ہیں تو کہیں مغرب کی Values اُن کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہیں۔ آپ کے ہاں صورت حال کیا ہے؟

☆☆ گلزار صاحب آپ کا سوال دلچسپ اور قدرے مزاحیہ ہے۔ آپ کا یہ مطلب تو نہیں کہ جو پاکستانی امریکہ میں (یا مغرب میں) رہتے ہیں اُن کی شخصیت کئی حصوں میں بٹ کر پتھالوجک ہو جاتی ہے؟ یعنی وہ ذہنی بیماری Schizophrenia کا شکار ہو جاتے ہیں جس سے اُن کے فکر و عمل میں بے تعلقی پیدا ہو جاتی ہے۔ نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ جہاں بھی رہیں اعتدال اور بیلنس رکھنا پڑتا ہے۔ اس سے انسان نہ تو مکمل طور پر مغربی اقدار کے تند و تیز سیلاب میں بہہ جاتا ہے اور نہ ہی اپنے گرد حصار کھینچ کر باہر کی دنیا سے غافل ہو جاتا ہے۔ میں مشرقی اور جنوبی دونوں دنیاؤں کا شہری ہوں۔

☆ حال ہی میں آپ نے ایک کتاب مرتب کی ہے ''اردو کی شہوانی شاعری'' آپ کے خیال میں یہ کتاب کس تہذیب اور تمدن کی آئینہ دار ہے؟

☆☆ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے شہوانی شاعری کے برائے میں یہ سوال پوچھ ہی لیا۔ یہ موضوع عام شائستہ گفتگو کا حصہ نہیں ہوتا لیکن اشارتاً اور کنایتاً یہ موضوع کبھی نہ کبھی کسی حوالے سے ہماری زندگی کو چھو کرتا رہتا ہے۔ شہوانی شاعری اردو ادب کا حصہ ہے اور سینہ بہ سینہ چلتا آیا ہے۔ اس صنف میں مشہور اور معتبر اساتذہ نے طبع آزمائی کی ہے جن میں جوش ملیح آبادی، حفیظ ہوشیار پوری، شان الحق حقی اور دوسرے بے شمار شعرا شامل ہیں۔

میں گزشتہ پندرہ سالوں سے یہ مواد جمع کر رہا تھا۔ اس کام میں

میرے محترم دوست ضیاء محی الدین صاحب نے میری بہت مدد کی۔ شان الحق حقی کا دیوانچہ ڈھونڈ نکالا۔ شہوانی شاعری کسی نہ کسی حوالے سے ہماری اردو تہذیب وتمدن کی آئینہ دار ہے۔ اس میدان میں پہلا قدم تو رکھا جا چکا ہے۔ امید ہے کہ اس کام کو باقی لوگ آگے بڑھائیں گے۔ ایک وقت میں انگریزی ادب میں بھی ایسا کلام ظاہراً ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا لیکن اس صنف میں انگریزی ادب کے مشہور ومعروف شعراء ایذرا پاؤنڈ، نوبل انعام یافتہ ٹی ایس ایلیٹ وغیرہ نے بھی لکھا۔ زمانے کی قدریں بدلنے کے ساتھ ساتھ اب یہ شاعری انگریزی ادب کا حصہ بن چکی ہے۔

☆ یہ جو ہم گھر بیٹھے فخر کیا کرتے ہیں کہ مغرب نے ہماری تعلیمات کو اپنا کر اس قدر ترقی کر لی ہے اور ہم اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ اس خیال میں کس قدر صداقت پائی جاتی ہے؟

☆☆ یہ خود فریبی کی اعلیٰ مثال ہے۔ پدرم سلطان بود والی بات ہے۔ ارے بھئی مجھے یہ نہ بتائیں کہ مسلمانوں اور عربوں نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے مجھے یہ بتائیں کہ آج اُن پر کیا افتاد پڑی ہے کہ وہ ابن خلدون، بوعلی سینا، محمد ذکریہ الاراضی اور اسحاق بن راھاوی جیسے عالم پیدا نہیں کر سکتے؟ یہ بات مسلّم ہے کہ اہل مغرب نے عرب سائنس اور ادبیات سے بہت کچھ مستعار لیا لیکن وہ ایک جگہ پر بیٹھے نہیں رہے۔ انہوں نے اُن بنیادوں پر سائنس اور حکمت کی عالی شان تعمیر کیں۔ رہا سوال ہمارا اندھیرے میں بھٹکنے کا تو اس میں کسی اور کا قصور نہیں ہمارا اپنا قصور ہے۔

مصر کے مشہور مفکر اور عالم محمد عبدو ایک عرصہ فرانس میں رہے تھے۔ جب وہ واپس مصر لوٹے تو انہوں نے کہا کہ فرانس میں میں نے اسلام دیکھا لیکن مسلمان نہیں دیکھے۔ مصر میں مسلمان بہت ہیں لیکن اسلام نظر نہیں آتا۔

☆ امریکی سوسائٹی کی بابت Totality میں کوئی آپ کی رائے جاننا چاہے تو آپ اس ذمہ داری سے کس طور عہدہ برآں ہوں گے؟

☆☆ امریکن لوگ انتہائی مخلص اور مخیّر لوگ ہیں۔ اکثریت ایماندار ہیں اور وعدے کے پکے ہیں۔

☆ امریکی حکومت اور عوام مسلمان بالخصوص پاکستانیوں کو ناپسند کیوں کرتے ہیں۔ ہر دو کمیونٹی کے درمیان یہ فاصلے مستقبل پر کس طرح اثر انداز ہوں گے؟

☆☆ امریکہ میں اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بہت ساری غلط فہمیاں موجود ہیں۔ ان غلط فہمیوں کو آگے بڑھانے میں دائیں بازو کے گروپ اور کچھ پوٹسٹنٹ پادری پیش پیش ہیں لیکن تاریخ میں ایسے ادوار آتے رہتے ہیں۔ امریکہ کی تاریخ میں تمام اقلیتیں اس پل صراط پر سے گذری ہیں۔ کیتھولک، یہودی، اطالوی، پولش وغیرہ سبھی نے کٹھن وقت گزارا ہے۔ اس لیے میں موجودہ مسلمان دشمنی کو وقتی اور عارضی Phenomenon سمجھتا ہوں۔

☆ خیبر پختونخوا کی چھتیس اہم شخصیات میں آپ کا شمار اعزاز کی بات ہے۔ اس کی بابت آپ کے احساسات اور مستقبل کی پلاننگ کے حوالے سے کچھ روشنی ڈالیے؟

☆☆ ۲۰۰۵ء میں پشاور یونیورسٹی کے پاکستان سٹڈیز سنٹر نے صوبہ پختونخواہ کی چھتیس اہم شخصیت کے بارے میں ایک کتاب شائع کی۔ مجھے معلوم نہیں میرا نام اس فہرست میں کس طرح شامل ہو گیا کیونکہ میں حاشا کلا اپنے آپ کو اس بات کا مستحق نہیں سمجھتا کہ صوبے کی قد آور شخصیتوں میں میرا نام بھی شامل ہو۔ اب گلزار صاحب ذرا سوچیے۔ اس فہرست میں صاحبزادہ عبدالقیوم، خان عبدالقیوم خان، عبدالغفار خان اور کئی دوسرے سیاسی اور سماجی لیڈر شامل ہوں تو میرا اس فہرست میں کیا کام۔ پھر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس فہرست میں کئی ایک ایسے نام نہیں تھے جو ضرور ہونے چاہیے تھے۔

میں نے سنٹر کی انتظامیہ کو ایک احتجاجی خط لکھا کہ انہوں نے فہرست ترتیب دینے میں غلطی کی ہے اُن کا جواب آیا کہ آئندہ کتابوں میں ہم باقی نام شامل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آٹھ سال ہو گئے اور میری اطلاع کے مطابق اُنہوں نے دوسری کتاب نہیں چھاپی۔

☆ کیا یہ درست ہے کہ آپ کو پشاور یونیورسٹی اور باقی چند یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر شپ کی آفر دی گئی تھی۔ وہ کیا وجوہات تھیں جن کی وجہ سے آپ نے وہ آفر قبول نہیں کیں؟

☆☆ یہ درست ہے کہ تین سال پہلے پختونخواہ صوبے کی انتظامیہ نے مجھے پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر شپ کی آفر دی تھی۔ پاکستان کے وزٹ کے دوران اُس وقت کے گورنر اویس غنی صاحب نے بھی ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں فوراً چارج لے لوں۔ میں نے چھ ماہ کی مہلت مانگی کیونکہ امریکہ میں میری مصروفیات کچھ ایسی نوعیت کی ہیں کہ اُن کو سمیٹنے میں وقت کی ضرورت تھی۔ ہر چند کہ میں آٹھ سال پہلے پریکٹس سے ریٹائرڈ ہو چکا ہوں لیکن اب بھی پڑھاتا ہوں اور میں نے یہ مناسب نہ جانا کہ درمیان میں ٹیچنگ چھوڑ دوں۔ اس کے علاوہ میں یونیورسٹی آف ٹولیڈو کے بورڈ آف ٹرسٹیز کا ممبر بھی ہوں۔ اس کے لیے بھی قانونی مشورہ ضروری تھا کہ آیا میں چند سالوں کے لیے بورڈ سے Leave of absence لے سکتا ہوں یا نہیں۔ چونکہ پشاور یونیورسٹی کو وائس چانسلر کی فوری ضرورت تھی۔ انہوں نے کسی اور کو وائس چانسلر لگا دیا۔

اس کے بعد اسلامیہ کالج یونیورسٹی اور خیبر میڈیکل یونیورسٹی کے بارے میں بھی مجھے کہا گیا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اگر حالات ٹھیک ہوتے اور مجھے یونیورسٹی چلانے کا مکمل اختیار دیتے تو شاید میں چلا جاتا۔ یہاں بدقسمتی سے پاکستان کی اکثر یونیورسٹیوں میں وائس چانسلر کے پاس کاغذی اختیار تو ہوتے ہیں۔ سیاست بازی کی وجہ سے وہ زیادہ وقت اپنی جاب سیکورٹی میں گزار دیتے ہیں۔

پشاور۔۔قدیم سیاحوں کی نظر میں

ڈاکٹر سید امجد حسین

پشاور دنیا کے چند زندہ قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے اگر تاریخ پر غور کیا جائے تو اس کے ساتھ بسنے والے شہر یا تو یوں ناپید ہیں کہ جیسے کبھی تھے ہی نہیں یا پھر کھنڈرات اور ویرانوں کی ضرورت اپنے آباد کرنے والوں کی موہوم سی یاد دلا رہے ہیں۔آسمانی کتابوں سے لے کر قدیم ترین تاریخوں اور پھر آج کی تاریخوں تک آبادیوں کے ویرانوں میں تبدیل ہونے کی وجوہات طوفان سیلاب زلزلے اور اسی قسم کی دوسری آسمانی وزمینی آفات بتائی جاتی ہیں پشاور کی ہزاروں سال کی عمر پر اگر غور کیا جائے تو یہ شہر بھی کئی مرتبہ اس آزمائش سے گزرا ہے۔اس کے علاوہ انسانی قہر وغضب کا بھی نشانہ بنتا رہا ہے کہ کئی مرتبہ جلا دیا گیا اجاڑ دیا گیا مگر اتنا سخت جان ہے کہ پھر بسا۔شاید اپنی جغرافیائی اہمیت اور وسطی ایشیا کے دروازے ہونے کی وجہ سے کوئی قوم بھی اسے ویران نہ دیکھ سکی اور جب پھر سے بسا تو پہلے سے زیادہ آب وتاب کے ساتھ اور اپنی شان کے ساتھ کہ دور دور تک اپنی زندگی کے جھنڈے گاڑھ دیئے ۔ ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے جنگلوں ویرانوں پہاڑوں دریاؤں اور سنگلاخ چٹانوں کو عبور کر کے لوگ اسے پھر سے دیکھنے آنے لگتے ان سے پہلے کے غیر ملکی جو یادداشتیں جمع کر گئے ہوتے انہیں ڈھونڈتے کسی کو زندہ ملتیں اور کوئی قدیم نشانیوں پر نوحہ کرتے اور نئے نشانات کا تذکرہ کر کے آگے بڑھ جاتے۔اگرچہ تاریخ کی ان کڑیوں میں بہت لمبے لمبے جمود بھی پائے جاتے ہیں مگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری کمزوری ہے کہ ہم اس کے دامن میں چھپے ہوئے خزانوں کو ابھی پوری طرح آشکار نہ کر سکے۔ یہ قدامت کی چند نشانیاں بھی تو غیروں نے بتائیں اور غیروں نے ہی ان میں سے کچھ کی کھوج لگائی اگر ہم پر ہوتا تو اتنا بھی نہ ہو پاتا۔

بے شمار قدیم وجدید تاریخوں سے یہ ثابت ہے کہ ویدوں کو تحریری لباس ۱۵۰۰ق م میں پہنایا گیا۔ظاہر ہے تحریر کے بعد ہی تاریخ کی نوبت آئی۔ ۱۵۰۰قبل مسیح میں ویدک ادب میں رگ ویدا تھر ویدوغیرہ گندھاروی یا گندھاری یا گندھارا جس کا مطلب پشاور اور اس کے آس پاس اٹک اور کابل لیا گیا ہے موجود ہے اور علماء تاریخ کا یہ فیصلہ بھی متفقہ ہے کہ گندھارا میں پشاور ہی مرکز رہا ہے۔محمد ولی اللہ خان اپنی کتاب گندھارا میں گاندھاری یا گندھاری قوم کے ویدوں میں تذکرے کو خاصی اہمیت دیتے ہیں اور خاص طور پر اتھر ویدا ور رگ وید کے زمانے کا تعین آٹھ سو سے لے کر ایک ہزار قبل مسیح کرتے ہیں۔رشید اختر ندوی اپنی کتاب ارض پاکستان کی تاریخ میں ۷۸عیسویں کے پشاور کے متعلق لکھتا ہے:

''کنشک نے پشاور کو پایہ تخت بنا کر وسطی ہندوستان کے شہر گورکھ پور تک حکومت کی وہ وادی گندھارا پنجاب کشمیر سندھ اور وسطی ہندوستان کا مالک تھا۔''

رشید اختر ندوی اسٹین کے حوالے سے چینی سیاح ھیون تسانگ کی مزید ایک روایت نقل کرتا ہے کہ:

''کنشک کی حدود سلطنت تنگ تنگ کے پہاڑوں تک وسیع تھی اور پشاور سے لے کر سطح مرتفع پامیر تک کا علاقہ اس کے ماتحت تھا اس نے کاشغر یارقند اور ختن پر چڑھائی کی۔ان دنوں ان پر چینی بادشاہ کی حکومت تھی۔''

ان تحریروں سے ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ماضی میں پشاور آس پاس کے سارے علاقے کا مرکز رہا ہے ایک طرف سندھ اور دوسری طرف چین کی سرحدوں تک پشاور ہی پشاور تھا تو پھر وہ کیسا پشاور ہوگا ویدک عہد سے یعنی ۱۵۰۰ق م سے بھی اتنا اہم کہ اس سرزمین کی مذہبی کتب میں ذکر موجود ہے یعنی ۳۵۰۰ سال سے تو اس کی قدامت ویدوں سے بھی ثابت ہے البتہ درد ستانی عہد کو اگر ہم ساتھ لے کر چلیں کیونکہ ۱۵۰۰ قبل مسیح بھی ہو تو بات ادھوری ہے کیونکہ ایسا مقام جو اپنے وقت کی مذہبی کتب میں ایک مقام رکھتا ہے دو چار دنوں میں نہیں بن سکتا اگر اس نظر سے دیکھیں تو پھر پشاور موہنجوداڑو اور ہڑپہ نہ ہو تو بھی ان کے ہم پلہ ضرور نظر آتا ہے۔مختار علی نیئر بھی اپنی کتابوں ''تاریخ زبان و ادب ہندکو'' اور ''عظیم گندھارا اور ہندکو زبان'' میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پشاور کی افادیت اور اہمیت کے حوالے سے چینی سیاحوں ہی کو اولیت دیتے ہیں۔

ہم اگر یہاں پر ان تمام قدیم سیاحوں کا ذکر کریں جو پچھلے ہزاروں سالوں میں یہاں آئے تو اس کے لیے علیحدہ ایک کتاب کی ضرورت ہے البتہ ان سیاحوں کو سلام کرتے ہیں جنہوں نے پشاور کی قدامت کو اپنی یادداشتوں کی پوتھی میں محفوظ کر لیا تھا اور کچھ اس طریقے سے کیا تھا کہ ان کے الفاظ کو سامنے رکھ کر صدیوں بعد کے انسان نے وہ قدیم مقام پشاور میں آخر ڈھونڈ ہی لئے۔ ماضی میں جب ہم جھانکتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ چین کے سیاح ہماری بھی مدد کر رہے ہیں اور یہ جو آج ہم پشاور کی قدامت پر فخر کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک قدیم شہر کا باشندہ سمجھتے ہیں یہ سب خاص طور پر چینی سیاحوں کی مرہون منت ہے۔

اولف کیرو اپنی کتاب ''پٹھان'' میں چینی سیاح ''فاھیان'' کی آمد ۳۹۹۔۴۱۴ عیسوی لکھتا ہے یہ وہ زمانہ ہے کہ پشاور میں بدھ مت زوال پذیر ہے اور اس کے برعکس چین میں یہ مذہب مکمل طور پر رائج ہو چکا ہے ظاہر ہے وہ سب سے پہلے چین سے نکل کر صحرائے گوبی سے ہوتا ہوا ختن اور کابل

پہنچا پھر درہ کرم کے راستے وہ گندھارا میں وارد ہوا۔ فاھیان اگرچہ اپنے ساتھ یہاں سے بہت سے نادر و نایاب نوادرات لے گیا مگر ہمیں اس دور کے پشاور کے بارے میں بھی بہت کچھ بتا گیا۔ وہ یہاں کے حاکموں کی تعریف کرتے ہوئے انہیں رحم دل اور انصاف پسند قرار دیتا ہے۔ بدھ مت کی خانقاہوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتا ہے اس دور میں پشاور کے شفا خانے اور مفت علاج کی بات کرتا ہے یہاں تک کہ جانوروں کے ہسپتالوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ ۵۲۰ء میں دوسرا چینی سیاح جو قابل ذکر ہے اس کا نام سوانگ ین ہے اس وقت بدھ مت کے قدم ایک پشاور ہی کیا پورے صوبہ سرحد سے اکھڑ چکے ہیں گندھارا پر قبائل کا تسلط ہے ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ بدھ دھرم چھوڑو اور ہندو دھرم اختیار کرو کے جبری احکامات کا ذکر آتا ہے۔ یہ چینی سیاح اپنے سفرنامے میں پشاور کا بڑی تفصیل سے ذکر کرتا ہے اور کنشک کے دور میں بنے ہوئے اس نابغہ روزگار اسٹوپے کا بھی جسے عجائبات عالم میں شمار کیا جاتا تھا سوانگ ین کی موجودگی میں گندھارا پر راجہ کابل کی چڑھائی ہوئی تھی جس کا بڑے دکھ سے اظہار کرتا ہے۔ وہ اس دور کے پشاور اس کا فن تعمیر اس کی بناوٹ اور فن مجسمہ سازی کو بڑا سراہتا ہے۔ سوانگ ین نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے والے پشاور کو اپنی تحریر میں جس انداز سے سنبھال کر رکھا ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

۵۲۰ء ہی میں تیسرا چینی سیاح ''ٹاویانگ'' بھی پشاور کی یاترا کرتا ہے وہ پشاور میں ہندوستان کے سب سے اونچے اسٹوپے کا ذکر کرتے ہوئے کہتا کہ یہ ۷۰۰ فٹ اونچا ہے اور جب یہ پہلی مرتبہ مکمل ہوا تھا تو اس کی چوٹی (کلس) کو سچے موتیوں سے مزین کیا گیا تھا وہ اس دور میں پشاور میں فن تصویر نگاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اسٹوپہ کے جنوب کی طرف سنگی سیڑھیوں کے ساتھ ایک تصویر جو تقریباً سولہ فٹ اونچی تھی اور اس کی خوبی یہ تھی کہ اس کے بدن کے اوپر والے حصے میں دو بدن دکھائے گئے تھے اس تصویر کے بنانے میں ہر ایک نے ایک ایک سکہ سونے کا بطور اجرت لیا تھا۔

مختار علی نیئر کے مطابق قدیم عہد میں گندھارا کی اصل شکل وصورت دریافت کرنے والوں میں ہیونگ تسانگ بڑا معتبر اور مستند مانا جاتا ہے کیونکہ ہیون سانگ صرف سیاح ہی نہ تھا بلکہ اپنے عہد کا بہت بڑا عالم بھی تھا۔ بچپن ہی سے بدھ مت کی طرف راغب تھا۔ مزید گہرائی حاصل کرنے کی خاطر جوگی کا روپ دھارا یعنی بھکشو بن گیا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیون تسانگ نے اپنا سفرنامہ ڈائری کی صورت میں لکھا جو کہ باقاعدہ تاریخ وار ہونے کی وجہ سے تفصیل میں تھا اور اسی وجہ سے اس کی تحریر کو مستند اور قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ بدھ مت کی بے شمار کتابیں جو اسے یہاں ملیں اور جو یقینی طور پر اس زمانے کی ہند کو یعنی پالی زبان میں تھیں اپنے چینی بدھوں کے لیے چینی زبان میں ترجمہ کیا۔ ہیون تسانگ وہ واحد سیاح ہے جو کم وبیش انیس سال تک گندھارا کی کھوج میں لگا رہا۔ محمد ولی اللہ خان اپنی کتاب گندھارا میں ہیون تسانگ کی پشاور میں آمد اور اس کی سیاحت کے بارے میں یوں رقم طراز ہے:

''ہیون تسانگ گندھارا کی وسعت ہزارلی شرقاً غرباً اور آٹھ سو لی شمالاً جنوباً لکھتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب ہیون تسانگ آیا تو گندھارا میں دریائے سندھ سے مشرق کا ملک شامل نہ تھا اور اس کے پایہ تخت کو پولوشاپولو (پشاور) لکھتا ہے پایہ تخت کا دور یا محیط چالیس لی بتاتا ہے وہ لکھتا ہے شاہی خاندان معدوم ہو چکا ہے اور کپیا سے مقرر کئے ہوئے حاکم ملک کی حکومت کو چلاتے ہیں۔ گاؤں اور شہر ویران ہیں شاہی رہائش گاہ یعنی شہر کے قلعہ بند حصے میں ایک ہزار خاندان بستے ہیں ملک میں اجناس بہت پیدا کی جاتی ہے۔ پھول پھل بہت ہیں اور گنا بہت ہوتا ہے۔ آب وہوا نیم گرم اور مرطوب ہے۔ برف نہیں پڑتی لوگ نرم دل اور خوش اخلاق ہیں۔''

ملاحظہ فرمایا آپ نے قدیم پشاور اگرچہ ہیون تسانگ کا دور ۶۲۹-۳۰ء کا دور ہے۔ ملک کی حالت آپ پڑھ آئے ہیں مگر شہریوں نے اپنی مجلسی زندگی اور ثقافتی آداب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہیون تسانگ اس شہر میں پیپل کے ایک عظیم درخت کا بھی ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''شہر سے باہر ۸ یا ۹ لی جنوب مشرق کی طرف ایک پیپل کا درخت ہے جو تقریباً سو فٹ اونچا ہے جس کا سایہ گہرا اور اس کی شاخیں بہت مضبوط ہیں۔ اس درخت کے نیچے پچھلے چار بدھ بیٹھ چکے ہیں اور اس وقت بدھ کی چار نشستیں بت ان کی یاد کے طور پر رکھے ہوئے ہیں یہ بت سترہ فٹ اونچے ہیں۔''

چینی سیاح ٹاویانگ نے بھی اس درخت کا ذکر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ:

''اس قسم کے انجیر کے خاندان کا درخت جس کے نیچے مہاتما بدھ کو نروان حاصل ہوا تھا''۔

لطف کی بات ہے کہ تقریباً نو سو سال کے بعد مغل شہنشاہ بابر جب پشاور آیا تو وہ بھی پشاور میں ایک بہت بڑے درخت کا ذکر کرتا ہے اس طرح ۶۳۰ عیسوی میں ہیون تسانگ نے پشاور میں وہ عظیم عبادت گاہ بھی دیکھی جو راجہ کنشک کے عہد میں مہاتما گوتم بدھ کی ہڈیوں کی راکھ کی زیارت کے لیے بنائی گئی تھی۔ ہیون تسانگ نے اپنے سفرنامے میں اس عظیم عمارت کو ۵۵۰ فٹ اونچی لکھا ہے اس کے علاوہ اس کے گنبد پر تانبے کے پچیس تھالوں کا کلس بنا ہوا تھا ہیون تسانگ نے اپنے سفرنامے میں اس عبادت گاہ کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ اس عبادت گاہ میں دھات کی بنی ہوئی اس ڈبیہ کے ڈھکن کے اوپر مہاتما بدھ کی مورتی ہے جس کے دائیں بائیں دو بھکشو کھڑے ہیں۔ اس ڈبی پر وہ راجہ کنشک کے نام کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔ اس ڈبیہ کے اندر بلور کی ایک خوبصورت ہشت پہلو ڈبیہ یا بوتل ہے اس پر راجہ کنشک کی مہر لگی ہوئی ہے بلور کی اس ڈبیہ میں مہاتما گوتم بدھ کی ہڈیوں کے چھوٹے چھوٹے تین ٹکڑے تھے جن کی

باقی صفحہ ۴۵ پر ملاحظہ کیجیے

''The Voice of My Spirit''

ستیہ پال آنند
(یو۔ایس۔اے)

ان گنت خوبیوں کے مالک، لاتعداد گُنوں کی گٹھلی، بے مثال انسان اور بندہ پرور دوست، ڈاکٹر سید امجد حسین شاعر نہیں ہیں، افسانہ نگار نہیں ہیں، انشائیے نہیں لکھتے، لیکن جو کچھ بھی وہ لکھتے ہیں ان میں ان تینوں اصناف سخن کی خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔ پیشے سے سرجن ہیں، (بلکہ سرجنوں کے استاد ہیں!)، لیکن جراحی میں جیسے آنکھ کی باریک بینی، ہاتھ کی صفائی اور جراحی کے کاٹنے والے اوزاروں کی درستگی اور تشخیصیت کی ضرورت پڑتی ہے، ویسے ہی اپنی نگارشات میں بے کم وکاست، کم سے کم الفاظ کے استعمال کے ساتھ اپنی بات کہنے کے ہنر کے ماہر ہیں۔ تاریخ نویسی ہو، وقائع نگاری ہو، شخصی خاکہ ہو، سفر کی روداد ہو خودنوشت سوانح ہو، یا یاداشتوں کا مجموعہ، جسے انگریزی میں Memoirs کہا جاتا ہے، ہو، ان کے پاس کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی بھرنے کی استبداد ہے۔ میں نے ان کی سب کتابیں الف سے یے تک پڑھی ہیں، ماسوا انگریزی کی کتاب جو ان کی مرحوم اہلیہ کے نام ان کے مرقومہ خطوط (جو اس کی رحلت کے بعد تحریر کیے گئے) کا گلدستہ ہے، باقی کی سب کتابوں میں یہ خوبی موجود ہے۔ میں ان کی ذاتی خوبیاں تو بعد میں شمار کرنے کی کوشش کروں گا، پہلے اگر ایک طائرانہ نظر ان کی آدھ درجن کے قریب کتابوں پر ڈال لی جائے تو کیا ہرج ہے؟ مجھ جیسے طائر کے لیے تو اس کبوتروں کی چھتری پر بہت دانا دنکا ہے۔ ان کی قلم کی قدرت کی خوبیوں کو ایک ایک کر کے دیکھا جائے تو مجھے ایک کتاب بعنوان ''عالم میں انتخاب ''پشاور'' نظر آتی ہے، جس میں تاریخ نویسی، وقائع نگاری اور مرتب کی جملہ خصوصیات یعنی ہر ایک مرقع نگار کا لیکھا جوکھا ۔سب بدرجۂ اتم نظر آتا ہے۔اس لیے بسم اللہ اسی کتاب سے کی جائے۔

پشاور؟ یعنی ''عالم میں انتخاب''۔پشاور کب بسا؟ کس نے بسایا؟ اس کا اتہ پتہ تو تاریخی ظواہر سے یا کتابوں سے ہی مل سکتا ہے۔آغا جی نے اپنی مرتب کردہ کتاب ضخامت آٹھ سو صفحات) ''پشاور'' (1999) میں تیار کی اور حالانکہ اس ضخیم کتاب (آٹھ سو سولہ صفحات) میں مضمون نگاروں میں مرحوم جوہر میر، مختار علی نیئر، تاج سعید، مجاہد اکبر، رضا ہمدانی، ظہور اعوان، عبدالحمید اعظمی، ارشاد صدیقی اور زاہد علی عسکر جیسے جید نام بھی ہیں، صرف ایک نظر فہرست مضامین پر ڈالنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ آغا جی کے خودنوشت مضامین کی تعداد (۱۷) سترہ ہے اور یہ کتاب کے لگ بھگ تین سو صفحات کو نرغے میں لیے ہوئے ہیں۔ان میں اگر ان کے ابتدائیہ اور تعارف کو بھی شامل کر لیا جائے تو (۲۳) صفحات اور بڑھ جاتے ہیں۔گویا آغا جی کے اندر کا ''مصنف'' ان کے باہر کے ''مرتب'' پر حاوی ہو گیا ہے۔۔

مجھے پشاور کی تاریخ کو مسخ کرنے کے بارے میں پاکستان کی عسکری حکومتوں کے 'اوقاتِ ضرر رساں' کے دورانئے میں آغا جی کا تبصرہ پڑھ کر افسوس ہوا، اور پھر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے دہلی کی پرانی تاریخ کے بارے میں مہیشور دیال کی کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب پرانی دلی کی جگمگاتی ہوئی تصویر ہے۔ایسی ہی ایک تصویر عبدالعلیم شرر نے لکھنؤ کی بھی اپنے الفاظ سے سجائی تھی، پچھلے دنوں اس کے انگریزی ترجمے کا ایک نسخہ لنڈن میں مقیم اس کے انگریزی مترجم اور اپنے بزرگوار ڈاکٹر سید فاخر حسین صاحب سے میں لے کر آیا تو مجھے آغا جی کے ان الفاظ کی صداقت کا احساس ہوا کہ''....میں نے تہیہ کر لیا کہ پشاور شہر کی بھی ایک ایسے تصویر بنائی جائے جس میں اس ''یک شہر آرزو'' کے خدوخال، اس کے باسی اور ان باسیوں کے اقدار حیات اور طرز معاشرت تیز اور چوکھے رنگوں میں پوری آب اور اتنی ہی تاب کے ساتھ نمودار ہوں۔

اس کتاب میں مشتمل پشاور کی لفظی تصویروں میں کچھ رنگ آغا جی نے چوکھے بھر دئے ہیں۔''پشاور، قدیم سیاحوں کی نظر میں'' تو ایک تحقیقی کام ہے اور میری اس رائے پر مہر تصدیق اس امر سے ہے کہ آغا جی جس قسم کا چاہے چوغا پہن کر سٹیج پر آ سکتے ہیں۔اس مضمون میں وہ ایک محقق ہیں۔دو قصے، ایک ٹکیوں والی نیاز کا اور دوسرا ایک جنازے کی جیتی جاگتی تصویر ان کی وقائع نگاری کو ficto-graphy کی تکنیک میں بیان کرنے کی قدرت کا ثبوت ہیں۔شہر کے آثار کے تناظر میں قدیم وجدید میں منافقت، تفاوت اور یکرنگی آغا جی کے تین مضامین سے ابھرتی ہے، جن میں 'قدیم سواریاں' سرفہرست ہے اور ہونا بھی چاہیے، کیونکہ یہ مضمون وہ باصری منظرنامے پیش کرتا ہے، جنہیں میں نے بچپن میں دیکھا ہوا ہے۔تعلیمی اداروں کے ماضی اور حال کے بارے میں مجھے خود کچھ علم نہیں تھا، لیکن پڑھ کر اچھا لگا۔خدا کرے، ان اداروں کا مستقبل بھی اچھا ہو۔ اندرون شہر کے ذرائع ابلاغ کا علم بھی پہلی بار مجھ کو ہوا، لیکن اس سلسلے کا جاندار مضمون 'پشاور میں ٹیلی ویژن کی آمد' ہے، جو جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتا ہے۔ میرے وقت میں تو ریڈیو بھی خال خال گھروں میں تھا! خدا جانے، آغا جی نے ایک ہی باب میں سیاسی ثقافتی اور ادبی اکھاڑوں کو کیوں اکٹھا کر دیا، لیکن ان کی ٹیڑھی منطق کے سامنے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ مرغ بازی، بٹیر بازی اور کتے بازی کے مقابلے، (شرطیں بدکر) میرے بھی دیکھے ہوئے ہیں۔ایک اور قسم کی بازی اکیلے میں کھیلی جاتی ہے، اس لیے اس کا ذکر عنقا ہے۔کشتی اکھاڑہ، پہلوانی، گتکا

بازی بھی میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ اس باب میں ایک سنجیدہ مضمون بھی ہے، جس نے مجھے بہت متاثر کیا، یہ اردو اور ہندکو کی ادبی فضا کے بارے میں ہے۔ اللہ کرے یہ تصویریں، جیتی جاگتی، چلتی پھرتی رہیں۔ ہم تو نہیں ہوں گے لیکن نوجوان ان روایات کو آگے بڑھائیں گے۔ ایک اور باب میں زندہ دلان پشاور کے زیرعنوان 'تختہ کلب' کا ذکر ہے، جسے پڑھ کر مزہ آ گیا۔ دو نظمیں جو آغا جی نے اس کتاب میں شامل کی ہیں، ناسٹلجیا کی بہترین مثالیں ہیں۔ مرحوم جوہر میر کی نظم اور پیارے دوست ارشاد صدیقی کی نظم، دونوں دل چھو گئیں۔

''درمکتب'' جہازی سائز میں مطبوعہ ایک ایسا مجموعہ ہے، جسے صحیح معانی میں یاداشتوں کا خزینہ A Treasury of Memoris کہا جا سکتا ہے۔ کوئی پیر مرد (مجھ سے چھ برس چھوٹے، آغا جی اس وقت چھہتر برس کے ہیں!) کیسے اپنے بچپن، شروع جوانی کی پہلی کچی بلوغت اور پھر مسیں پھوٹنے کے وقت کی روداد 'ناسٹلجیا' کی آمیزش سے اپنے مدرسوں، اسکولوں، کالجوں اور پیشہ ورانہ مہارت کے دارالعلوم کے بارے میں لکھ سکتا ہے، اس کی بہترین مثال یہ کتاب ہے۔ خدا جانے اپنے ذہن کے کن کن خانوں میں یہ یاداشتیں آغا جی نے بھر کر رکھی ہوئی تھیں کہ وقت آنے پر ان کے خوش خط قلم سے کاغذ پر بکھر گئیں۔ (برسبیل تذکرہ یہ عرض کر دوں کہ آغا جی میری طرح کمپیوٹر پر نہیں لکھتے۔ خطاطی میں ماہر ہیں، اور خوش خط حروف میں لکھتے ہیں، جنہیں پڑھ کر آنکھیں چمک اٹھتی ہی)۔ اس مجلّے میں میرے تین دوستوں کے پیش الفاظ ہیں۔ ارشاد تو ہمہ وقت ذہن کی نظروں کے سامنے رہتے ہیں اور اگر کہیں راستہ کھو بھی جائیں تو صرف ایک فون کال کی دوری پر ہیں، لیکن اعجاز راہی اور ظہور احمد اعوان خاک آسودہ ہو چکے ہیں، اور اس جہاں میں ہیں جہاں کسی فون کال کی رسائی نہیں۔

پہلا باب گورنمنٹ پرائمری سکول، مچھی ہٹہ کے بارے میں ہے، جس میں چار قابل احترام شخصیات کا ذکر ہے۔ ''عبدالعلی ہڈی توڑ'' مجھے اپنے پرائمری سکول ٹیچر رستم علی خان صاحب کی طرح ہی نظر آئے، جن کا مولا بخش ان کے سامنے میز پر پڑا رہتا تھا اور ہم بچے یہ سمجھتے تھے کہ یہ ڈنڈا ایک آنکھ کھلی رکھ کر سب شرارت کرنے والے لڑکوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔ لیکن وہ شخصیت جن کے نام یہ کتاب منسوب ہے، عبدالقدوس حافظ جی صاحب ہیں جنہوں نے آغا جی کی نرم ہتھیلیوں اور اس سے بھی زیادہ نازک جسم پر چھڑیوں کی ضربوں کو فراخدلی سے استعمال کرتے ہوئے انہیں قرآن کی سورتیں حفظ کروائیں اور طہارت کے اصولوں سے اس درجہ روشناس کروایا کہ اب بھی جب وہ قبلہ رو کھڑے ہوتے ہیں، تو درد سے کراہتے ہوئے بھی وہی ضرب کلیم اور وہی آموختہ وردِ زبان ہوتا ہے، جو اس قدر painfully سیکھا گیا تھا۔

گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ا پشاور کا احوال نامہ بھی شخصیات کے حوالوں سے مرکب ہے۔ اس میں چار اساتذہ کا ذکر خیر ہے، لیکن راقم الحروف کو خود تذکرہ نویسی کی شد بد ہے، اور یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے، کہ سب سے زیادہ محبت سے لکھا گیا خاکہ حافظ مجید کا ہے، جو سائنس کی دقیق سے دقیق تھیوریوں کو بھی اسلامیات کے تناظر میں قرآن کے فرمودات کی روشنی میں سمجھاتے تھے۔ جس لیبارٹری میں آغا جی اور ان کے ہم جماعتوں کو پریکٹیکل کروائے جاتے تھے، اس کا فی زمانہ حال سن کر میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے جب یہ پڑھا کہ اس میں اب ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں پڑی ہیں، دھول ہے اور مکڑیوں کے جالے لگے ہوئے ہیں، گویا پچاس برسوں میں سکولوں کے نظام میں ترقی کے بجائے تنزلی ہوئی ہے۔

اسلامیہ کالج پشاور اس کتاب کا تیسرا باب ہے۔ سب سے زیادہ خوبصورت فنچر اس باب کا وہ تصویر ہے، جس میں کالے کوٹوں اور سفید شلواروں میں ملبوس چار دوست کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ آغا جی کے علاوہ تین نوجوان، شیر احمد سیٹھی (مرحوم)، سراج احمد اور فضل امین ہیں۔ سب ایک جیسے طرحدار نوجوان ہیں، سب مردانہ حسن کے بہترین نمونے ہیں، لیکن آغا جی کی چھب اپنی ہی ہے۔ کاش میں ان دنوں ان کو ملا ہوتا!

اور یہاں سے وہ داستان شروع ہوتی ہے جو بعد ازاں اردو کے لیے ایک نیک فال ثابت ہوئی کہ ہمعصر پاکستانی اردو ادب میں آغا جی کے نام کا اضافہ ہو گیا۔ لکھتے ہیں:

''اردو ادب میں دلچسپی اور شغف تو ہائی سکول کے دنوں سے موجود تھا، پروفیسر طاہر فاروقی صاحب نے میرے شوق کو مزید جلا دی۔ فاروقی صاحب اردو پڑھاتے تھے اور میں نے بی ایس سی میں اردو اختیاری مضمون کے طور پر ان سے پڑھی... شگفتہ بیانی کی ایک مثال اس پشتو بولنے والے لڑکے کی اردو کی مہارت ہے جس نے چائے دانی کا پکڑنے والا دستہ ٹوٹا ہوا دیکھ کر اپنے مہمان سے معذرت کی تھی، ''اس چینک کا ہینڈل ٹوٹا ہوا ہے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل ہمارے پاس ایک اور چینک بھی ہے، لیکن اس کا خُنہ ٹوٹا ہوا ہے۔'' کمال معصومیت سے اس لالہ نے پشتو کے لفظ ''سخے'' کو اردو کے اس زیرناف لفظ میں ترجمہ کر دیا۔

میڈیکل کالج کی دنیا ہی الگ تھی، پھر اس کے بعد سینٹ چارلس اسپتال جہاں ایک سال کے لیے ٹریننگ لینا ضروری تھا، ایک اور مرحلہ تھا جو بخوبی طے ہوا۔ اپنے پروفیسروں اور ہم جماعت دوستوں کے بارے میں خوبصورتی سے لکھنے کے بعد جو طولانی قصہ شروع ہوتا ہے، اس کا نقطہ آغاز 1963ء ہے جب آغا جی امریکا میں پہنچے۔ مجھے یہ قصہ طولانی اس لیے بھی محسوس ہوا کہ اردو ادب کے ساتھ گاہے بگاہے 'زبانی کلامی' چھیڑ چھاڑ کے علاوہ اس میں وہ سب کچھ نہیں ہے، جس کا میں دیوانہ ہوں۔ البتہ نویں باب تک پہنچتے ہی یہ تشنگی بھی تشفی میں بدل گئی جب سات برسوں کی ہجرت کے بعد آغا جی پشاور لوٹے۔ لکھتے ہیں، ''میں سات سال وطن سے دور رہا تھا اور سوچتا تھا کہ پاکستان میں حالات بدل چکے ہوں گے۔ لوگوں کی سوچ بدل چکی ہوگی۔ دنیا تیزی سے

ترقی کر رہی ہے اور ترقی کی یہ ہوائیں پاکستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکی ہوں گی؛ خیبر میڈیکل کالج کے پرنسپل اور اپنے دیرینہ استاد خاکسار رضا علی سے جب ملاقات ہوئی تو احساس ہوا کہ سات سالوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اور پھر ان دوستوں کے، جو پاکستان میں خدمت کے جذبے کے تحت، بیرونی ملکوں سے اعلیٰ ڈگریاں لے کر لوٹے تھے، حالتِ زار دیکھ کر یہ شعر لکھتے ہیں:

کہاں کی منزلِ مقصود، راستہ بھی نہیں
سفر میں ساتھ خدا بھی ہے، رہزن بھی ہے

اس کتاب پر مجھے اور کچھ نہیں لکھنا ہے، صرف اسلوب کے حوالے سے میں کہوں گا، کہ یہ دونوں کتابیں ''خالص ادبی تخلیقات'' ہیں بھی اور نہیں بھی۔ ''خالص ادبی تخلیق'' کو نہ تو خیالات کے اظہار کا ذریعہ، معاشرتی صورتحال کا انعکاسی عمل، اور نہ ہی روزانہ کی زندگی یا شخصیات کی قلمی تصاویر کا آلہ کار کہا جا سکتا ہے، لیکن اگر اس کے توسط سے مادی حقیقت کا بالکل ایسے ہی جائزہ لیا جائے جیسے کسی مشین کی بابت معلومات شاعری میں بیان کی جائیں، تو یہ ادبی تخلیق کہلائی جا سکتی ہے۔

''چتراں والا کٹورہ'' پڑھتے ہوئے قاری کبھی ہنستا ہے، کبھی خیالات کی رو میں کسی ایسے کردار کو اپنی یاداشت کی قبر سے کھود کر نکالتا ہے، جو اس کتاب میں بیان کیے گئے کسی کردار سے ہو بہو مماثلت رکھتا ہے، کبھی یہی قاری ایک دو صفحے پیچھے پلٹ کر پھر دیکھنے لگتا ہے کہ کیا کوئی تفصیل ایک کردار کے بارے میں اس سے چھوٹ گئی جس کی بازگشت اس صفحے پر ہے، جو اس کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ "A readable book!" میں نے کوپن ہیگن میں عزیزہ صدف مرزا کی کتابوں کے شیلف میں اس کتاب کو دیکھ کر کہا تھا، اور اس نے کچھ زیادہ ہی زور سے سر ہلا کر اس کی تصدیق کی تھی۔ ''چتراں والا کٹورہ'' قابلِ مطالعہ تو ہے ہی، یہ قاری کے احساس کو بھی جھنجھوڑتی ہے کہ اس میں ''خالص بیانیہ'' کی تکنیک میں (جو مکالمہ، ہم سخنی یا گفت و شنید سے معرّا ہو) ناقابلِ فراموش کرداروں کو پیش کیا گیا ہے۔ چہ آنکہ یہ کردار اصلی ہیں، یعنی اصلی سے بھی کہیں زیادہ جیتے جاگتے وہ اشخاص ہیں، جنہیں آغا جی نے اپنے بچپن، لڑکپن، شروع جوانی کی کچی بلوغت میں قریب سے دیکھا، ان کے خال و خد کو اپنے ذہن کی بہی میں درج کیا اور پھر لکھتے وقت بجنسہ انہیں ذہن سے کھرچ کھرچ کر نکالا۔ (' کھرچ کھرچ کر نکالنا' سے یاد آیا کہ دردِ تہِ ناب اس شراب سے زیادہ نشہ آور ہوتی ہے جو بوتل کے بالائی حصے میں سے پہلے انڈیلی جاتی ہے۔)

میں نے لکھا ہے کہ یہ کتاب صرف بیانیہ پر ہی مشتمل ہے، لیکن میں نے یہ غلط لکھا ہے، کیونکہ اس میں جہاں کہیں صیغہ واحد میں کسی کردار کی زبان سے کچھ کہلوایا گیا ہے، وہ ''اصلی تے وڈی ہیر'' کی طرح اصل کی خوشبو رکھتا ہے۔ جان گل المعروف بہ جانی گلا'' کے منہ سے لاہور سے پشاور تک کے سفر کے بارے میں یہ الفاظ کہلوائے گئے ہیں۔

''آغہ جی! میں شام نوں پشوروں فلائینگ کوچ وچ بیٹھنا واں، تے، خدا سواڈا بھلا کرے، دوسرے دن سویلے سویلے ملاں بانگاں وخت لاہور پہنچ جانا واں۔ تے سامان اکٹھا کرنے دے بعد شام نوں وت فلینگ کوچ وچ بیٹھنا واں، تے فیر ساری رات سوں کے پشور پہنچ جانا واں۔''

اس کے بعد 'آغا جی' اور 'جانی گلا' کے مابین ہندکو میں بات چیت کا جو سلسلہ ہے، اس کا مزہ پشاور کے باسی ہی لوٹ سکتے ہیں، دوسرے نہیں۔ یہ نہیں کہ بات صرف پشاوری لہجے کی ہی نہیں ہے، اس کلچر کی ہے، تمدن اور تہذیب کی ہے، جو پشاور کا خاصہ تھا (شاید اب بھی ہے، لیکن حالات نے بہت کچھ بگاڑ کر رکھ دیا ہے)۔ جب قصہ خوان یعنی امجد حسین یہ پوچھتے ہیں کہ کیا لاہور جا کر اس نے بازارِ حسن کی بھی سیر کی، تو جان گلا کہتا ہے، ''توبہ، توبہ، کیوں میری مٹی خراب کردے او آغہ جی، منے ساری عمر رنڈی بازی نئیں کیتی، تا ھونڑ بڑھاپے وچ کے کرنی ایں!''

بیانیہ میں تصویر کشی کا ایک خاص مقام ہے۔ الفاظ کی مدد سے باصری نقشہ نویسی ایک ایسا ہنر ہے جو کسی کسی کو ہی آتا ہے۔ 'مجید دکاندار' جو آغا جی کی اصطلاح میں ایک dandy ہے یا لکھنؤ کی زبان میں ایک 'بانکا' ہے، ان الفاظ میں آغا جی نے مصور کیا ہے۔

''وہ گھر سے سج دھج کر نکلتا تھا، سفید بوسکی کی قمیض، سونے کے بٹن اور سٹد، لٹھے کی شلوار، پاؤں میں طلائی چپل، سیدھے بال اور پیشانی پر ایک آوارہ لٹ بوسے دیتی ہوئی، لڑکیاں اسے چلمنوں کے پیچھے سے دیکھتی تھیں اور شاید دل پکڑ کر رہ جاتی تھیں۔''

یہ تو ایک still، یعنی غیر متحرک، ساکن تصویر تھی، اب اس کو فلم کی طرح متحرک بنانے کا کمال بھی آغا جی کے قلم کا ہی طلسم ہے۔ مجید کی شادی ہونے سے کچھ دن پہلے کی منظر نگاری یوں کی گئی ہے۔

''گھر کی خواتین مہینہ بھر ''سدے'' پھرتی رہیں۔ خاندان بھی تو بڑا تھا۔ ہر روز چھ سات گھروں میں دعوت دینے جاتیں، شادی کے ہنگامے شروع ہوئے تو دس روز تک گلی محلے میں عید ہوگئی، مٹھائیوں کے خوانچے آ رہے ہیں، اور بانٹے جا رہے ہیں، خیرات الگ بٹ رہی ہے، ڈوم میراثی بھی آ رہے ہیں، دولہا میاں کے صدقے اتارے جا رہے ہیں، گھر میں ڈھولک کا شور الگ، باہر گانے والوں کا الگ، اندر ڈومنیاں اور باہر ہیجڑے داد وصول کر رہے ہیں....

اس اقتباس میں صیغہ ماضی سے پلٹ کر صیغہ حال میں آنے کی شروعات اس جملے سے ہوتی ہے۔ ''مٹھائیوں کے خوانچے آ رہے ہیں۔'' اب یہ ایک زندہ live show ہے۔ تحریر میں یہ چابکدستی پڑھنے لکھنے سے آتی ہے۔ اور آغا جی اس ساری کتاب میں، مختلف کرداروں کی عادات، خصائل، پوشاک، چلنے کا انداز، رکھ رکھاؤ، بات چیت کا ڈھنگ کچھ اس طریقے سے بیان کرتے ہیں کہ ''بے جان بیانیہ'' ایک ''زندہ شو'' میں تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے۔

کرداروں میں ''ماسی بُولی''، ''ماما چن''، فقیر دی ماں''، ''آغا صفدر شاہ، تعویزاں والا''، چاچا حکیموں'' وغیرہ چونکہ مصنف کے ہمسایوں کی فہرست میں آتے ہیں، اس لیے ان کو بچپن، لڑکپن، شروع جوانی کی عینک سے دیکھنے کی شہادت ہر نثر پارے میں ملتی ہے کیونکہ ان میں تجزیہ نگاری کا پیوند نہیں لگایا گیا، جبکہ قریبی دوستوں، ہم پیشہ احباب، اور یار غار ہم نفسوں کو تحلیل نفسی کے مختلف رنگوں کی عینک سے بھی دیکھا گیا ہے۔ مثلاً مرحوم جوہر میر کے بارے میں یہ جملے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''جوہر میر زود نویس نہیں۔ مقدار (کوانٹٹی) کے بجائے کوالٹی کو ترجیح دیتا ہے۔ اچھے ادب کا عاشق ہے۔'' ارشاد صدیقی کے بارے میں یہ جملے بھی قابل غور ہیں، ''ہمارا یار (ارشاد صدیقی) سمیٹنے اور بکھیر نے دونوں کا ماہر ہے۔ نثر لکھے گا تو ''پ'' سے ''پر'' بنائے گا، پھر پر سے ''پرندہ'' بنائے گا اور پرندے کے پروں پر پشاوری نقشی ہانڈی کی طرح نقش ونگار کرے گا اور پھر اس کم بخت پرندے کو اڑان بھی دے گا۔ سمیٹنے کو آئے تو چند لفظوں میں دفتر کہہ دے۔''

طوالت کا خوف مانع ہے کہ مجھے لگ بھگ آدھ درجن دیگر کتابوں کے بارے میں لکھنا ہے۔ اس لیے اس کتاب کا احوال نامہ یہیں بند کرتا ہوں، لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی اس پر ایک جامع مضمون لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالوں گا۔

اب آئیں، ایک اور کتاب کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں، جو ایک عجیب سی، خلط ملط، لیکن متوازن صنفِ نثر کہی جا سکتی ہے۔ یہ ہے۔ ''بھاکری منزل''، جو آغا جی اور ان کی ہمشیرہ ثریا بیگم سید منور شاہ نے مل کر لکھی ہے۔ آغا جی اس کا تذکرہ تو وقتاً فوقتاً کرتے ہی رہتے تھے، لیکن راقم الحروف کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ایک ایسی جامع کتاب معرضِ وجود میں آ سکے گی، جس کی بنیادی تحریک نگارش میں ان کا اپنا حصہ کم اور ثریا بیگم صاحبہ کا حصہ زیادہ ہو، خاص طور پر اس لیے کہ میں آغا جی کے قلم کی گل فشانیاں تو دیکھ چکا تھا، لیکن ثریا بیگم صاحبہ میرے لیے اجنبی تھیں۔ پہلے دیکھیں کہ یہ صنف نثر کی کون سی قبیل ہے۔ سرورق پر تحریر سے کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ''پشاور شہر کے محلہ مچھی ہٹہ کے سادات گھرانے کی داستان''... یعنی ایک مکانی اور جغرافیائی نقشہ بند بستی، ''مچھی ہٹہ'' اور ''بھاکری منزل''...اور دوسرا زمانی پہلو، جو جغرافیہ سے زیادہ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے، یعنی سادات گھرانے کی داستان...تاریخ اور جغرافیہ کے اس ملاپ میں نسل در نسل داستانیں موجود ہیں۔

میں نے خود بچپن اور لڑکپن میں اندرون شہر پشاور کے گلی کوچوں میں آوارگی کی ہے۔ کھلتے ہوئے صاف رنگ، کرتے، شلوار اور ربڑ کے جوتوں میں ملبوس میں ان پٹھان لڑکوں سے مختلف نہیں تھا جو میری عمر کے ہوتے ہوئے بھی میرے قد اور جسامت کی وجہ سے مجھ سے خوف کھاتے تھے یا اس لیے کہ اسکول میں ہاکی کی ٹیم کا کیپٹن ہونے کی وجہ سے میں عادتاً اپنے ہاتھ میں ہاکی لیے رکھتا تھا۔ ڈھکی کا علاقہ جہاں میرے ماموں رہتے تھے، مجھے اپنے ہاتھ کی پشت کی طرح ازبر تھا، لیکن اس کتاب کے اندرون سرورق پر دیے ہوئے کمپیوٹر کی وساطت سے بنائے ہوئے نقشے کی مدد سے بھی میں اپنے ذہن میں بھاکری منزل کو تلاش نہیں کر سکا۔ مچھی ہٹہ کہاں تھا یہ تو میری یاداشتوں کے خزانے میں محفوظ ہے، لیکن میں نہیں جان پایا کہ عورتوں کا مینا بازار کہاں تھا، شاید یہ پاکستان بننے کے بعد ہی اس کا نام تبدیل کر دیا گیا تھا۔ گھنٹہ گھر کے ارد گرد علاقوں کے بارے میں بھی مجھے کافی علم ہے، لیکن میں اپنی یاداشت پر اب ساٹھ سے زیادہ برسوں کے بعد اتنا زور نہیں دے سکتا۔ بہرحال آگے چلتا ہوں۔

چونکہ یہ کتاب دو قلموں کی نگارش کا مرقع ہے، اس لیے جن حصوں میں آغا جی کی ہمشیرہ ثریا بیگم نے الفاظ میں زر دوزی کی ہے، ان کا طرزِ بیان الگ ہے اور نسائی بافت کا بے حد قیمتی نمونہ ہے، البتہ جن مضامین کا سوتا آغا جی کے قلم سے پھوٹا ہے، ان میں دل کم اور دماغ زیادہ ہے۔ آغا جی کے ہاں نظم و انسجام کا ایک واضح منشور ہے، جس میں انضباط اور توزن ہے، بے ہنگم اوٹ پٹانگ، بے ترتیبی یا جذباتی غل غپاڑہ نہیں ہے۔ شاید ہر سرجن ایسا ہی ہوتا ہے، لیکن بات چیت میں بھی اور لکھاوٹ میں بھی جو قرینہ اور ترتیب ان کے ہاں ہے، بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ چونکہ اس مضمون کا تعلق آغا جی سے ہے، اس لیے میں صرف انہی مضامین پر غور کروں گا، جو ان کے تحریر کردہ ہیں۔ ثریا بیگم کے بارے میں پھر کبھی لکھنے کا وعدہ کرتا ہوں۔

''ہمارے خاندان کا پس منظر'' میں آغا جی بتاتے ہیں کہ ان کا خاندان سترھویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی میں عراق سے ہندوستان منتقل ہوا۔ ان کے سادات گھرانے کا تعلق حضرت فاطمہؓ سے ملتا ہے اور ہندوستان آنے کے بعد بہ سلسلہ ملازمت لاہور، کشمیر وغیرہ میں اقامت پذیر ہونے کے بعد ان کے دادا نے انیسویں صدی کے آخر میں یہ مکان خریدا، پھر اس کی توسیع کی گئی۔ یہی آبائی مکان اب بھاکری منزل کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

مکان کا نقشہ ہو بہو ہی ہوگا، لیکن ایک قاری کے لیے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد کے دو ابواب میں خاندان میں شادیوں، ولادتوں اور اموات کا ذکر بالتفصیل ملتا ہے۔ یہ حصہ خاندان سے متعلق لوگوں کے لیے ایک تاریخی احوال نامہ ہے اور حقائق نویسی کے جملہ لوازمات کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے، لیکن ۔ایک بار پھر ۔عام قاری کے لیے اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

''قصہ ٹکیوں والی نیاز کا'' اس کتاب سے لیا گیا ہے، جس کا ذکر اس مضمون کے شروع میں ہو چکا ہے، یعنی ''عالم میں انتخاب'' .... جیسے کہ میں پہلے تحریر کر چکا ہوں، اس مضمون میں واقعاتی، وارداتی یا حادثاتی، تینوں اقسام کی جزو نگاری سوت سے بافت کی گئی اس چارپائی کی طرح ہے، جس میں مختلف رنگوں کے سوت کے تاگے اس مہارت سے بُنے جاتے ہیں کہ چارپائی کے عین وسط میں ایک پھول یا ایک گلدستہ بن جاتا ہے۔ آغا جی نے اس 'چابکدستی' سے

بھی کام لیا ہے، جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ یعنی صیغہ ماضی میں واقعات کے بیانیے کو یک لخت صیغہ حال میں موڑ کر اسے حقیقت کے قریب تر کر لینا .. یہ انہی کا کام ہے اور اس باب میں بھی انہوں نے اس سے بخوبی کام لیا ہے۔ ماضی بعید کے ''تھا''، ''تھی''، ''تھے'' کے فعل ناقص سے یکدم پیٹھ موڑ کر ماضی قریب یا حال کے صیغوں کا استعمال بیانہ کو تیزی دیتا ہے۔ ملاحظہ کریں۔ ایک پیراگراف یہاں ختم ہوتا ہے:

'موہرے والے بڑے کمرے میں ایک بڑا دسترخوان تھا۔ اسی دسترخوان پر نیاز چنی جاتی تھی اور یہیں فاتحہ دیا جاتا تھا....''

اب اس سے اگلے پیراگرافوں کی شروعات یوں ہوتی ہے۔

''گھر والوں نے نماز فجر کے بعد جلدی جلدی ناشتے کے جھنجھٹ سے چھٹکارہ حاصل کیا....ایک کڑاہی میں میدے کی ٹکیاں تلی جانے لگیں اور دوسری کڑاہی میں حلوہ بننے لگا... جب ٹکیاں اور حلوہ تیار ہو گیا تو ٹکیوں کو مٹی کی صحنکوں میں سجا کر یہ صحنکیں دسترخوان پر رکھ دی گئیں...

گویا بیک جنبش قلم لکھنے والے نے ماضی بعید کے فعل ناقص (تھا، تھے، تھی) سے چھٹکارہ پا کر اس غیر متحرک تصویر کو زندہ شو میں بدل دیا۔

یہ نہیں کہ یہ نقوش ماضی صرف ناسٹلجیا کی پیداوار ہیں، آغا جی نے انہیں دور حاضر کی نظر سے بھی دیکھا ہے۔ مثلاً ''تلاش الہ دین کے چراغ کی'' سرخی والا باب ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے،

''ہر دو سال کے بعد پشاور کا رخ کرتا ہوں جو میری جنم بھومی ہے، میری یادوں کا گہوارہ ہے، وہاں رشتہ داروں، دوستوں سے ملاقاتیں باعث مسرت ہوتی ہیں، چند ایک ادبی تقاریب میں شمولیت کا بھی اتفاق ہو جاتا ہے....''

اور اس کے بعد پے در پے ناسٹلجیا کے حملوں کی داستان ہے، جن کے زیر اثر وقائع نگار مصنف اندرون شہر کی گلیوں میں بھٹکتا ہے، پرانے زمانے کا نوادر تلاش کرتا ہے،

اس گھر کو دیکھتا ہے، جس میں اس کی ولادت ہوئی تھی۔ شہر کے بارے میں جوہر میر کا یہ مصرع دہراتا ہے۔

وہ میرے ساتھ کھیلا تھا گلی میں: وہ مجھ سے پہلے بوڑھا ہو گیا ہے

ناسٹلجیا کی یہ دوڑ وہی ہے جسے شاعر نے اس مصرعے سے مشابہ کیا تھا، ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو'' ...چاہے یہ وہ نسواری پتلون ہو جو مصنف کے لڑکپن میں شلوار سے گریجویشن کے بعد اس کی پہلی پتلون تھی، یا سید پوری سٹریٹ کی دکانیں ہوں یا بازار کلاں کی مسجد ہو یا شیدو نانبائی کا تنور ہو، یا فقیر لوہار کی دکان ہو ....سبھی اس ناسٹلجیا کے اجزائے ترکیبی ہیں، سبھی میں کہیں نہ کہیں وہ دم توڑتی ہوئی یادیں ہیں جو مرتے مرتے بھی قریب المرگ یادوں کے سمندر میں غوطہ کھاتے ہوئے پکارتی جاتی ہیں، کوئی مجھے بچاؤ، کوئی مجھے بچاؤ۔

ایک بار پھر طوالت کا خوف مانع ہوتا ہے کہ ابھی آغا جی کی انگریزی میں تحریر کردہ بہت سی کتابیں موجود ہیں، جن پر مجھے لکھنا ہے۔ اس لیے اس کتاب کو نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھا کر پھر شیلف میں رکھتا ہوں اور آگے بڑھتا ہوں۔

میری طرح ہی آغا جی بھی I go whereever my freak takes me.(Oscar Wilde) اردو اور انگریزی میں بیک وقت لکھنے کی وجہ سے شاید کئی بار یہ طے نہیں کر پاتے کہ انہیں کون سی زبان میں طبع آزمائی کرنا ہے۔ میں نے کئی بار کسی نظم کے عنوان کو انگریزی (یا فرانسیسی یا لاطینی) میں وحی کی طرح قبول کیا لیکن لکھتے ہوئے نظم اردو میں لکھی گئی۔ میں نے عنوان وہی رہنے دیا لیکن اردو قارئین کے لیے عنوان کا ترجمہ یا اس کی دیومالائی اہمیت ایک فٹ نوٹ میں لکھ دی۔ اسی طرح ڈاکٹری کے شعبہ کے ایک میگزین میں جب آغا جی کا ایک مضمون بعنوان Shadows دکھائی پڑا تو میں چونک گیا۔ Toledo Medicine کے اس شمارے میں یہ مضمون با تصویر ہے اور اس کا موضوع پڑھ کر قاری فاتر العقل ہو جاتا ہے۔

I hear my inner voice
the voice of my spirit
Why don't you do the same?
continue talking in silence?

یہ سطور ایک نظم سے اخذ کی گئی ہیں جو اردو کے معروف شاعر مجیب الرحمٰن کی ہے۔ مجیب صاحب بھی آغا جی کی طرح (اور میری طرح) اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں، اور یہ سطریں انہوں نے اپنی بیوی کے انتقال کے بعد اسے (یا اس کی پاک روح کو) مخاطب کر کے لکھی ہیں۔ آغا جی کا مضمون، اس حوالے کے بعد، شہرہ آفاق فزسسٹ اور نوبیل انعام یافتہ ہندوستانی نژاد چندر شیکھر کا حوالہ دے کر مضمون کو آگے بڑھاتا ہے۔ چندرا (پیار اور عزت سے سبھی اس عظیم شخص کو ''چندرا'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے) نے دنیا کی سب سے بڑی اس ٹیلیسکوپ یعنی خلائی دوربین بنائی تھی، (جس کا نام اسی کے نام پر رکھا گیا تھا) ۔جب چندرا نے ایک آرٹسٹ Piero Borello کی بنائی ہوئی ایک تصویر کو دیکھا تو آرٹسٹ سے اس کی ایک نقل لینے کی خواہش ظاہر کی۔ اس تصویر میں ایک آدمی کو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دکھایا گیا تھا اور اس کا سایہ دیوار پر پڑ رہا تھا۔ یہ تصویر نیو یارک ٹائمز میگزین کے سرورق پر 1962 میں چھپی تھی۔ جب آرٹسٹ نے پوچھا کہ اس کی ان کو کیا ضرورت ہے تو چندرا کہنے لگے کہ یہ تصویر انہیں اس بات کی یاد دلاتی ہے کہ ہم اپنی عظیم کارگذاری اور اپنی اندرونی خواہشات کے مابین تعلق کو بالکل اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے اس تصویر میں کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس شخص اور دیوار پر وہی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے سائے کے مابین تعلق کو دکھایا گیا ہے۔

آغا جی نے اس مختصر مضمون کے ساتھ تین تصویریں پیش کیں جن

میں سے ایک دوبئی کے اُس فوّارے کی ہے جس میں پانی اور سائے کے مابین تعلق کو اسی حوالے سے پیش کیا گیا ہے اور باقی کی دو تصویریں ٹولیڈو کے دو قدرتی مناظر کی ہیں جن میں درختوں اور ان کے سایوں کے مابین اور ایک بڑے پل کی ریلنگ اور اسے کے سائے کے مابین اسی تعلق کو مصور کیا گیا ہے۔ اس مضمون کی یہ سطور میرے دل کو چھو گئیں۔

We cannot imagine a world without shadows. It will be akin to a world without color or sound. Shadows tell us something more profound and significant than just the cast off image of an object in the path of light.

منیب الرحمٰن صاحب کی نظم کے حوالے سے میں آغا جی کی اس کتاب پر تبصرہ، جسے میں ان کا Magnum Opus شمار کرتا ہوں، کچھ دیر کے لیے اٹھا رکھتا ہوں، جو انگریزی میں With Whom Shall I talk in the Dead of Night کے نام سے گذشتہ برس ہی شائع ہوئی ہے، اس لیے کہ پہلے میں ان کی دو اور انگریزی کتابوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

ان میں سے ایک کتاب مذہبی رواداری یا بردباری یا برداشت کے موضوع پر ہے۔ فی زمانہ اس طرح کی کتاب لکھنا اپنے آپ میں ہی ایک دشوار کن مرحلہ ہے کہ ہر جملے پر آپ کو یہ خدشہ رہتا ہے کہ کہاں مولویانِ دین آپ کو لادین کہہ کر ایک اس قسم کا فتویٰ صادر نہ کر دیں جس میں آپ کو واجب القتل قرار دے دیا جائے۔ اس کتاب میں آغا جی کے علاوہ دیگر اہم ناموں میں یہ مشاہیر بھی شامل ہیں۔

Bernie Keating, Rabbi Gordon, Father Michael Kelly, Rev. Joel P. Millar and Dr. Seigen Yamaoka.

آغا جی کے مضمون میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنے، اپنی ذات اور اپنے مذہب کے حوالے سے جو کچھ کہا ہے وہ ایمانداری کی ایک ایسی مثال ہے جسے بہت کم لوگ کہنے کی جرات کر سکتے ہیں۔ یہ اقتباس دیکھنا ضروری ہے۔

A number of Hindu families lived in our neighborhood at the end of a narrow alley. The bloodthirsty hoodlums blocked the narrow alley and set fire to their homes. It was surreal even for a nine-year old boy to smell the stench of burning human flesh air. As the *muezzin* called the prayers from the corner mosque, his chant rebberated the neighborhood in the backdrop of the billowing smoke and muffled screams of tghe trapped people. There was something terribly amiss. The noble human spirit had turned eveil, religious teachings were set aside in an orgy of wanton klling of innocent men, women and children *Even now when I am in Peshawar and hear the call for prayers from the corner mosque I smell the pungent odor seeping out of the deep recesses of my mind.*

(Italics mine).

یہ ایک ایسا شخص لکھ رہا ہے، جس کی روح میں بالیدگی کی رمق ابھی تک باقی ہے۔ ایک ایسا شخص جو فریضۂ حج سرانجام دیتے ہوئے بھی جب عمرہ میں شیطان کو سنگسار کیے جانے کی لایعنی رسم کو دیکھتا ہے، تو یہ دیکھ کر کہ جوشیلے لوگوں کے پتھر ستونوں سے ٹکرا کو لوگوں کو ہی زخمی کر رہے ہیں، اسے یہ خیال آتا ہے،

.....There are tens of thousands of people of people trying to throw pebbles at the pillars. In great many cases the pebbles do not reach the intended target but end up pelting the heads of the people in front ..... *It is the same in everyday life where in the process of practicing our religion , unintentionally we end up hurting those who happen to be in the way.*

(Italics mine).

طالبان، ان کے عروج، زوال اور ممکنہ عروجِ ثانی کے حوالے سے افغانستان اور پاکستان کی سیاسی حالت میں روز مرہ جس قسم کی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، اس کے مدنظر میں آغا جی کی کتاب The Taliban and Beyond (A Close Look at the Afghan Nightmare) پر زیادہ تبصرہ نہیں کرنا چاہتا، لیکن اتنا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر اس کتاب کو کتب خانوں میں مقید نہیں رہنا ہے تو ہر برس اس کے ایک نئے ایڈیشن کی ضرورت ہے۔

اور اب وہ کتاب جس کا انتظار میں نے اتنی دیر کیا ہے اور جناب منیب الرحمٰن کی نظم کا حوالہ آنے کے باوجود اپنے سمندِ شوق کو لگام تھام کر رکھا ہے۔ یہ کتاب ہے:

With Whom Shall I talk in the Dead of Night

سرورق میں اس عنوان کے آخری حرف کے بعد استفہامیہ نہیں ہے، جب کہ یہ ہونا ضروری تھا، کیونکہ راقم الحروف کی جس نظم سے یہ سطر مستعار لی گئی ہے، اس میں یہ interrogative sign یعنی سوالیہ نشان موجود ہے۔ نصف صدی کی ازدواجی زندگی یقیناً ایک لمبا عرصہ ہوتی ہے۔ آغا جی نے اور راقم الحروف نے لگ بھگ ایک ہی وقت میں اس رفاقت کو ختم ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہم دونوں کی رفیقانِ حیات ہمیں داغ مفارقت دے گئیں تو ہم جیسے نصف وجود ہو کر رہ گئے۔ میں اپنی شاعری میں اپنا تحفظ اور جائے امان ڈھونڈھتا پھرا اور پے در پے ایک درجن کی قریب آنسو بہاتی ہوئی نظمیں لکھیں۔ (اب بھی ہر برس اپنی اہلیہ کی برسی پر خود بخود ایک نظم وحی کی طرح نازل ہو جاتی ہے)۔ ان سے کچھ افاقہ ہوا کہ بقول ارسطو اس قسم catharsis ضروری تھی۔ آغا جی نے ایک اور Cathartic Outlet تلاش کیا۔ یہ اس قماش کے مکتوب تھے، جو لکھے ہی نہیں جاتے، یا اگر لکھے جاتے ہیں تو تکیے کے نیچے رکھ کر اس فرضِ محال کو یقین صادق سمجھ کر تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ یہ مکتوب الیہ تک پہنچ گئے۔ یہ سب خطوط اس انگریزی کتاب کا sum and substance ہیں۔ کتاب کے پشت سرورق پر یہ اندراج ہے۔

My dearest Dothe,

Now who would have ever thought of writing a letter to a dead person? No, I am not going crazy. I am just lonely. Even with a house full of people, I feel pangs of extreme loneliness bordering on despondency.... I am sitting in my favorite perch in the living room. I keep imagining you would step out of the study any minute as you have always done. When I do not hear your footsteps in the study, I get up and go to the bedroom, as I did a zillion times this past year, to make sure you are still in bed and that you are OK....It has been 14 days since our separation. I am going through the emotional roller coaster where at times I feel you have been gone a long time and then in an instant I refuse to accept that you are gone for good.

اس کتاب میں ایک سو پچپن صفحات پر وہ خطوط ہیں جو آغا جی نے لکھے اور ان پرزوں کو جن پر یہ قلمبند کیے گئے تھے، شاید (شاید!) تکیے کے نیچے اس طرف چھپا کر رکھ دیا جس طرف ان کی اہلیہ سوتی تھیں۔ نصف از دواجی بستر ان کی تحویل میں تھا، نصف تکیہ.....اور اس بستر پر پورے مردانہ بدن میں نصف روح۔ اس حالت میں کیا یہ ضروری نہیں تھا کہ ڈرامائی خود کلامی کے انداز میں آغا جی وہ باتیں کرتے جو یا تو اس نصف روح سے کی جا سکتی ہیں جو ان کے حصے میں آئی ہے، یا اس نصف روح کے ساتھ جو ہمیشہ کے لیے ان سے بچھڑ گئی ہے۔؟

اوپر لکھے ہوئے Epilogue میں چاہے ایک زخمی لہجہ ٹپکتے ہوئے لہو کی زبان میں بول رہا ہے، یہ خطوط روزانہ کی زندگی کی ہر خبر، ہر اطلاع، ہر واقعہ، ہر مسئلہ کی بات مکتوب الیہ تک اس طرح پہنچاتے ہیں، جیسے وہ پردیس گئی ہوئی ہو اور اسے لوٹ کر آنا ہو۔ ہر سرد و گرم، اونچ نیچ، روزمرہ کی زندگی کی صورتحال، اشیاء، کام کاج، ملنے جلنے والوں سے ملاقات کی تجدید، ان ملاقاتوں کی چہل پہل، مد و جزر، گہما گہمی، یا سوال و جواب یا کسی بحران کے اتفاقات.....کیا کچھ احوال نامہ نہیں ہے ان خطوط میں۔! میں صرف ایک خط کا اقتباس درج کروں گا، جس میں روزمرہ کے اس نستعلیق اور غیر شاعرانہ، غیر جذباتی احوال سے ہٹ کر ایک ایسے دن کا ذکر ہے، جس میں قلمکار کا ایک شاعر دوست سے ملنے کا ذکر ہے۔ یہ خط طویل ہے اور اپریل دو ہزار سات کا تحریر کردہ ہے۔ ملاحظہ ہو۔

A few weeks ago, I went to Ann Arbor to visit Dr. Munib Rahman. You remember him and his Swiss wife Zeba. They had visited us on many occasions. She was a linguist and they moved in Aligarh, India for seventeen years, where they taught at Aligarh Muslim University. She died two years ago and the man was devastated at losing fifty years of marriage. He has gone blind, but can manage living alone. Actually he insisted that I come for dinner, which he cooked himself. ... It was so wonderful and uplifting to visit this great man of letters and to listen to his poetry -- some romantic, some nostalgic and some full of lament. Here is original Urdu version of the English translation of a poem he recited for me that he wrote in memory of his wife. The book doesn'st have this Urdu version.

''چہارسُو''

یہ شبِ تیرہ وتار
اجنبی راستہ، منزل گمنام
ہاتھ تھامے ہوں کہ جانے سے تمہیں روک سکوں
آہ لیکن مری کوشش ناکام
دل مسلسل یہ کہے جاتا ہے
رات تاریک ہے مت جا، مت جا
جسم وجاں تیرے لیے ترسیں گے
دکھ کے بادل مری آنکھوں سے سدا برسیں گے
کون اٹھائے گا مری دل سے غموں کا انبار
میں بھی مجبور ہوں تو بھی مجبور
بے سماعت ہے محبت کی پکار
کتنی بے مہر ہے کتنی بے نور
یہ شبِ تیرہ وتار!

منیب الرحمٰن صاحب کی یہ معرکتہ الآرا نظم ان کے دل کی پکار ہے۔ ان جیسا جدید شاعر ذاتی غم کی تشہیر نہیں کرتا، لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے، جب تشہیر کی غرض سے نہیں، اپنے امڈتے ہوئے جذبات کو 'کتھارسس' کی ریلیف دینے کے لیے شاعر ایسی نگارشات نیم غنودگی کی سی حال میں لکھ لیتا ہے۔

ایک ضروری نوٹ اس کتاب کے بارے میں یہ ہے کہ اس کا ٹائیٹل راقم الحروف کی ایک نظم کے آخری مصرعے سے لیا گیا ہے۔ یہ نظم میری اہلیہ کے انتقال کے بعد لکھی گئی تھی۔ اس نظم کو بجنسہ آغا جی نے بطور تشکر اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 122 پر اپنی مرحومہ بیوی کے نام ایک خط میں ری پروڈیوس کیا ہے۔ نظم کا عنوان Snow Angel ہے۔ اس کا آخری بند اس طرح ہے۔

SNOW ANGEL

When the night has deepened
A blanket of silence
Holds me in its tight vice grip
Bundles me up in the bed like an embryo.
Folds and crases
Of the snow-white sheet
grasp me firmly in their iron grip
Bound I am to the bed
At least for the night.

A light imprint on my right
A slight indentation is all I have of you
A snow angel's imprint
Of the body you've taken with you.

Scared I am of losing it
I lie on the left side
Lest the mark of your body
The snow-angel's dimpled imprint is erased.
And I am left alone.
If that happens
With wom shall I talk in the dead of the night?

اس نظم کا اردو متن بھی دیے بغیر بات بنتی نظر نہیں آتی۔ میں طوالت کے خوف سے جان بچاتا ہوا بھی اس کا اصلی اردو متن پیش کر رہا ہوں۔ البتہ اس سے پہلے وہ فٹ نوٹ ضرور دینا چاہتا ہوں، جو اس نظم کے نیچے دیا گیا تھا۔ اس میں تحریر تھا۔ ''کینیڈا کے شمالی علاقوں میں جہاں برف کا گرنا لگ بھگ روزانہ کا معمول ہے، بچے صبح اسکول جاتے ہوئے تازہ گری ہوئی برف میں لیٹ کر اپنے پورے جسم کا نقشہ بنا دیتے ہیں۔ شام کو اسکول سے لوٹتے ہیں تو بھاگ کر اس جگہ دیکھتے ہیں، کہ کیا ان کے جسم کا نقشہ بجنسہ موجود ہے۔ دوسری صبح پھر دیکھتے ہیں، اور اگر ان کے جسم کی indentation اُسی طرح موجود ہو، تو ہنس کر تالیاں بجاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ پچھلی رات یہاں برف کا فرشتہ سویا تھا۔

نظم کا عنوان ''سنو اینجل'' ہے۔ یہ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

رات کو کمرے کا سنّاٹا جکڑ لیتا ہے اپنے آہنی ہاتھوں میں
اور پھر لا پٹختا ہے اس بستر پر
جس کی برف سی برّاق چادر کی ہر سلوٹ میں
تم لپٹی پڑی ہو!
داہنی جانب کا ہلکا جھول
جس سے اک مکمل جسم کا خاکہ ابھرتا ہے
سنو اینجل کا شاید
اس بدن کا
جو تم اپنے ساتھ لے کر جا چکی ہو
اور میں ڈرتا ہوں
بائیں ہاتھ سوتا ہوں
تمہارا نقش بستر سے
سنو اینجل کا خاکہ
مٹ گیا تو شب کے سنّاٹے میں کس سے بات ہوگی؟

☆

''محبت کی پکار''

منیب الرحمٰن
(یو۔ایس۔اے)

ستمبر۱۹۸۴ء میں امریکہ سے ہندوستان جاتے ہوئے میں کچھ دنوں لندن میں رکا۔ وہاں ایک شام اردو مرکز میں جس کے ڈائریکٹر افتخار عارف تھے مجھے اپنا کلام سنانے کا موقع ملا۔ اس جلسے کی روداد ایک اردو اخبار میں شائع ہوئی جو لندن سے نکلا کرتا تھا۔ امریکہ لوٹنے کے کچھ عرصے بعد مجھے ایک ٹیلی فون موصول ہوا جس میں بولنے والے نے سید امجد حسین کہہ کر اپنا تعارف کرایا۔ لندن کا مذکورہ اخبار ان کی نظر سے گزرا تھا۔ اس میں تو تفصیلات دی گئی تھیں ان کی مدد سے میرا پتہ لگا کر وہ مجھے ٹیلی فون کر رہے تھے۔ انہیں میرے نئے شعری مجموعے کو حاصل کرنے کا اشتیاق تھا جو اسی زمانے میں ''شہرِ گمنام'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس طرح امجد حسین سے غائبانہ طور پر میری راہ وسم کا آغاز ہوا۔ مزید معلومات سے پتہ چلا کہ وہ ایک معروف سرجن ہیں اور ٹولیڈو (Toledo) میں رہتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ انھیں ادب کا ذوق ہے اور ان کی چیزیں اردو اور انگریزی میں برابر چھپتی رہتی ہیں۔ یہ جان کر مجھے ان سے ملنے کی جستجو ہوئی۔ اتفاق سے بہت جلد اس کی صورت نکل آئی۔ چند کرم فرماؤں نے ٹولیڈو (Toledo) جانے کا منصوبہ بنایا اور مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ مقصد وہاں کی مسجد کو دیکھنا تھا جو فنِ تعمیر کے اعتبار سے شمالی امریکہ کی قابلِ ذکر مسجدوں میں شمار کی جاتی تھی۔ روانگی سے پہلے میں نے امجد حسین کو اطلاع دی اور ان سے ملنے کی خواہش کی۔ ہم دونوں مسجد کے اندر ملے۔ باتوں باتوں میں اندازہ ہوا کہ مسجد کے قیام میں شروع ہی سے ان کا اہم حصہ رہا ہے اور وہ اس کے بورڈ (Board) کے ممبر ہیں۔ اس پہلی ملاقات ہی میں ان کی ہمہ جہت شخصیت نے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا۔ ان کا حسنِ اخلاق، ان کی طبیعت کا خلوص، ان کی حسِ مزاح، ان کی وسعت نظر، ان کی ادب سے دلچسپی یہ سب خصوصیات میرے دل پر گہرا نقش چھوڑ گئیں۔

امجد حسین عرصۂ دراز سے ٹولیڈو (Toledo) میں اقامت پذیر ہیں۔ ان کا مکان شہر کے نواح میں ایک متمول اور خوبصورت علاقے میں واقع ہے۔ امجد حسین کی بلائی ہوئی ادبی محفلیں زیادہ تر یہیں قرار پاتی ہیں۔ ایک وسیع Swiming Pool کے کنارے ان کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ حاضرین کھلے لان میں کرسیوں پر بیٹھے ہیں، اونچے اونچے درخت سایہ کئے ہوئے ہیں۔ اس دلنواز ماحول میں ان ادبی محفلوں کا لطف اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

کسی قومی گروہ کی Cultural Identity کے لیے ادب اور زبان کا اہم کردار ہے۔ اس سلسلے میں امجد حسین گراں قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جب ۱۹۸۸ء میں میرا شعری مجموعہ ''بازدید'' شائع ہوا تو امجد حسین کی سرپرستی میں اس کی رونمائی عمل میں آئی۔ یہ تقریب ایک بڑے ہال میں ادا ہوئی جس میں حاضرین کی تعداد دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کثیر تعداد امجد حسین کے اثر ورسوخ اور ان کی ذاتی کوششوں کی رہینِ منت تھی۔

جہاں تک مجھے علم ہے اب تک امجد حسین کی چھ عدد اردو اور پانچ انگریزی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ان میں سے تین کتابیں ''یک شہر آزرو'' (۱۹۹۵ء) ''چتراں والا کٹورہ'' (۲۰۰۳ء) اور ''درِ کتب'' (۲۰۰۵) میری نظر سے گزری ہیں۔ ان کتابوں کا پس منظر پشاور ہے جو امجد حسین کا آبائی وطن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اس شہر کی محبت ان کے امریکی دورانِ قیام سے شدید تر ہو گئی ہے۔ ان کی زبان صاف اور شستہ ہونے کی بدولت نثر نگاری کی کامیاب مثال ہے۔

تعلیمی کاموں میں امجد حسین ایک نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کے قائم کردہ فاؤنڈیشن (Foundation) سے پشاور کے خیبر میڈیکل کالج میں پڑھنے والے مستحق طلبا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف دیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ امجد حسین کا معمول ہو گیا ہے کہ وہ ہر سال مہینہ بھر خیبر میڈیکل کالج میں پڑھانے کے لیے پشاور جاتے ہیں۔ ایک سال جب وہ اپنے دورے سے واپس آئے تو کچھ بددل سے معلوم ہوتے تھے۔ جب میں نے سبب پوچھا تو انھوں نے پشاور میں ہونے والے دہشت پسند حالات کی شکایت کی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ آئندہ جانے سے احتراز کریں گے لیکن ان کی مستقل مزاجی نے گوارا نہ کیا اور آج تک ان کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے امجد حسین اپنے ہم پیشہ ساتھیوں کے حلقے میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ ٹولیڈو (Toledo) یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں باقاعدگی سے پڑھا رہے ہیں۔ چند سال ہوئے ان کے نام سے مذکورہ کالج میں پروفیسری کی Chair کا اعلان کیا گیا۔ اس کی تقریب شاندار طور پر منائی گئی۔ اس میں شہر کے Mayer اور دوسری اہم ہستیوں نے شرکت کی اور امجد حسین کے کاموں کو سراہا گیا۔

گذشتہ برسوں میں نامساعد حالات کے سبب امجد حسین سے میرا رابطہ عارضی طور پر منقطع ہو گیا۔ سب سے پہلے Macular degeneration کی وجہ سے میری آنکھوں کی مرکزی بینائی جاتی رہی اور میرے لیے گوناگوں معذوریاں پیدا ہو گئیں۔ اس کے بعد میری اہلیہ کی بیماری نے مجھے مصروف رکھا جو ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ دوسری طرف امجد حسین بھی اپنی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ ان کی شریکِ حیات ایک عرصے تک کینسر کی مریض رہی اور آخر کار اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ایک رات میں کمرے میں اکیلا بیٹھا ریڈیو سن رہا تھا۔ دو تین دن پہلے

برفباری ہوئی تھی اور باہر غیر معمولی سردی تھی۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور امجد حسین کی آواز سنائی دی۔ وہ میرے علاقے میں آئے ہوئے تھے اور مجھ سے ملنے کے خواہشمند تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ہم نے ساتھ بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا اور اس کے بعد بہت دیر تک اپنے اپنے حالات کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ان دنوں ایک مجموعہ[1] ان نظموں کا مرتب کر رہا ہوں جو میں نے اپنی مرحوم بیوی کی یاد میں کہی ہیں۔ پھر میں نے اس مجموعے کی پہلی نظم ''یہ شبِ تیرہ تار''[2] پڑھ کر سنائی۔ جب میں ختم کر چکا تو میں نے دیکھا کہ امجد حسین کے چہرے پر غم کے آثار نمایاں ہیں۔ میں نے ان کے دل کے دبے ہوئے زخم کو چھیڑ دیا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولے:

''آج کل میں انگریزی کی ایک کتاب میں مشغول ہوں جو خطوط کی شکل میں ہے۔ یہ خطوط میں نے فرضی طور پر اپنی بیوی کو ان کے مرنے کے بعد لکھے ہیں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آج رات کی صحبت کا ذکر آپ کی نظم کے ترجمے کے ساتھ اپنی کتاب میں شامل کر لوں۔ ۲۰۱۲ء ان کی مذکورہ کتاب With whom I shall talk in the dead of night کے نام سے شائع ہوئی۔

امریکہ میں فاصلے اتنے لمبے ہیں کہ لوگوں کو ایک دوسرے سے ملنے ملانے میں کافی مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کی تلافی کچھ حد تک ٹیلی فون پر باتیں کر کے ہو جاتی ہے۔ امجد حسین کے ساتھ میرا بھی یہی حال ہے ہمیں ایک دوسرے سے ملنا صرف گاہے گاہے نصیب ہوتا ہے۔ لیکن وہ مجھے اکثر ٹیلی فون کرتے رہتے ہیں اور جب وہ گفتگو کرنے سے پہلے بہت تپاک کے ساتھ ''منیب صاحب'' کہتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ٹیلی فون پر گلے مل رہے ہوں۔

۱۔ یہ مجموعہ ''ہجر و فراق کی نظمیں'' کے نام سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔

۲۔ نظم کا متن یہ ہے۔

اجنبی راستہ، منزل گمنام
ہاتھ تھامے ہوں کہ جانے سے تجھے روک سکوں
آہ لیکن مری کوشش ناکام
دل مسلسل یہ کہے جاتا ہے
رات تاریک ہے، مت جا مت جا
جسم و جاں تیرے لیے ترسیں گے
دکھ کے آنسو مری آنکھوں سے سدا برسیں گے
کون اٹھائے گا غموں کا انبار
میں بھی مجبور ہوں، تو بھی مجبور
بے ساعت ہے محبت کی پکار
کتنی بے مہر ہے، کتنی بے نور
یہ شب تیرہ تار

- بقیہ -

آپا تاج

اور پھر ہمارے ساتھ چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی ''اوے امجد خان'' میں تمہارے صدقے جاؤں، تم نے کیا ابوطیلہ کے وقت کے قصے اپنے کتاب میں لکھ دیئے ہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ تم نے جان گل کا نام تو کتاب میں لکھ دیا لیکن مجھے بھول گئے۔ میں نے تو جان گل سے زیادہ تمہاری خدمت کی ہے''

آپا تاج نے میری والدہ اور پھوپھیوں سے قرآن پڑھا تھا۔ بچپن کا یہ رشتہ وہ بڑھاپے تک نبھاتی رہی۔ دادی بن گئی لیکن اپنی بیبیوں کو نہیں بھولی۔ کوئی موسم اس نباہ میں اس کا راستہ نہ روک سکا۔ گرمی، سردی، بارش، آندھی، طوفان، وہ سلام اور خبر گیری کے لیے ہمارے گھر آنے سے نہیں رکی۔ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، تب بھی وہ ٹامک ٹوئیاں مارتی چوک ناصر خان سے کوچہ قاضی خیلان پہنچ جاتی۔ دو گھڑی بیٹھتی بہو بیٹے کا دکھڑا روتی، پرانی روایات واقدار کی یادیں تازہ کرتی، قہوہ پیتی اور دعائیں دیتی چلی جاتی۔ اس کے آنے سے جاری وساری کاروبار دنیا رک جاتا تھا۔ ہم سب کی حرکت اور ارادے کے بغیر محلّہ گدائی خان (مسلم مینا بازار) والے آبائی مکان پہنچ جاتے تھے جہاں ''منگ'' کے اوپر بنے ہوئے چوبی تخت پر بیٹھ کر آپا تاج نے الحمد سے والناس تک پورا قرآن پڑھا تھا۔ یہ کتاب میں اسی آپا تاج کے نام معنون کرتا ہوں''

میں مارچ ۲۰۰۱ء میں پشاور گیا تو کسی نے اسے بتایا کہ میں پشاور آیا ہوا ہوں وہ حسب معمول ہمارے ہاں آ گئی۔ میں نے اسے ایک سال کے بعد دیکھا تھا۔ آنکھوں کی نظر بہت کم ہو گئی تھی۔ باتیں کرتی تو سانس اکھڑ جاتا۔ رک رک کر باتیں کرتیں۔ بار بار کہتی کہ سانس اور گھٹنوں نے بہت معذور کر دیا ہے۔ کہیں آنے جانے سے رہ گئی ہوں۔ چہرے کی رونق ماند اور بشاشت ختم ہو گئی تھی۔ اکھڑے سانسوں کے درمیان وقفے وقفے سے اس نے میری بیوی بچوں کا حال پوچھا، حال احوال کیا، ایک آدھ پیالی قہوہ کی لی اور پھر بلائیں لیتی، دعائیں دیتی آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر گئی۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔

''بابائے پشاور''

ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحبزادہ
(راولپنڈی)

مجھے جب ''چہارسُو'' کے مدیر جناب گلزار جاوید نے فون پر بتایا کہ وہ چہارسو کا ایک شمارہ امجد صاحب کے بارے میں شائع کر رہے ہیں۔ یہ سن کر میں بے حد خوش ہوا۔ مجھے ان کی بات بہت بھائی۔

انسانی معاشرے کا اصول یہ ہے کہ نیک انسان اور خاص شخصیت اگر انتقال کر جائے تو اکثر خراج تحسین ان کی موت کے بعد پیش کیا جاتا ہے کہ مرنے والے میں بہت خوبیاں تھیں۔ لوگ پھول بھیجتے ہیں اور جنازے میں شرکت کرتے ہیں اور اس فرد کی شخصیت کا اندازہ اس بات سے لگاتے ہیں کہ جنازے میں کتنے لوگ شریک ہوئے؟ کتنے پھول اور پھولوں کی چادریں بھیجی گئیں۔ خیرات کے لیے کتنے کھانے کی دیگیں پکیں لیکن بھلا ان باتوں سے مرنے والے کو کیا غرض؟ وہ تو اُس (Blue yonder) میں پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ اور ان معاملات سے وہ مکمل طور پر بے بہرہ اور ناآگاہ ہوتے ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ امجد صاحب کو اُن کی زندگی ہی میں سراہا جا رہا ہے اور وہ میرے خیال میں اس بات کے پوری طرح سے حقدار ہیں۔ وہ ایک قابل تحسین شخصیت کے مالک ہیں۔

چھوٹا سا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک ۷۵ سالہ بوڑھا ہوں اور عمر کی وجہ سے میرا حافظہ کمزور ہو رہا ہے اور امجد صاحب سے تو میری دوستی کا رشتہ اسلامیہ کالج پشاور کے زمانے تک جاتا ہے جو کہ ۱۹۵۰ء کی دہائی کا وسط تھا۔ ساٹھ سال کا طویل عرصہ گزر جانے کی وجہ سے بھولی بسری باتوں پر جمی دھول کی تہہ بیٹھ چکی ہے اور کئی یادیں اس تہہ کے نیچے دھنس کر دُھندلی ہو چکی ہیں اور اُس پر طرہ یہ کہ وقت گزرنے کے ساتھ میری اردو بھی کمزور ہو گئی ہے اور اب وہ پہلے سا عبور نہیں رہا جو کسی زمانے میں ہوا کرتا تھا۔

سائنس دان کہتے ہیں کہ جب ہم سوچتے ہیں تو ہمارا Thought process ایک زبان کی صورت میں دماغ میں رونما ہوتا ہے یعنی Language کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ میری گھریلو زبان پشتو ہے اور پھر میں نے مغربی ممالک اور خاص کر امریکہ میں چالیس سے زیادہ سال گزارے ہیں جس کی وجہ سے میری ہر سوچ اور سمجھ انگریزی زبان کی تابع تھی۔

بہرحال آمدم برمقصد۔

امجد صاحب سے میرے تعلقات اور دوستی اسلامیہ کالج پشاور میں غالباً ۱۹۵۵ء سے شروع ہوئی تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے ایک دو سال شاید بڑے تھے اور ایک کلاس سینئر تھے۔ جب میں ایف ایس سی میں وہاں داخلہ ہوا تو وہ اسلامیہ کالج میں مجھ سے پہلے زیر تعلیم تھے۔ معمول کے مطابق ان مختلف طلباء کو گروپوں اور ٹولیوں میں تقسیم کر کے اسلامیہ کالج کے پروفیسر صاحبان کے حوالے کر دیا جاتا تھا اور یہ امتیاز نہیں رکھا جاتا تھا کہ کون سینئر ہے اور کون جونیئر۔ اسے ٹیوٹوریل گروپ کہتے تھے۔

میری خوش نصیبی مجھے اور امجد صاحب کو ہمارے زوالوجی کے پروفیسر محمود احمد صاحب کے گروپ میں ڈالا گیا۔ معمول کے مطابق سال میں ایک بار اس ٹیوٹوریل گروپ کو اُن کے ٹیوٹر پروفیسر صاحب ایک اعلیٰ ٹی پارٹی پر مدعو کیا کرتے تھے۔ چائے کی پارٹی کے دوران پروفیسر صاحب اور ان کے گروپ کے شاگرد ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر ایک شام اکٹھی گزارتے تھے۔ چائے، کیک، پیسٹریوں، سموسوں اور مٹھائی سے لطف اندوز ہوتے تھے ایک دوسرے سے اچھی طرح سے متعارف ہونے کا موقع ملتا تھا۔ تصویریں کھینچی جاتی تھیں اور یہ ایک یادگار سہ پہر یا شام ثابت ہوتی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ امجد بھائی سے میری پہلی ملاقات پروفیسر محمود احمد صاحب کے ہاں ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب کے پاس اچھا قیمتی کیمرا تھا اور کئی تصویریں بھی کھینچی گئیں۔ بدقسمتی سے میرے پاس اس تاریخی موقعے کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ شاید امجد صاحب کے پاس ہو۔

اُس زمانے میں مجھے اردو ادب (نثر سے) بہت لگاؤ تھا اور میں نہ صرف سنجیدہ مضامین پڑھا کرتا تھا بلکہ مجھے سنسنی خیز افسانوں سے بھی بہت رغبت تھی۔ ان دنوں ایک محترمہ جن کا قلمی نام مسز عبدالقادر تھا۔ کچھ اسی طرح کی عجیب اور سنسنی خیز کہانیاں لکھتی تھیں جنہیں میں بہت شوق سے اُن کی شائع کردہ کتاب میں پڑھتا تھا اور پھر امجد بھائی سے بھی اس کے بارے میں ذکر کرتا تھا جو امجد صاحب کو اس دن تک یاد ہے۔ ان کہانیوں سے میں اتنا متاثر تھا کہ نتیجتاً میں نے اس طرح کی ایک کہانی بعنوان ''روح کی تشنگی'' لکھی تھی۔ جو میں نے اسلامیہ کالج کے ''خیبر'' رسالے کو بھیج دی تھی اور شائع ہوئی تھی۔

اس بات کا ذکر میں اس لئے کر رہا ہوں کہ اُس سال امجد صاحب خیبر رسالے کے اردو حصے کے ایڈیٹر تھے اور انہوں نے مجھے یہ شرف بخشا تھا کہ میری کہانی انہوں نے اگلے شمارے میں شامل کر دی۔ رسالے کے تین حصے ہوتے تھے۔ اردو، پشتو اور انگریزی۔

بعد میں ۱۹۵۶ء میں جب میں نے ایف ایس سی پاس کر لیا اور خیبر میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا تو امجد صاحب بی ایس فائنل میں تھے اور انہوں نے میڈیکل کالج میں مجھ سے ایک سال بعد داخلہ لیا۔ اس وقت تک خیبر میڈیکل کالج پوری طرح سے مکمل ہو گیا تھا۔ ایسے حالات کے باعث امجد

صاحب نہ تو اسلامیہ کالج کے دنوں میں اور نہ ہی میڈیکل کالج کے پانچ سالوں کے کورس کے دوران میرے کلاس فیلو بن سکے۔ اسلامیہ کالج میں وہ مجھ سے ایک سال آگے تھے اور میڈیکل کالج میں، میں اُن سے ایک سال آگے تھا۔ لیکن اس دوران میں ہم دونوں کے درمیان دوستی کا بیج ڈل چکا تھا اور ہماری دوستی اور برادرانہ محبت شروع ہو چکی تھی۔

اگلے پانچ برس ہمارے میڈیکل کالج کے دنوں میں ان کی ساری Activities اور ہنر (Talents) دیکھنے کا موقع رہا۔ وہ KMC (خیبر میڈیکل کالج) کی ساری تقریبوں میں شامل ہوتے رہے اور کالج کا بہت اہم حصہ بن گئے۔ نہ صرف انہوں نے مضامین لکھے بلکہ ''کالج ڈے'' کے روایتی شو میں بھی اہم حصہ لیتے رہے۔ ڈراموں میں بحیثیت ڈرامہ نویس اور ایکٹر کے حصہ بھی لیا۔ ان کی شمولیت اور شرکت سے اُن شوز میں چار چاند لگ گئے۔

مجھے ان کا ایک ڈرامہ یاد ہے جس میں انہوں نے ایک سرجن کا کردار اختیار کیا تھا۔ سرجن نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر ایک مریض کی جان بچائی تھی۔ کہانی مجھے یاد نہیں۔ تفصیلات دھندلی پڑ گئی ہیں۔

میں نے ایم بی بی ایس ۱۹۶۱ء میں کیا اور دو سال بعد ۱۹۶۳ء میں میں انٹرن شپ کے لیے اوہایو چلا گیا۔ امجد بھائی اس کے ایک سال بعد امریکہ آئے اور مجھ سے ملنے بھی آئے اور دو تین دن میرے ساتھ گزارے تھے۔

اُس کے بعد گاہے بگاہے ہم ایک دوسرے سے ملتے رہے اور ہماری ملاقات یہی کوئی دو تین دن ہی کی ہوا کرتی تھی۔ ایک دوسرے کو خود ہی کھانا پکا کر کھلایا کرتے تھے۔ مجرّد ہونے کے ناطے کھانا پکانا سیکھنا لازمی تھا۔ امریکی کھانوں میں مصالحہ نہیں ہوتا۔ اور ہم مصالحے دار کھانوں کی کمی محسوس کرتے تھے۔ لہٰذا جب بھی موقع ملتا خود ہی پاکستانی اور انڈین طرز کے کھانے پکا لیتے تھے۔ کھانا ایک Acquired Taste ہوا کرتا تھا۔ شروع شروع میں ہمیں نہ Steaks سٹیک کھانے پسند تھے اور نہ ہی ہیمبر گر بلکہ ہم نے ہیمبر گرز کا نام پہلی مرتبہ وہاں امریکہ میں سنا تھا اور سن کر سوچا کہ شاید اس میں لحم حرام ہے اور اس کے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن آج کی پود میکڈانلڈ، ہارڈیز وغیرہ سب نام سن چکی ہے اور شوق سے کھاتی ہے۔ جانے کے بعد مجھے صرف سویٹ ڈیشز اور تلی ہوئی مچھلی کے علاوہ زیادہ کچھ کھانا پسند نہ آتا تھا اور مجھے ان کھانوں کا عادی ہونے میں بہت عرصہ لگا۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اُن ملاقاتوں کے دوران جب بھی ممکن ہو سکتا تھا ہم کئی پاکستانی اور بھارتی ڈاکٹر اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔ امریکہ جا کر ہندو مسلم۔ ہندوستانی پاکستانی کا امتیاز جاتا رہا تھا۔ ہم سب کے طور طریقے یکساں ہی ہوا کرتے تھے اور ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے تھے۔

خود پکاتے، خود کھاتے اور ایک دوسرے کو بھی کھلاتے پلاتے تھے۔ گپ شپ لگتی چونکہ سب Bachelar تھے۔ باتوں کا موضوع اکثر لڑکیوں کی طرف چلا جاتا تھا۔ مجھے الفاظ تو یاد نہیں لیکن واقعہ یاد ہے کہ امجد بھائی نے کہا تھا کہ ''میرا دل بے تحاشہ عشق کرنے کی تلاش میں ہے''

یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ میں اُن سے ملنے گیا تھا اور بعد میں اُسی سال ایک بار پھر امجد صاحب ایک اور دوست کے ہمراہ میرے پاس ریاست کینٹکی آئے۔ ہم اس وقت اپنی سرجری کی تربیت کے آخری یعنی چوتھے سال میں تھے اور امجد بھائی اسی سال اپنی ہونے والی رفیقۂ حیات سے پوری حد تک محبت میں پڑ چکے تھے۔ مجھے ڈائی سے امریکہ میں ملنے کا موقع نہیں حاصل ہوا تھا بلکہ جب میری ملاقات پہلی بار ان سے ہوئی تو اس وقت امجد بھائی بمعہ اپنی اہلیہ کے پشاور منتقل ہو چکے تھے اور یہاں پر لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں کام کر رہے تھے اور خیبر میڈیکل کالج پشاور میں پڑھاتے تھے۔

میری شادی مارچ ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔ تو یہ میاں بیوی مجھے شادی کی مبارکباد دینے اور شادی کے تحفے پہنچانے آئے تھے۔ انھوں نے میری بیگم کو سونے کی ایک خوبصورت انگوٹھی اور مجھے پارکر کا پین تحفتاً دیا۔ یہ ان کی بڑی مہربانی اور سخاوت کی نشانی تھی ہماری یہ ملاقات میرے محترم پروفیسر صاحبزادہ ادریس کے گھر میں ہوئی تھی اور ملاقات کے دوران پروفیسر صاحب بھی موجود تھے۔ مجھے اچھی طرح سے یہ بات یاد ہے کہ جب امجد صاحب بمعہ ڈائی کے رخصت ہو گئے تو پروفیسر صاحب نے یہ ریمارک پاس کیا تھا:

''The two make a perfect couple. Amjad chose a perfect soul mate.''

دراصل ڈاکٹر صاحب نے پشاور نقل مکانی کر کے ایک بہت بڑی قربانی کا ثبوت دیا تھا اور یہ ایک بہت بڑا اقدام تھا اور یہ قربانی امجد صاحب سے بھی زیادہ ان کی اہلیہ صاحبہ کی تھی۔ وہ امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک کی باشندہ تھیں وہیں پر پلی بڑھی تھیں۔ لیکن اپنے شوہر کی محبت انہیں اس دیارِ غیر میں کھینچ لائی تھی اور آنے کے بعد یہاں پر اس نے ہر طرح کی تکلیفیں سہیں۔ گرمی، سردی کا مقابلہ کیا غربت نہ صرف اس نے بہت قریب سے دیکھی بلکہ میاں بیوی نے ذاتی طور پر غربت کو محسوس بھی کیا اور سہا بھی۔

غربت کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ امجد صاحب نے مجھ سے خود اس بات کا ذکر کیا تھا کہ KMC میں انہیں بہت کم تنخواہ ملتی تھی۔ امجد صاحب کی دریا دلی تو سب کو معلوم ہے اور مہمان نوازی بھی۔ لہٰذا اس تنخواہ پر ان کا گزارہ کہاں ہو سکتا تھا۔ یہاں پر سارے میڈیکل کالج کے اساتذہ کو پرائیویٹ پریکٹس کرنی لازمی ہوتی تھی اور یہاں پر یہ دستور ہے کہ اگر کوئی بہت دُور کا بھی دوست یا رشتہ ہو تو جب وہ ایک ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اس کی اُمید یہی ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نہ صرف ان کا بغور طبّی معائنہ کریں گے بلکہ فیس بھی نہیں لیں گے اور اگر ہو سکے تو دوائی بھی ہاتھ میں مفت پکڑا دیں گے اور پھر اگر اپریشن کی ضرورت پڑے گی تو وہ علاج بھی مفت ہوگا۔ یعنی بہ مصداق: لد کے دے لدا کے

دے اورلادنے والا بھی دے۔

جہاں تک میرا ذاتی علم ہے امجد صاحب کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ لوگوں کا مفت علاج کرتے تھے اور مریض جو کہ پیسہ ادا کرنے والے ہوتے تھے اُن کے کلینک کا رُخ شاذونادر ہی کرتے تھے۔ لہٰذا ایک دائمی زبوں حالی جاری رہی۔ لیکن وہ پشاور اپنی قوم اور ملک کی خدمت کرنے کا عزم کر کے لوٹے تھے۔ انہوں نے لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں پہلی بار دل کا اپریشن کیا تھا اور اس طرح سے ایک نئے دور کا آغاز ان کی کاوشوں سے ہوا۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے ان کا لکھا ہوا ایک مضمون پڑھا تھا جو کہ ان کے ایک مریض کے بارے میں انہوں نے تحریر کیا تھا۔ مریض کو خوراک کی نالی یعنی Esophagus میں سرطان کی رسولی تھی۔ جس سے اُن کی خوراک کی نالی بند ہو چکی تھی۔ امجد صاحب نے بہت Primitive conditions میں اس مریض کا کامیاب اپریشن کیا اور مریض کی جان بچ گئی۔ یہ سب ہمت اور ان کی دلیریوں کا ثمر تھا۔ جس کا انہیں بہت اجر ملے گا۔

باوجود امجد صاحب کی Poineering Efforts کے بھی جب اُن دنوں میں ایک لیڈی ریڈنگ کے سینئر سرجن سے ملا تو اس کی باتوں میں حسد کی آگ مجھے صاف بھڑکتی نظر آئی۔ مجھ سے وہ کہنے لگا کہ اس امجد کو دیکھو ایسے Primitive Conditions اور حالات میں وہ مریضوں کی زندگی خطرے میں ڈال رہا ہے۔ ہر طرح کے اپریشن جو کہ نہایت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں کر رہا ہے۔

سچی بات ہے کہ مجھے اس کی بیجا تنقید بالکل اچھی نہ لگی لیکن مروّت کی وجہ سے خاموش رہا۔ اس کی باتوں میں حسد کے عنصر کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اس تنگ نظر انسان کو یہ بالکل نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ امجد صاحب کے Scalpel Surgical کی وجہ سے کتنے لوگوں کی زندگی بچی اور بہتر ہوگئی۔

امجد صاحب نے مجھے ایک بار اس بات کا بھی ذکر کیا تھا کہ اُن کے ایک قریبی دوست نے جو کہ ڈاکٹر تھے ان کا مریضوں سے خالی کلینک دیکھ کر قدرے تسلی کے طور پر امجد صاحب سے کہا تھا:

امجد صاحب! یہاں مریض آج کل اس لیے نہیں آتے ہوں گے کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ مریض روزوں میں گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہتے رمضان کا مہینہ ختم ہونے پر مریضوں کا سلسلہ شروع ہو جائیگا اور اُن کا تانتا لگ جائے گا۔

امجد صاحب نے یہ بات مجھے ہنس کر سنائی تھی۔ کہہ رہے تھے رمضان کا مہینہ گزرانے کے بعد بھی مریضوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہ ہوا اور انہوں نے کوئی فرق نہ محسوس کیا۔

اس کے جواب میں، میں نے کہا تھا کہ شاید انہوں نے ایک غلط مقام پر اپنا کلینک کھولا تھا۔ ممکن ہے جہاں وہ کلینک واقع تھا وہاں پر سال کے بارہ مہینے رمضان جاری رہتا ہوگا۔

اس بات پر ہم دونوں ہنس پڑے۔

جہاں ایک طرف امجد صاحب پشاور میں اپنی پریکٹس جمانے کی کوشش کر رہے تھے وہاں دوسری طرف اُن کی رفیقۂ حیات ڈاٹی مرحومہ یہاں کے اسلامی ماحول اور پشاور کے معاشرے میں اپنے آپ کو مدغم کرنے میں کوشاں تھی اور مکمل طور پر اپنی کاوشوں میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی خوبصورتی اور حسنِ سلوک سے نہ صرف امجد صاحب کے خاندان کے قریبی افراد کے دلوں کو موہ لیا تھا بلکہ وہ اڑوس پڑوس کے گھرانوں میں بھی بہت مقبول اور ہر دل عزیز تھیں۔ وہ خوبصورت ہونے کے علاوہ بہت نیک سیرت بھی تھیں۔

اتفاقاً چند ہفتے پہلے ابھی میرا ذکر امجد بھائی کے ساتھ کچنال کے بارے میں ہوا تھا جس پر انہوں نے مجھے ایک دلچسپ کہانی سنائی۔

امجد صاحب کے گھرانے کی ایک خاتون نے اپنے گھریلو ملازم کو ان کے گھر میں لگے ہوئے پیڑ سے کچنال کی کلیاں توڑ کر لانے کو چڑھوایا۔ محترمہ ڈاٹی کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ کچنال کے پھولوں کے بجائے (جنہیں وہ گلدان میں رکھنے کی توقع کر رہی تھیں) اس کی کلیاں ان کے کھانے کی میز پر ایک سالن کی صورت میں پیش کی گئیں جسے اس نے بہت شوق سے کھایا۔

ہم نے یہ بات اس ضمن میں کی تھی کہ نسلِ انسانی نے دو طرح کھانے ایجاد کیے ہیں۔ اور جو چیز بھی زہریلی ہونے کی وجہ سے نقصان دہ نہ ثابت ہو دنیا کے مختلف حصوں میں لوگ کھاتے ہیں۔ جاپان میں کئی قسم کے ایسے پھول ہیں جنہیں لوگ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ ڈاٹی کے لیے یہ ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ کچنال تو ایک بہت لذیذ سبزی ہے جسے اگر قیمے کے ساتھ ملا کر دہی سے کھایا جائے تو اُس کا ذائقہ دوبالا ہو جاتا ہے۔

چونکہ امجد صاحب کے کلینک اور ان کی مالی زندگی میں رمضان کا لامتناہی سلسلہ جاری رہا اور اسے اپنے ہم پیشہ سٹاف کی ہمنوائی نہ نصیب ہو سکی۔ آخر کار وہ اس بات پر مجبور ہو گئے کہ امریکہ واپس جائیں اور بادل نخواستہ وہ ٹولیڈو واپس چلے گئے اور ہمارا صوبہ ایک عظیم انسان اور ڈاکٹر سے محروم ہو گیا۔ وہاں ان کی خوب پذیرائی ہوئی اور بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور وہاں انہوں نے بہت ترقی اور اچھے اچھے کام کئے۔ اس سے ایک بار پھر یہ بات عیاں ہے کہ ہماری قوم بہت ناقدر ہے۔

باوجود ٹولیڈو میں رہائش اور یہاں کے برے سلوک کا شکار ہونے کے بعد بھی امجد بھائی نے یہاں کے لوگوں اور خاص کر اپنی Alma mater یعنی خیبر میڈیکل کالج پشاور کو نہیں بھولے اور اتنے عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ جس محنت سے KMC کی فلاح و بہبود کے لیے نئے نئے منصوبے بناتے رہتے ہیں وہ قابلِ تحسین ہیں۔ اور یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ KMC اور اس کے گریجویٹ اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ان کے لیے وظیفے مقرر ہیں۔ ان کے سفر کا انتظام ہے وہاں پر انہیں سیکھنے کے مواقع فراہم کرنے کی سہولتیں ہیں اور

امجد بھائی وہاں سے ہر طرح کی کتابیں، اوزار اور مشینری بھیجتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر سال خود بھی دو چار دفعہ پشاور کا چکر لگا لیتے ہیں۔ لیکچر کرتے ہیں اور اپنی روح کی پیاس بجھا لیتے ہیں۔ انہیں اس علاقے اور یہاں کے لوگوں سے اتنی محبت ہے کہ وہ عشق کی حد سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاٹی جب زندہ تھیں تو وہ شاید ان کے اس عشق کو ایک رقیب سمجھتی ہوں گی اور حیران ہوں کہ انہوں نے اس رقابت کو عرصۂ دراز تک کیسے برداشت کیا؟ یہ ڈاٹی کی اخلاقی بلندیاں تھی کہ اس نے اپنے شوہر کی ''دوسری محبت'' اور عشق کو کھلے دل سے قبول اور برداشت کیا۔

امجد صاحب کے پشاور سے گہرے عشق کی بڑی نشانیاں یہ ہیں کہ امجد صاحب نے پشاور شہر کے نقشے بنائے، تصویریں کھینچیں، شہر کی فصیل اور سارے تاریخی دروازوں کے خاکے اپنے قلم سے بنائے۔ دو ضخیم کتابیں پشاور کے بارے میں لکھیں۔ پہلی کتاب پڑھ کر میں اتنا متاثر ہوا کہ اُسے میں نے ایک طویل خط انگریزی میں لکھا جو کہ اسی طرح انہوں نے انگریزی زبان ہی میں اپنی دوسری کتاب میں شامل کر کے مجھے شرف بخشا۔ امجد صاحب کے عزیز دوست اور مشہور عالم شاعر محسن احسان مرحوم نے پہلی کتاب پڑھ کر لکھا تھا۔ مجھے اُن کے الفاظ تو ٹھیک طرح سے یاد نہیں لیکن جس کا متن یہ تھا کہ امجد رہتا تو امریکہ میں ہے لیکن ہمیشہ پشاور کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے۔ اس کے بارے میں لکھتا رہتا ہے۔ پریشانی کی وجہ سے نہ خود آرام اور چین کی نیند سوتا ہے اور نہ ہی اوروں کو چین سے سونے دیتا ہے۔

تو یہ ہے امجد بھائی کے پشاور سے عشق کی انتہا۔ البتہ اس عشق و محبت سے پشاور اور اس کے کئی ادارے بہت مستفید ہوئے ہیں۔ گور گٹھڑی میں آثار قدیمہ کی تلاش میں کھدائی۔ اسلامیہ کالج اور خیبر میڈیکل میں ترقی کے منصوبے۔ پشاور کی ہسٹری (History) یعنی تاریخ میں تحقیقات۔ سب ان کی کوششوں سے ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

بعض لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں اور یہ خوش نصیبی اُن کو اُن کی نیک نیتی اور خلوص کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اور ایسے موقعوں پر اللہ تو ضرورت سے کچھ زیادہ مہربانیاں نچھاور کرتا ہے۔ یہی خیال میرا امجد بھائی کے بارے میں بھی ہے۔ اللہ نے ان پر بہت سی مہربانیاں فرمائی ہیں۔ جس کی وجہ سے میری حقیر رائے کے مطابق وہ ہر فن مولا ہیں۔ بعض افراد چند ہی خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ادیب شاعر ہے تو وہ نثر نگاری نہیں کر سکتا۔ انہیں ایک سے زیادہ زبانوں پر عبور حاصل نہیں ہوتا۔

امجد صاحب نے ماشاء اللہ نہ صرف اردو میں کئی کتابیں لکھی ہیں بلکہ وہ بہت کچھ انگریزی زبان میں بھی لکھ چکے ہیں اور لکھتے رہتے ہیں۔ ٹولیڈو شہر کے مشہور اخبار Toledo Blade میں ان کے مقالے کئی برسوں سے چھپ رہے ہیں اور انہیں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انہوں نے بہت سارے طبی سائنس کے مختلف موضوعات پر مضمون لکھے اور چھپوائے ہیں۔ طبی تحقیقات بھی کی ہیں۔ اپنے عزیزوں، اساتذہ اور پروفیسروں کے بارے میں لکھا ہے۔

مرحوم پروفیسر محمود احمد صاحب جب بستر مرگ پر تھے۔ امجد بھائی نے ان پر ایک صفحے کا مضمون دردناک الفاظ میں لکھا تھا جو کہ بعد میں وہاں کے مشہور امریکی میڈیکل ایسوسی ایشن کے جرنل JAMA میں چھپا تھا اور میں نے بہت پسند کیا تھا۔

امجد صاحب نے پشاور کی تاریخ اور جغرافیے پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ سیاحت بھی کی ہے اور بحیثیت ایک مفکّر سیاح کے کوہ پیمائی کے بعد دریائے سندھ کا منبع دریافت کرنے کے لیے ایک مہم بنائی تھی اور وہ خود اس ٹیم کے سربراہ تھے۔ مہم کے بہت عرصے بعد مجھے پتہ چلا کہ اس سلسلے میں انہوں نے لمبا سفر طے کیا۔ اونچے اونچے پہاڑوں جیسے نانگا پربت کی کوہ پیمائی کی اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالا۔ میں امجد صاحب کے حوصلے اور ہمت پر عش عش کر اُٹھا۔ پہاڑوں کی اونچی بلندیوں پر اچھی طرح کے صحت مند لوگ بھی Mountain Sickness کا شکار ہو سکتے ہیں اس علالت میں بیمار کا دماغ سُوج جاتا ہے اور پھیپھڑوں میں پانی جمع ہو سکتا ہے اور یہ علالت موت کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ امجد صاحب پر دل کے دورے پڑ چکے تھے اور بائی پاس اپریشن بھی کروا چکے تھے لیکن اس کے باوجود بھی انہوں نے یہ خطرہ مول لے کر اونچے پہاڑوں کی کوہ پیمائی کی لیکن شکر ہے کہ خیریت رہی۔ شاید ان کی ٹیم کا ایک اہم فرد اگر مجھے ٹھیک طرح سے یاد پڑتا ہو اُن کا بیٹا تھا۔ انہیں یہ بیماری ہو گئی تھی لیکن آخر میں ان کی جان بچ گئی۔

وہ سفر کرنے اور دنیا کا کونہ کونہ چھاننے کے بھی شوقین ہیں۔ اور میرے خیال میں دنیا کا کوئی ایسا ملک نہ ہوگا جہاں وہ نہیں گئے ہوں گے اور جہاں انہوں نے لیکچر نہ دیا ہو۔ چاہے وہ ایک اسلامی ملک ہے یا کیمونسٹ علاقہ، چین ہے یا جاپان، روس ہے یا کوئی اور مغربی ملک، میرے خیال میں اُن سے زیادہ پاکستان کے لیے بہتر خیر سگالی کا موزوں سفیر یعنی Goodwill Ambassador اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

مجھے یقین ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے مقرروں کے زمرے میں شمار ہو سکتے ہیں۔ مجھے ان کے کچھ لیکچر اور طبّی موضوع پر مقالے سننے کا موقعہ ملا ہے۔ اُن کے KMC کی سلور جوبلی کی تقریب میں کی ہوئی تقریر کی یاد اب بھی میرے دل میں پوری طرح سے نقش ہے۔ جس انوکھے طریقے سے انہوں نے ڈبل پروجیکٹر اور سلائیڈ شو پیش کیا تھا ان کی ہر بات دل میں پوری طرح سے اُتر گئی تھی یہ خوبی میں نے اعلیٰ ترین پروفیسروں میں بھی نہیں پائی حالانکہ میں نے اپنی زندگی میں ہر طرح کے سیمیناروں میں شرکت کی ہے۔

جب بھی وہ ٹولیڈو بلیڈ Toledo Blade اخبار کے لیے مقالہ لکھتے ہیں اُن کی کسر نفسی کا اب بھی یہ حال ہے کہ باوجود اتنی مہارت اور لکھنے کے تجربے کے بعد بھی وہ اپنا مقالہ دو اور ایڈیٹروں سے پڑھواتے ہیں تاکہ اس کی رہی سہی غلطیاں درست کی جا سکیں۔ تب اس کے بعد وہ مضمون چھپنے کے لیے بھیجتے ہیں۔

ان کو اپنی ہند کو زبان سے بھی کافی لگاؤ اور محبت ہے جو کہ قدرتی بات ہے کیونکہ یہ زبان خاص طور پر پشاور شہر میں بولی جاتی ہے اور اس میں پشاور کا خاص رنگ بھرا ہوا ہے۔ ہندکو زبان کے فروغ کے لیے امجد صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے۔

ان کی یہ ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ اگر کسی شخص میں قدرتی طور پر کوئی ہنر یعنی Talent ہو تو اُسے صرف سراہنے پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اُس ہنرمند کو اُس کے ہنر کا صلہ بھی ملنا چاہیے اور اسے آگے بڑھانا بھی چاہیے (یعنی اسے پروموٹ Promote کرنا لازمی ہے)

پاکستان نے ایک اعلیٰ درجے کا سکوائش کا کھلاڑی ہاشم خان کی صورت میں پیدا کیا تھا جو ایک غریب گھرانے کا فرد تھا اور اس نے یہ کھیل اپنے انگریز مالکوں سے سیکھا تھا اور اتنا آگے بڑھ گیا کہ ریٹائرمنٹ تک اس نے کسی سے کھیل کے میدان میں شکست نہیں کھائی تھی۔ ہاشم خان اپنی زندگی کے آخری دور میں امریکہ منتقل ہو گئے تھے اور اُن کی امجد صاحب سے جان پہچان تھی اور جہاں تک امجد بھائی سے ہو سکا انہوں نے ہاشم خان کو پوری طرح سے پروموٹ کیا۔

جب ہمارے اسلامیہ کالج پشاور کے Botany کے پروفیسر فریدی صاحب کو بدقسمتی سے گلے کا سرطان ہوا تو امجد صاحب نے انہیں امریکہ بلوایا اور ان کی علالت کے دوران پروفیسر صاحب کی ہر طرح سے دیکھ بھال اور امداد کی۔

اُس اسلامیہ کالج کے ایک اور انگریزی پروفیسر فلوز صاحب نے اپنے طلباء کو صرف انگریزی ہی نہیں پڑھائی بلکہ انہوں نے صوبے کے باشندوں کے لیے بہت سارے سوشل کام بھی کیے تھے۔ جس میں بلڈ ڈونیشن کی مہمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر فلوز کی ساری عمر پشاور ہی میں کٹی اور وہ آخر تک صوبے کے لوگوں کی خدمت میں بحیثیت ایک رضا کار لگے رہے۔ لیکن ان کی آخری عمر بہت خستہ حالی میں بیتی۔ امجد صاحب نے اُن کی بھی بہت مدد کی اس طرح کی کئی کہانیاں ہیں۔

امجد صاحب کا بے لوث پیار اور محبت صرف اپنی بیوی اور بچوں تک ہی محدود نہ تھا۔ اُن کے اس والہانہ پیار میں اسلامیہ کالج KMC اور ٹولیڈو یونیورسٹی اور ٹولیڈو کا اسلامی مرکز بھی شامل ہیں۔ انہوں نے ان سارے انسٹی چیوشنز کی بے حد خدمت کی ہے اور ابھی بھی کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان فلم انڈسٹری کے شہرہ آفاق ایکٹر دلیپ کمار سے خاص طور پر مل کر اُن کا انٹرویو اس لئے لیا تھا کہ دلیپ صاحب ''پشوری'' تھے۔

دوسرے اعلیٰ پائے کے اداکار راج کپور کے والد محترم پرتھوی راج صاحب کا تعلق بھی پشاور سے تھا اور بقول امجد بھائی انہیں بھی پشاور سے اتنا دلی لگاؤ تھا کہ عرصۂ دراز گزرنے کے باوجود بھی اُن کی محبت پشاور کے لیے کم نہ ہوئی تھی اور وہ بتاتے ہیں کہ کپور خاندان کا کوئی بھی فرد اگر اپنے نئے گھر کی بنیادیں ڈالتا ہے تو اس میں ایک بوری پشاور کی مٹی ضرور شامل کی جاتی ہے۔

ان دنوں اسلامیہ کالج پشاور کی سو سالہ برسی منانے کے چرچے ہیں اور اس کے لیے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ امجد صاحب اس سلسلے میں کم از کم ایک چکر یہاں کا لگا چکے ہیں اور ان سوچوں میں ہیں کہ کالج کی تقریبات کو مزید کامیاب بنانے میں وہ کیا خدمات پیش کر سکتے ہیں اور کیا مدد کر سکتے ہیں۔

آج کل ان کی نئی کتاب کا بہت ذکر چل رہا ہے کتاب کا نام ہے

With Whom Shall I Talk in The Dead of Night

کتاب پر بہت اچھے ریویوز Reviews آ رہے ہیں اور ایسے لگتا ہے کہ اس کتاب نے امریکہ کی ادبی دنیا میں تہلکا مچا رکھا ہے۔ میں نے یہ کتاب صرف ایک اور شخص کے ہاتھ ہی میں دیکھی تھی لیکن اُسے کھول کر سرسری طور پر بھی پڑھنے کی ہمت نہ کر سکا تھا۔

کتاب کے ریویوز پڑھنے سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ امجد صاحب نے اس کتاب میں اپنی گزشتہ ازدواجی زندگی کے دنوں کی داستان لکھی ہے۔ اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا ہے اور اپنی روح کو برہنہ کر کے ساری دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اُن کی رفیقۂ حیات کا نام ڈورو تھی تھا لیکن سب اُسے پیار و محبت سے ڈاٹی کہہ کر پکارتے تھے۔ میں نے ریویوز پڑھنے پر اکتفا کیا اور امجد بھائی کو ای میل میں لکھا کہ وہ سرطان کے موذی مرض کی وجہ سے اپنی ڈاٹی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھنے کے بعد بھی ان کی محبت، پیار اور احترام اپنے دل میں رکھیں گے۔

ایسے حالات میں اگر اپنا موازنہ Comparison امجد بھائی سے کروں تو قدرتی بات ہے کہ رشک (جو کہ میں ان سے کبھی کبھی محسوس کیا کرتا تھا) حسد کی صورت اختیار کر لے گا اور میرے اندرونی جذبات بدل سکتے ہیں۔

لیکن میرے دل میں امجد بھائی کے لیے ایک بہت بلند اور بڑا مقام ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس طرح کے جذبات میرے دل میں داخل ہوں۔ لہٰذا اسی میں بہتری ہے (کہ باوجود دل میں شوق اٹھنے اور کتاب پڑھنے کی خواہش کی) میں کتاب پڑھنے سے اجتناب کروں ہر ایک کا اپنا نصیب ہوا کرتا ہے۔

امجد صاحب ایک بہت دریا دل انسان ہیں اور اگر آپ اس مبالغہ نہ سمجھیں تو میں انہیں حاتم طائی اور ہمارے پاکستانی ایدھی صاحب کے زمرے میں شامل کرنے سے ذرا بھی نہ ہچکچاؤں گا۔ ایدھی صاحب کو بعض لوگ سینٹ Saint یا اوتار کا خطاب دیتے ہیں اور جتنی بے لوث انسانی خدمت وہ ان دنوں کر رہے ہیں اُس کی مثال نہیں اور وہ واقعی نوبل پرائز کے حقدار ہیں۔

اُس کے مقابلے میں امجد بھائی بھی کم نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارے بھائی کے پاس ایدھی صاحب کی طرح لامتناہی Resources نہیں ہیں۔ ورنہ وہ بھی سخاوت میں کسی سے کم نہیں۔ کم از کم ہمارا دل اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ کہ مرزا نوشہ نے زیر نظر شعر یقیناً ڈاکٹر سید امجد حسین کے لیے ہی کہا ہوگا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

عشق بلاخیز

ارشاد احمد صدیقی

(یو۔ایس۔اے)

عشق کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ عشق کی کوئی حدود نہیں۔ عشق کا کوئی مذہب نہیں۔ عشق کسی طبقے سے متعلق نہیں۔ عشق کم زور نہیں منہ زور ہے۔ جس پر عشق کی برقی لہر گرتی ہے وہ نروان کی طرف سفر شروع کر دیتا ہے اور کندن بن جاتا ہے۔ جلوۂ طور منور ہو جاتا ہے۔ علاج جاں سے گزر جاتا ہے۔ مہاتما بدھ اپنے آپ ہی ڈوب کر کائنات کو پالیتا ہے۔ مسمی کسی ایک عشق بلاخیز کی بات نہیں کر رہے۔ ہم تو اپنے عزیز دوست ڈاکٹر امجد حسین کی بات کر رہے ہیں جنہیں ہم احترام سے ''آغا جی'' کہتے ہیں۔ اس کا عشق ہمالیہ سے بلند اور قلزم سے گہرا ہے۔ اس کا یہ عشق ماورائی عشق نہیں اور نہ ہی وہ کسی ہیولے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اور نہ ہی وہ اس مقولے پر ایمان رکھتا ہے کہ:

جس کو ہم چھو نہ سکے اس کو خدا مان لیا

اس کا عشق حقیقت پسندانہ عشق ہے۔ جسے وہ چھو سکتا ہے، جیسے وہ دیکھ سکتا ہے جو اس کے دل میں آباد ہے۔ اُس کا عشق اُس کا شہر ہے۔ جس میں اس نے جنم لیا۔ اُن قدیم گلیوں کے قدیم محلوں اور ان کے قدیم تر مکانوں کی دیواروں اور دہلیزوں سے ہے۔ وہ نہ جانے کب سے اس روگ میں مبتلا ہے۔ اس کے احباب کہتے ہیں کہ وہ رہتا تو ٹولیڈو میں ہے لیکن سانس قصہ خوانی میں لیتا ہے۔ خواب مینا بازار کی گلیوں کے دیکھتا ہے اور گجر گھنٹہ گھر کے سنتا ہے۔ اُس کے دن کی ابتدا اسپغول سے ہوتی ہے۔ وہ ''لواش'' کا دلدادہ ہے لیکن اکتفا ڈبل روٹی پر کر لیتا ہے۔ اُس نے گھر کے رواں رواں پر پشاور کی سرداری ہے۔ وہ زوروں Cardioyasculerp surgeon ہے۔ نہ جانے کتنے دل سینوں سے نکال کر اُن کی چھانٹ پھونک کر کے دوبارہ سینے میں رکھ کر اُس کی متوازن دھڑکنیں دیکھ کر خوش ہو لیتا ہے۔ نہ جانے وہ کتنے دلوں کے روز ہائے حدوں سے آشنا ہے۔ لیکن اگر اس کا دل کھول کر دیکھا جائے تو اس میں سے پشاور کا وہ نقشہ نکلے گا جو اُس نے پشاور کی گلیوں، کوبہ کو گھوم کر بنایا ہے۔ نیم تاریک گلیوں کے۔۔۔ بسرے نام یا بے نام گلیوں کے نشان گڈری پوش مہربان ضعف باسیوں کے قدموں میں بیٹھ کر کرید کرید کر ان کی یادداشتوں سے سالوں کی گرد کو صاف کیا، فصیل شہر کے ہر برج پر مینارے کو جھانک جھانک کر چھو چھو کر دیکھتا رہا اور فصیلِ شہر کی ان ''وزیری اینٹوں'' کو سہلا سہلا کر گوش بر آرزو قصۂ پارینہ تراشتا ہے۔ اور نقش بناتا ہے۔ وہ نقشہ اس کے دل کے سنگ سنگ دھڑکتا رہے گا۔ اس کا عقیدہ ہے کہ پشاور کا صرف وہ ہے جو فصیلِ شہر کے اندر پیدا ہوا ہو اور وہیں کا باسی ہو۔ ہمارے عزیز محسن احسان کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا کہ وہ قدیم شہر کا آبائی ثمر بیچ کر نئی بستی میں چلے گئے اور ساری عمر روتے رہے۔

جس میں بچپن کے سبھی خواب سجے تھے میرے
میں نے وہ صحن وہ دالان وہ در بیچ دیا
میں نے جس پاک صحیفے کی تلاوت کی تھی
اس صحیفے کا ہر اک زیر و زبر بیچ دیا

یہی حادثہ امجد کو بھی پیش آیا۔ خاندانی فیصلہ یہ تھا کہ آبائی مکان بیچ دیا جائے۔ امجد نے مکان خریدنے والے سے عرض کی کہ میرے آنے تک مکان نہ گرانا۔ میں آخری بار اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو مکان کی جگہ ملبے کا ڈھیر تھا۔ وہ چپ چاپ اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔ ایک اینٹ اٹھا کے اسے سہلانے لگا:

کتنے طوفانوں کی حامل تھی لہو کی اک بوند
دل سے ایک لہر اٹھی، آنکھ سے دریا برسا

امجد پشاور کو ''یک شہر آرزو [1]'' کہتا ہے۔ وہ اپنی قدیم گلی کے ''درمکتب'' کی بوسیدہ دہلیز کو چومتا ہے۔ وہ اپنے ''چتراں والے کٹورے'' کو سینے سے لگا کر اس کے چتر چتر میں گئے دنوں کے نقشِ کف پا ڈھونڈتا ہے۔ اپنی کتاب ''عالم میں انتخاب'' کے اوراق پلٹ پلٹ کر مٹتی ہوئی مہذب تہذیب کو آوازیں دیتا ہے اور جوابی صدا سننے کی سعی لاحاصل کرتا ہے۔ وہ اپنے دریا کا بھی گرویدہ جسے اس علاقے میں اباسین (دریاؤں کا باپ) کہتے ہیں وہ اس دریا کے کنارے بیٹھ کر اس کی موجیں گنتا ہے۔ وہ اس سے پوچھتا ہے کہ ''اباسین تم کہاں سے آرہے ہو'' موجیں جواب نہیں دیتیں تو وہ خانہ بدوش اپنے قافلے سمیت اُس کے منبع کی تلاش کو چل پڑتا ہے۔ وہ کشتیوں، لینڈ روور اور حتی کہ یاک (Yak) کی پیٹھ پر بیٹھ کر ساحل مراد تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

اباسین دریاؤں کا باپ ایشیا کا سب سے بڑا دریا مغربی تبت کی بے آب و گیاہ سطح مرتفع کی چٹانوں سے قطرہ قطرہ نکل کر نالی کی طرح بہہ نکلتا ہے۔ کسے کیا معلوم کہ یہی قطرہ قطرہ ۱۹۸۰ میل کا سفر کرے گا اور اس کے کناروں پر بسنے والی آبادیاں انڈس ویلی سولائی زیشن کہلائیں گی اور جس کے کناروں پر موہن جودوڑو اور ہڑپا سی تہذیبیں چار دانگ عالم میں قندیلیں روشن کریں گی۔

امجد اپنے بیٹے سے کہتا ہے اس چٹان پر کھڑے ہو کر آذان دو، آذان کی پروقار آواز فرازِ کوہ کے چٹیل میدانوں اور جھکے ہوئے آسمانوں کے درمیان سرسرانے لگی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس اٹل خاموشی اور لامحدود بیابانی اور ہر ذی نفس کی نامودگی کے باوجود تاحدِ نظر ساری کائنات سربسجود ہو گئے ہو۔

باقی صفحہ ۴۵ پر ملاحظہ کیجیے

''گلوبل انسان''

ڈاکٹرظہوراعوان

(●)

ڈاکٹر امجد حسین زیدی تبلیغی دورے پر پاکستان آئے ہیں۔ ہر سال آتے ہیں۔ڈاکٹروں کو لیکچر اور دوستوں اور رشتہ داروں کو محبت دیتے اور سمیٹتے ہیں۔ یہ آدمی ایک گھن چکر ہے اس سے ملوتو اس طرح معصومانہ طریقے پر ہنستا مسکراتا ہے کہ جیسے دنیا میں اس کا اور کوئی کام ہی نہیں ہے دوسروں پر بھی ہنستا ہے اپنے آپ کو بھی نشانہ استہزا بناتا ہے۔مطمئن، مسرور اور محفل آرا، ہنسنا مسکرانا اس کا وظیفہ حیات ہے کام اس کے دیکھو اور سنوتو حیران رہ جاؤ یہ کھنلڈرا آدمی اندر سے کس قدر بھرا پرا اور کائیاں زیرک ہے کہ کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ پیشہ اس کا مہا، شغل، مشغلے اس کے بے شمار، ہرفن میں طاق اور سب سے آگے۔امریکی شہری، پاکستانی عاشق، پشاور کا مجنوں، ڈاکٹروں کا ڈاکٹر، دل کا سرجن، امریکی بیوی کا شوہر، امریکی بچوں کا باپ، پشاوری عزیزوں کی آنکھ کا تارا، امریکہ میں سرجری کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو سیدھا پشاور کا رخ کرتا ہے یہاں بھی اپنی آمد کو کارآمد بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔اتنے شوق شغل پال رکھے ہیں اتنے متنوع دوست اور بوقلموں سرگرمیاں پھیلا رکھی ہیں کہ ہر وقت کچھ نہ کرتا یا کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے عمر بھی اس کی زیادہ نہیں ہے اپنی عمر سے کم عمر بھی نظر آتا ہے مگر کام اتنے کر لئے ہیں کہ ابوطبیلے کے وقت کا آدمی دکھائی دیتا ہے۔

ساٹھ کی مردم خیز انقلابی دہائی میں پل بڑھ کر جوان ہونے والے آدمی نے ساٹھ کی دہائی میں ایم بی بی ایس کی ڈگری بھی لی۔نوکری کے لیے ہاتھ پاؤں بھی مارے بے زار بھی ہوا ڈرامے بھی لکھے۔سائیکل پر شہر سے یونیورسٹی بھی آتا جاتا رہا۔نوکری سے محرومی کا چرکہ بھی سہا جب سب طرف سے مایوس ہوگیا تو نئی دنیا کے سفر پر روانہ ہوگیا اس ساٹھ کی دہائی میں امریکہ میں نوکری بھی کی۔شہریت بھی حاصل کی، شادی بھی کی۔ پھر بال بچے ہوئے، ہسپتال بنایا، فوٹو گرافی میں مہارت پیدا کی، اردو کے ساتھ انگریزی لکھی، رسالوں اخبار میں چھپا، مہم جوئی شروع کی، پہاڑوں دریاؤں کو سر کیا، دریائے سندھ کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک فیتہ رکھ کر ناپا، ساری دنیا میں گھوما پھرا۔ امریکی پاسپورٹ جیب میں اور جاپانی کیمرہ گلے میں لٹکائے یہ ڈاکٹر جہاں بھی گیا لوٹ کر پشاور ہی آیا اور یہی بات اس ہرجائی کی اس کے دوستوں کو پسند ہے۔

ستم ظریف ہے اول درجے کا ایسے ایسے اوکھے اوندھے کام کرتا ہے کہ دوستوں کو بولا بوکھلا دیتا ہے۔دوست اس پر فخر و ناز کرتے ہیں اس سے پیار کرتے ہیں کام کسی کا نہیں کرتا مگر ہر کام کے لیے آمادہ نظر آتا ہے ہر وقت اپنی خدمات پیش کرتا رہتا ہے۔پشاور میں اس کے ایسے عاشق زار بھی ہیں جن کی وجہ سے وہ پشت پر ہاتھ باندھے بھی نظر آتا ہے۔سمارٹ سجیلا سگھڑ اور سریلا سب رنگ آدمی ہے۔ ربط ضبط نظم ونسق کا رسیا، دیوانگی میں فرزانگی کا قائل، ہنگامہ پروری وآرائی میں نستعلیق نظم آرائی اور شیرازہ بندی کا ماہر اور کاربند جب دیکھو کسی طے شدہ فکام میں غلطاں، امریکی شہری ہے دل پشوری ہے کسی چیز سے پرہیز نہیں کرتا، چینی گھی چربی سب کچھ کھا جاتا ہے، سگریٹ پیتا ہے مگر ضبط ملاحظہ ہو ہفتے میں دو سگار پیتا ہے وہ بھی جب محو سفر ہو۔

شراب نہیں پیتا اس لئے کہ مسلمان ہے پرانے مسلمانوں والے بہت سے کام بھی نہیں کرتا کہ دور جدید کا امریکی ہے قد کاٹھ حلیہ جثہ کینڈا سب معقول ومقبول۔ پشاور آتا ہے تو کتابیں اکٹھی کرتا ہے واپسی پر جہاز میں پڑھتا ہے ان پر تبصرے جہاز میں ہی لکھتا ہے ایسی اردو لکھتا ہے کہ اہل زبان بھی حیران رہ جائیں۔خط اتنا خوبصورت ہے کہ کاتب پریشان ہو جائیں لگتا ہے بچپن میں بڑی تختیاں لکھی اور ماریں کھائی ہیں۔خط اس کے ادب وفن کا نمونہ، لطف ومزاح کی پوٹ ایک خطوط کا مجموعہ ایسی کتاب کی صورت میں شائع ہو چکا ہے جو پشاور شہر کی ثقافتی تاریخ کا روپ بھی اوڑھے ہوئے ہے۔انگریزی کالموں کا ایک مجموعہ الگ تیار ہے۔دریائی اور پہاڑی لحات پر مشتمل روداد الگ تیار ہو رہی ہے ایک امریکی دانشور اور سکالر ان کی تحریروں کے انگریزی کلیات کی تیاری میں مصروف ہے۔سرجری اور علاج قلب کی مہارت کے الگ چرچے ہیں جن سے پاکستان کی علمی دنیا بے خبر ہے اس کی فوٹو گرافی کی دھوم بھی کم نہیں اس کی تصویریں پیشہ وارانہ مقابلوں میں انعام پا کر کیلنڈروں پر چھپتی رہتی ہیں۔ یہ شخص گھنا اور گنی آدمی ہے پاس بیٹھو تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ آدمی کتنے کارنامے سرانجام دے چکا ہے یا مزید کارہائے نمایاں سرانجام دینے کی استطاعت رکھتا ہے۔سلو بس ہنستا مسکراتا ٹھٹھول کرتا ہے۔

کل ہی کہنے لگا چل کے کہیں قلہ پانچہ کھاتے ہیں مگر جگہ اور یجنل ہو چنانچہ ہم قدیم شہر کے ایک تنگ وتاریک بازار کی ایک میلی دکان کی ہلتی جلتی بینچوں پر جا بیٹھے اور مٹی کے بڑے بڑے پیالوں اور ٹاکوؤں میں قلہ کوٹ کے کھایا شوربہ پیا۔ڈاکٹر امجد نے کہا قلہ پانچہ کھانے کا مزا اس طرح آتا ہے آخر اس کار خیر کے بھی کچھ آداب ہیں۔قلہ پانچہ نازک نفیس شیشے کے برتنوں میں ایئر کنڈیشنڈ کمرے کے قیمتی صوفوں پر نیپکن لٹکا کر کھانے کی چیز نہیں۔ڈاکٹر امجد نے اس موقع پر کچھ پرانے ناگفتہ بہ قسم کے پشوری محاورے بھی استعمال کئے۔ ڈاکٹر امجد کے دل میں ایک پراسرار الف لیوی پشاور بستا ہے اس کی تلاش میں وہ یہاں آتا ہے وہ پرانی یادوں، باتوں اور شہری ثقافت میں اپنا ماضی اپنے حسن اور

اپنی معصومیتوں کو ڈھونڈتا ہے وہ ہم سب کو احساس کمتری میں مبتلا کر کے چلا جاتا ہے ہم جس پرانے کلچر سے گریز پائی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ اسے ڈھونڈتا ہے ہمیں بہت کچھ کہہ دیتا ہے ہمارے اردگرد لپٹی تصنع اور جدیدیت کے دھند کے غبارے کو پنکچر کر کے ہمیں اپنا اصلی روپ دکھاتا ہے۔

ڈاکٹر امجد میں بچوں کی سی معصومیت، گرم جوشی اور تجسس و تحیر پایا جاتا ہے اس سے مل کر بے پناہ خوشی ہوتی ہے وہ ہمیں اپنی اہمیت کا احساس دلا کے چلا جاتا ہے۔ وہ جا کر بھی آرام سے نہیں بیٹھتا ہے اس کے ٹیلی فون آتے ہیں ان کے لمبے لمبے خط آتے ہیں، ہمیں جگاتے، اٹھاتے، بٹھاتے اور دوڑاتے ہیں۔ وہ اہل پشاور سے یہی کہتا ہے کہ اپنے ڈوبتے پشاوری کلچر کو بچاؤ، محفوظ کرو، تصویروں، تحریروں، یادوں، باتوں میں۔ ہمیں پشاور کے اس فرزند پر فخر محسوس ہوتا ہے وہ ایک جینوئن گلوبل انسان ہے۔ مشرق و مغرب شمال و جنوب نئی اور پرانی تہذیب و ثقافت کا خوبصورت مظہر ہونٹوں پر سگار سجائے شیرے پانچے والے کی دکان پر باوا آدم کے زمانے کا قلہ پانچہ کھانے اور انگلیاں ڈبونے والا بے تصنع اور بے ریا انسان۔

یہ نہیں کہ امجد صرف لاابالی انسان ہے۔ نظر وہ ایسا ہی آتا ہے مگر انچ انچ حسابی آدمی ہے۔ ڈیڈ لائنز کا پابند و گرفتار، جمع تفریق کرنے والا بیدار اور ہوشیار، وہ دھوکہ دیتا نہیں تو دھوکہ کھاتا بھی نہیں وہ سیدھا سادہ ہے مگر جلیبی کی طرح، اس کی دیوانگی میں بھی ایک فرزانگی پائی جاتی ہے۔ وہ بے مروت و بے لحاظ بھی بن جاتا ہے بن سکتا ہے۔ زبردست ٹاسک ماسٹر ہے۔ کام کرنے اور لینے میں کسی قسم کی رورعایت نہیں کرتا۔ پروفیکشسنٹ ہے اور ہر کام کی نوک پلک اس طرح سنوارتا ہے کہ ہم جیسے بے فکروں کو غصہ آ جائے۔ امجد ایک خوبصورت معمہ ہے جسے سمجھ کر بھی لطف آتا ہے اور جسے نہ سمجھ کر بھی مزہ ملتا ہے۔ وہ زندگی کی حرارت سے معمور ایک دھڑکتا بھڑکتا انسان ہے۔ جسے مل کر خوشی ہوتی ہے ایسے انسان بہت کمیاب ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایسا کمیاب اور کامیاب انسان ہے۔

بقیہ:

پشاور قدیم سیّاحوں کی نظر میں

ھیون تسانگ نے اپنی ساحت کے دوران زیارت کی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں ھیون تسانگ ہی کے سفرنامے کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر سپونر نے کھدائی کی اور یہ ڈبیہ دریافت کر لی تھی۔

میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ چند ایسے چینی سیاحوں کا ذکر کروں گا جن کے سفرناموں نے پشاور کو عظیم تاریخی اور ثقافتی شہر بتایا ہو۔ مندرجہ بالا سیاح وہ ہیں جنہوں نے پشاور کے قدیم ترین مقام شاہ جی دیاں ٹیریاں بیرون گنج دروازہ اور کورو پانڈوں کی یادگار پنج تیرتھ کے علاوہ دوسرے کئی ایسے مقامات دریافت کیے کہ ان میں سے کوئی ایک مقام بھی پشاور کی قدامت کے لیے کافی ہے اور یہ کام یا کارنامہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے لیے ماضی میں چینی سیاح سرانجام دے رہے ہیں۔

بقیہ:

عشق بلاخیز

اور صرف دلوں کی دھڑکنیں اور خالقِ اکبر کے پاک فرشتوں کے پروں کی سرسراہٹ زندگی کی علامت تھی:

فلک نشیں سہی مرا خدا مگر محسنؔ
کبھی کبھی وہ زمیں پر اتر بھی آتا ہے

امجد سردیوں میں پشاور ضرور جاتا ہے اور معمول کے مطابق صبح صبح کمبل اوڑھ کر شہر کی گلیوں کی راہ لیتا ہے جو بے نام ہیں، یہاں مکان بوسیدہ ہیں۔ یہاں ہنرمند لوگ بستے ہیں جن کے مکان چھوٹے ہیں جن کی گلیاں تنگ ہیں اور جن کے دل فراخ ہیں اور جن کی آنکھوں میں مروت اور جن کے دروازے وا ہیں۔ یا وہ فصیلِ شہر کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ کہیں رک کر فصیلِ شہر کی ''وزیری اینٹ'' کو محبت سے تکتا ہے اسے ڈرڈر کر چھوتا ہے۔ مسکراہٹ اس کے لبوں پر رقص کرنے لگتی ہے۔ پھر نظریں اٹھا کر اوپر برج کو دیکھتا ہے اور بڑبڑاتا ہے ''یہ گنج دروازہ ہے آگے یکہ توت دروازہ آئے گا اور پھر کوہاٹی'' وہ فصیلِ شہر کے تصور سے سرشار ہو جاتا ہے۔ ایک بار پھر فصیلِ شہر کو محبت سے دیکھتا ہے اور اپنے گرد کمبل اچھی طرح لپیٹ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ نہ جانے وہ ان راستوں سے کتنی بار گزر چکا ہے اور نہ جانے کیسے وہ ہر بار اپنی نظر سے ان بوسیدہ در و دیوار میں خوابیدہ نقش کیسے تلاش کر لیتا ہے:

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

درِ مکتب

ڈاکٹر اعجاز راہی

(●)

اس وقت جس شخصیت کی تخلیق پر مجھے اپنے تاثرات رقم کرنا ہیں وہ بظاہر تو انسان کے جامے میں نظر آتے ہیں مگر کارہائے نمایاں اُنھوں نے مافوق الہستیوں سے کہیں بڑھ کر انجام دیئے ہیں۔ کوئی ہماری، آپ کی طرح گوشت پوست کا انسان ایک وقت میں نہ اتنے کارہائے نمایاں انجام دے سکتا ہے اور نہ اس قدر مصروف رہ کر بزرگانہ عمر میں نوجوانوں کی طرح چاک و چوبند اور متحرک نظر آ سکتا ہے۔

ڈاکٹر امجد حسین کا رڈیوسرجن ہیں جو انسانی میکنزیم میں خون کی نالیوں کی مرمت یا جسم کی پھل پیریوں کی صفائی کر کے زندگی کے امکانات تابندہ کرتے ہیں۔ ایسا ہر عمل اپنے پس منظر میں ایک اساسی نوعیت کے جواز پر ایستادہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر امجد کو یہ صرف کوزہ گری آغازِ زندگی ہی میں عطا ہو گیا تھا جس کے سبب ان کے اپنے نفسیاتی میکنزم میں ایک ہمہ گیر درد بندی، تعظیم انسانیت، شعورِ حیات سے مملو جذبی کیفیات اور غیر مختتم محبت دائمی قدر بن گئی۔ شاید ان کے اسی اندازِ فکر کا نتیجہ ہے کہ ان کا پورا عصر ان کے وژن میں اور پورا ماضی ان کے باطن میں سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ چیزوں کو کرید کرید کر زندگی تراشنے کی آرزومندی ان کے پیشے کی عطا بھی ہے اور ان کی انسان دوستی کی بنیاد بھی۔ یہی طرز وارفتگی انہیں ماضی کی کرید کی طرف لے جاتی ہے اور وہ تیزی سے گھومتے ہوئے وقت کی چاک پر ماضی کی نرم مٹی سے اپنی یاد کی شکلیں بناتے چلے جاتے ہیں۔ ان انسانوں کی جن سے وہ مکتب میں ملے عمارتوں کی جہاں سے وہ گزرے، رویوں کی جن سے واسطہ پڑا، محبتوں کی جو عمر بھر سمیٹتے رہے۔ وہ اپنے معروض کی صورت گری کے لیے کبھی یاداشتی مظہر کا دامن تھام کر ماضی میں اُتر جاتے ہیں، کبھی ماورائے حیات ادراک ان کی مدد کرتا ہے۔ وہ ان کرداروں کی تلاش میں کبھی بصارت کی حدود میں رہتے ہیں اور کبھی بصیرت کی ساحرانہ فطرت سراپے کو ڈھالتی، ان کے باطن میں اتر کر ان کی پالیدہ اور ناپسندیدہ عناصر کو بعین ہی کردار کی شناخت بنا دیتے ہیں۔ وہ کردار کو عصرِ حاضر میں نہیں لاتے، قاری کو ماضی میں لے جاتے ہیں تاکہ جیسا وہ تھا ویسا نظر آئے۔ آدمی کو اگر اس کے پس منظر سے الگ کر دیا جائے تو وہ بونا آدمی رہ جاتا ہے۔ پورا تو وہ تب ہوتا ہے جب اسے اس کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے اور ڈاکٹر امجد فن کی ایک باریک بینی سے کماحقہٗ خوب واقف ہیں۔ یہ ان کی نئی تصنیف درِ مکتب کی باتیں ہیں۔

ڈاکٹر امجد حسین باتوں باتوں میں پورا شہر آرزو (یک شہر آرزو) بسا لیتے ہیں اور کبھی اس شہر کی فضیلت بڑھانے کے لیے درِ مکتب دکھائی دیتے ہیں۔ یہی شہر آرزو ان کا شوق بھی ہے اور منتہائے مقصود بھی۔ یک شہر آرزو میں وہ اپنے دوستوں جوہر میر، پروفیسر وحیدہ غفور اور ڈاکٹر ظہور احمد اعوان سے قلمی رابطہ کرتے ہیں اور پھر باتوں ہی باتوں اور یادوں ہی یادوں میں ایک شہر کی تعمیر و تشکیل نو ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کا جغرافیہ، تہذیب و تمدن، ثقافت، رہن سہن، عادات و اطوار، کمال و زوال اور وہ سب کچھ جو زندہ معاشروں میں ہوتا ہے اپنی رفعت گم گشتہ سمیت اس میں در آتا ہے۔ ''یک شہر آرزو'' اردو ادبیات میں پہلی کتاب تھی جو اس تکنیک اور اسلوب میں لکھی گئی۔

اور اب وہ ''درِ مکتب'' کے ساتھ ایک نئی تکنیک لے کر آئے ہیں۔ یہ کتاب نہ فکشن کی ہے نہ خودنوشت اور نہ ہی تاریخ۔ مگر اس میں سب کچھ موجود ہے۔ داستان کا تحیر، ناول کا تجسّس، افسانے کی رفعت، سوانح عمری کا جمال، تاریخ کا تسلسل، انشائے لطیف کی جولانی اور پیش کش کا کمال، جو اصناف اردو میں ایک نئے نام کا تقاضا کرتا ہے۔

''درِ مکتب'' میں وہ سب کچھ ہے جو مچھی ہٹہ پرائمری سکول پشاور کی بوسیدگی سے لے کر وین سٹیٹ یونیورسٹی ڈیٹرائٹ کی پُرشکوہ درسگاہوں میں تھا۔ عمارتیں، اساتذہ، طلباء، فضا، رویے، اعلیٰ ظرفی اور اخلاقی کم مائیگی اپنی تمام پر جزئیات اور نفسیاتی صداقتوں کے ساتھ پروجیکٹر پر چلتی فلم کی طرح باری باری ماضی کے تنکنائے سے سامنے آتے اور درِ مکتب میں سج جاتے ہیں۔

ڈاکٹر امجد حسین نے اپنے شہر آرزو کے سامنے Unconditional submission کی ہے پھر یوں بھی عشق کے سودے کسی شرط کے متحمل نہیں ہوتے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر امجد حسین کارڈیوسرجن نہ ہوتے اور انہیں باطن میں جھانکنے کا موقع نہ ملتا تو وہ کیا کرتے؟ میرا خیال ہے وہ تب بھی شہر آرزو تلاشتے، کریدتے، سنوارتے اور ماضی کی ثروت کے ساتھ اپنی کتابوں میں بسا لیتے۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ان کی وارفتگی انہیں جسموں کی کرید اور ان میں زندگی تلاشنے سے یک شہر آرزو اور درِ مکتب تک لے آئی، یا گم گشتہ تہذیب کی تلاش کے تجسّس نے انہیں سرجری تک پہنچایا شاید ان دونوں کاموں کے لیے دنیا میں آئے تھے۔ اس چشمہ شعور نے انہیں روشنی اور زندگی کی جس رداسے ہم آمیز کیا وہ مدام مشعل راہ رہیں گے، کہ ایک تخلیق کار کی خواہش اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے۔ میں اپنی گذارشات یارِ عزیز جوہر میر کے شعر پر ختم کرنا چاہتا ہوں شاید یہ شعر جوہر میر مرحوم نے ڈاکٹر امجد کی شخصیت کو سامنے رکھتے ہوئے کہا ہو:

اس کے خیال سے کوئی اچھا نہیں خیال
میرے لیے وہ مجھ سے زیادہ آدمی

''رو میں ہے رخشِ عمر''

ڈاکٹر سید امجد حسین

۲۸ر جولائی ۱۹۹۶ء،
کائی لاس پہاڑی سلسلہ
تبت

صحیح مقام کا تعین تو نہیں کر سکتا لیکن ہم کوہ کائی لاس کے پہاڑی سلسلوں میں کیمپ کئے ہوئے ہیں آج ہمارا تبت کے سفر کا آٹھواں دن ہے اس دوران میں ہم نے کھٹمنڈو سے بذریعہ جیپ پانچ دن سفر کیا پہلے ڈیڑھ دن میں کھٹمنڈو سے جو چار ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے ہم نائی لم Nylam پہنچے جو پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے اور راستے میں ہم نے سترہ ہزار فٹ بلند درہ کراس کیا اگلے دو دن ہم سب Acute Mountain Sickness میں مبتلا رہے جب انسان اتنی جلدی اس قدر بلندی پر آ جائے تو جسم احتجاج کرتا ہے سر درد، متلی، سانس کی تکلیف اور کبھی کبھار پھیپھڑوں میں پانی بھر جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک دو دنوں میں ہم بلندی کے عادی ہو گئے اس کے لیے دواؤں کا سہارا بھی لینا پڑا۔

ماؤنٹ کائی لاس بائیس ہزار فٹ بلند پہاڑ ہے جو سال کے بارہ مہینے برف سے ڈھکا رہتا ہے بدھ مت اور ہندو مذہب کے ماننے والوں کے لئے یہ پہاڑ بہت مقدس ہے لوگ دور دور سے اس کے طواف کے لیے آتے ہیں طواف بھی کیا! طواف یہ نہیں کہ چھوٹی سی پہاڑی کے گرد گھوم لیے یہ طواف دشوار گذار دروں اور ناہموار پگڈنڈیوں پر چل کر کیا جاتا ہے ایک درہ اٹھارہ ہزار فٹ بلند ہے طواف کا فاصلہ بتیس (۳۲) میل ہے اور اکثر زائرین یہ تین چار دن میں پورا کرتے ہیں جو لوگ اس بلندی کے عادی ہیں وہ یہ طواف سولہ اٹھارہ گھنٹے میں کر لیتے ہیں۔ میں نے ایک بدھ بھکشو کو دیکھا کہ وہ یہ طواف پیٹ کے بل چل کر کر رہا تھا وہ کھڑا ہوتا تھا پھر پیٹ کے بل لیٹ جاتا تھا پھر اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور دو قدم چل کر اس مقام پر پہنچتا تھا جس جگہ اس کے ہاتھ پہنچے تھے اس طرح وہ لیٹ کر اور دو دو قدم چل کر طواف کر رہا تھا یہ عقیدت کی حد ہے۔

ہم گذشتہ تین دن سے کائی لاس کی پہاڑیوں میں سفر کر رہے ہیں پہلا دن تو اسی راستے پر گذرا جو زائرین طواف کے لیے استعمال کرتے ہیں جونہی ہم کائی لاس پہاڑ شمال میں پہنچے ہم نے راستہ جدا کر لیا یہ راستہ شمال کی طرف جاتا ہے اور چند بلند دروں میں سے ہوتا ہوا ان وادیوں میں جا اترتا ہے جو دریائے سندھ کی جنم بھومی ہیں آج ہم نے سب سے بلند درہ کراس کرنا ہے یہ اٹھارہ ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔

ہم یہ سفر ایک کاروان یا قافلے کی صورت میں کر رہے ہیں ہمارا سامان (خیمے خورد و نوش کا سامان ذاتی استعمال کا سامان وغیرہ) کوئی تیرہ یاکس (Yaks) پر لادا جاتا ہے باقی چھ یاکس ہماری ٹیم کے چھ ممبروں کی سواری کے لیے ہیں ہمارا سٹاف جو پانچ افراد پر مشتمل ہے پیدل سفر کرتا ہے یہ لوگ اس اونچائی پر پیدل سفر کرنے کی عادی ہیں۔

یاک بھی عجیب جانور ہے یہ بھینسا نما چوپایہ چودہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر پایا جاتا ہے ان پہاڑی علاقوں کے لوگ یہ جانور پالتے ہیں اور ان سے بار برداری اور خوراک کا کام لیتے ہیں اس کی اون سے کپڑے بنتے ہیں گوشت اور دودھ استعمال کرتے ہیں یاک کی سواری بھی منفرد ہے اس کی پشت پر بیٹھ کر سفر کرتے ہیں نہ تو باگ ہوتی ہے اور نہ رکاب اس لئے یہ جانور سوار کی ضرورت سے بے نیاز اپنی مرضی سے جیسے چاہیں جہاں چاہیں قدم رکھتے ہیں نہ تو آپ اسے روک سکتے ہیں اور نہ اسے تیز رفتاری پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ غالب نے زندگی کے گھوڑے کے متعلق یہ شعر کہا تھا اس کا اطلاق یاک پر بھی ہوتا ہے:

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
(رخشِ عمر کو یاک سندھ میں بدل دیں)

چند بار پہاڑی ندیاں کراس کرتے ہوئے میرا یاک بجائے اس کے کہ سیدھے راستے پر چلتا اور آسانی سے دوسرے کنارے پر چڑھتا اس نے ایک دشوار گذار اور قدرے عمودی راستے کا تعین کیا۔ قدرتی بات ہے کہ کشش ثقل کے اصول کے مطابق اب میرا اس جانور کی پشت پر بیٹھے رہنا ناممکن تھا میں لڑھک کر نیچے گر گیا۔

ان جانوروں میں مستی بھی ہے خواہ مخواہ انگل کرتے ہیں۔ ایک جانور آگے چل رہا ہو تو پیچھے والا خواہ مخواہ اپنا ایک سینگ اگلے والے کی لچھے دار دم کے نیچے گھونپ دے گا۔ چاہے سینگ کی نوک مطلوبہ جگہ تک نہ پہنچی ہو لیکن اگلے والا یاک بدک جاتا ہے اور دوڑ کر پیچھے والے اور اپنے درمیان فاصلہ بنا لیتا ہے یہ دیکھ کر مجھے اپنے پشاور کے چند ایسے دوست یاد آ جاتے ہیں جو راہ چلتے خواہ مخواہ ساتھ چلتے ہوئے ساتھی کو انگل دے دیتے ہیں ساتھی بدک جاتا ہے اور یہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں میں خود بھی اس حرکت کا مرتکب ہوا ہوں اکثر اوقات بدکنے والا یہ کہتا ہے کہ اپنی عزت کا تو تمہیں خیال نہیں دوسروں کی عزت کا تو خیال کرو۔

۲۹ر جولائی

کل ہم نے کائی لاس پہاڑی سلسلوں کا بلند ترین درہ Testila lachen عبور کیا درے کو عبور کرتے ہوئے ہمیں چند گھنٹے ژالہ باری اور برف

باری کے طوفان کا سامنا کرنا پڑا۔ اٹھارہ ہزار چار سو پچاس فٹ کی بلندی پر واقع یہ درہ دریائے ستلج اور دریائے سندھ کے پانیوں کو جدا کرتا ہے جس پہاڑ پر چڑھ کر ہم اوپر آئے تو ہمارے پیچھے ستلج کا واٹر شیڈ (Water Shed) تھا اور ہمارے سامنے سندھ کا۔ سندھ کی ایک شاخ یہیں سے بنتی ہے پہاڑ کے دامن اور چوٹی پر پڑے ہوئے گلیشیئر سے پانی وادی میں چھوٹی چھوٹی اور معمولی سے Puddles کی صورت میں آتا ہے اور وادی تک پہنچتے پہنچتے ایک ننھی منی سے پیاری ندی بن جاتی ہے ہم نے کل چار گھنٹے اس ندی کے ساتھ ساتھ سفر کیا اس کے ساتھ اردگرد کے پہاڑوں سے پانی چشموں اور چھوٹی چھوٹی ندیوں کی صورت میں شامل ہوتا گیا اور چار گھنٹوں کی مسافت کے بعد اب جہاں ہمارا ایک رات قیام ہے یہ اچھی خاصی ندی ہوگئی ہے اگر ہم اس ندی کے ساتھ ساتھ چلتے جائیں تو ایک آدھ دن میں بنیادی (Main) دریائے سندھ تک پہنچ جائیں گے وہاں سے ہم سندھ کے ساتھ الٹے ہاتھ چلیں گے اور سندھ میں منبع تک پہنچیں گے۔

مجھے انتہائی فکر تھی کہ ہم میں سے کوئی اس درے کو کراس کرتے ہوئے بیمار نہ ہو جائے۔ اٹھارہ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر ہم میں سے کوئی بھی اب تک نہیں گیا یہاں ہوا کا دباؤ انتہائی کم اور ہوا میں آکسیجن بھی اس حساب سے کم۔ ہم نے درے کو جتنی جلدی ہو سکا کراس کیا اور پھر ڈھلوان کی طرف اترے اب جہاں ہمارا قیام ہے وہ کوئی سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے ہم اتنی بلندی پر قیام کر چکے ہیں اس لیے زیادہ فکر نہیں۔ ویسے ہم نے ساتھ میڈیسن اور آکسیجن رکھی ہوئی تھیں چند روز پہلے میرے بڑے بیٹے وقار کو اسی بیماری Acute mountain sickness کا عارضہ لاحق ہو گیا ڈیڑھ گھنٹہ آکسیجن لینے آرام کرنے اور اس بیماری کی مخصوص دوائی کی مقدار بڑھانے سے افاقہ ہوا۔ اگر اس عارضے کا بروقت علاج نہ ہو سکے تو جان کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

سفر کے ابتدائی دنوں میں صبح ناشتہ کے وقت ہمارے باورچی نے ہمارے لیے (باقی لوازمات کے علاوہ) پورج بنایا۔ اظہر نے یاد دلایا کہ ظہور صاحب کی چوڑی بھی موجود ہے۔ خشک دودھ تو تھا لیکن مائع دودھ میسر نہ تھا۔ گرم پانی کو استعمال میں لائے چوڑی میں پانی ڈالا اور اسے مکس کر کے کھایا واللہ کیا بتاؤں انگریزی پورج ظہور صاحب کی چوڑی کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ گیا روزانہ صبح اظہر اور میں کھاتے رہے اور ظہور صاحب کو یاد کرتے رہے (باقی لوگ اس نعمت کو enjoy نہیں کر سکتے) Darchan دارچن تک تو مزے لیتے رہے اس کے بعد چونکہ ہم نے یاک کے ذریعہ سفر کرنا تھا اس لیے فالتو سامان دارچن میں چھوڑ دیا جی ہاں وہ چوڑی والا لفافہ وہیں دارچن میں پڑا ہوا ہے اب واپس جا کر اس باقی ماندہ نعمت کے مزے لیں گے چوڑی بنانے والی اور پہنچانے والے دونوں کا بہت بہت شکریہ۔

۳۰ر جولائی

کل رات جس ندی کے کنارے پر ہم نے قیام کیا وہ نقشوں کے مطابق دریائے سندھ ہے لیکن ہماری Calculation کے مطابق دریائے سندھ کا منبع شمالی پہاڑیوں کے پیچھے ہے آج ہم نے اس جگہ تک پہنچنا تھا۔

ہم صبح نو بجے روانہ ہوئے کیمپ کو یساہی چھوڑا چند شرپاز کو ساتھ لے کر چھ یاکوں پر سواری کرتے ہوئے منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔ کوئی ایک کلو میٹر کی مسافت کے بعد ایک حادثہ پیش آ گیا ایک یاک نے دوسرے یاک کے ساتھ مستی کرتے ہوئے جو اسے سینگ بھونکا تو وہ جم کے بیٹے سیموئل کی دائیں ٹانگ میں جالگا اس کی جین پھٹ گئی اور اس کی ٹانگ پر زخم آ گیا باپ بیٹا کیمپ واپس لوٹ گئے اور ہم چار آگے چلے۔

چند ایک پہاڑی سلسلے کراس کرنے کے بعد اور چند وادیاں عبور کرنے کے بعد ہم ایک وادی میں داخل ہوئے۔ ہمارے گائڈ کے کہنے کے مطابق سندھ کا منبع اسی وادی میں تھا۔ ہمارے بائیں ہاتھ شمال مغرب کی جانب وادی کی سطح کوئی آٹھ فٹ اونچی تھی اس اونچی سطح سے ایک نالہ بہہ کر وادی میں آ رہا تھا اور وادی میں واقع ندی میں شامل ہو رہا تھا (کہنا یہ چاہیے کہ ندی نالے میں شامل ہو رہی تھی) ہم اس اونچائی پر چڑھے تو کوئی ڈیڑھ میل دور ہمیں تبتی عبادتی جھنڈے نظر آئے یہی جگہ ہماری منزل مقصود تھی۔

سندھ حقیقتاً زمین کی گود میں سے نکلتا ہے۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں ایک چشمہ پھوٹتا ہے جو ایک چھوٹے سے نالے کی صورت میں اس مقام سے نیچے جاتا ہے اور اپنے ساتھ اپنے سے کئی کئی گنا بڑی ندیاں سموتا جاتا ہے بدھ مت کے نزدیک یہ متبرک مقام ہے یہاں پتھر کی سلیٹوں پر تبتی دعائیں کندہ کی ہوئی ہیں اور یہ پتھر اس چشمے کے اردگرد بکھرے ہوئے ہیں اسی پہاڑی (اسے ٹیلہ کہہ لیں) پر پتھروں سے بنے ہوئے Cairns ہیں جو پتھروں کو اوپر نیچے جوڑ کر بغیر کسی گارے یا سیمنٹ کے مخروطی شکل کے مذہبی نوعیت کے مقام ہیں چند ایک پر یاک کے سینگ بھی بکھرے ہوئے ہیں عبادتی جھنڈے نالے کے دونوں کناروں پر بانس گاڑ کر ایک تار پر لگا دیئے جاتے ہیں کچھ محض کپڑے کی دھجیاں ہیں اور کچھ کپڑے پر لکھی ہوئی دعائیں۔ نالے کا پانی ان جھنڈوں کے نیچے سے گذرتا رہتا ہے۔ تبتی روایات کے مطابق دریائے سندھ شیر کے منہ سے نکلتا ہے اسی لیے اسے شیر دریا یا The Lion River کہتے ہیں۔

(برصغیر کے تین اور مشہور دریا بھی کائی لاس کے پہاڑی سلسلوں سے نکلتے ہیں۔ جنوب سے دریائے گنگا کی اہم شاخ کرنالی نکلتی ہے جو تبتی روایت کے مطابق مور کے منہ سے نکلتی ہے۔ مشرق سے برہم پترا گھوڑے کے منہ سے نکلتا ہے اور مغرب سے ستلج ہاتھی کے منہ سے نکلتا ہے سندھ ستلج اور برہم پترا کا ایک منبع ایک دوسرے سے کوئی پچاس میل کے فاصلے پر ہے)

ہمارے گائڈ اور دارچن میں مقامی پولیس افسر کے بیان کے مطابق گذشتہ تیس پینتیس سالوں میں پہلی بار ایک بیرونی ٹیم کو دریائے سندھ کے منبع

تک جانے کا پرمٹ دیا گیا ہے اکثر لوگ صرف کائی لاس پہاڑ کا طواف کرنے آتے ہیں۔ سن اسّی کی دھائی میں ایک امریکن جان بیلیزا (John Belleza) بغیر کسی پرمٹ یا گائیڈ کے منیع تک گیا تھا یعنی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پچھلی صدری اٹھارہ سوسات میں سیون ھیڈن نامی سویڈن کا باشندہ اس جگہ پہنچا تھا اس کے بعد پتہ نہیں چلتا کہ کون گیا اور کب گیا۔ ۱۹۵۰ء تک تبت خودمختار تھا لیکن باہر کے لوگوں کو نہیں چھوڑتا تھا کہ وہ تبت میں داخل ہوں۔ اس کے بعد چین نے قبضہ کر لیا اور تبت بالکل بند ہو گیا اب گزشتہ دس پندرہ سالوں سے ہندوؤں اور بدھ مت کے ماننے والوں کے لیے ماؤنٹ کائی لاس کے طواف کی اجازت ملی ہے اور اس طرح تبت کھل گیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق تبت آنے والے زائرین ماؤنٹ کائی لاس سے آگے نہیں جاسکتے۔

اب آتا ہوں ایک انتہائی دلچسپ Dichotomy کی طرف۔ پشاور میں مشرق اخبار نے ایک پریس کانفرنس کا بندوبست کیا تھا میں نے مختصراً ٹیم کا اور انڈس کی پچھلی مہمات کا تعارف کرایا سوالات کے وقفہ میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ کی اس مہم سے پاکستان اور پاکستان کے عوام کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ میں نے دانستہ اس سوال کا جواب نہ دیا اب میں اس ان پڑھ، پڑھے لکھے کو کیسے سمجھاتا کہ اس قسم کی مہمات سے ملک کا نام روشن ہوتا ہے کیا یہ فخر کی بات نہیں کہ ہم صرف کرپشن کے معاملے میں ہی دنیا میں نمبر دو نہیں اس قسم کے مہم جوئی کے مقابلے میں نمبر ایک ہیں۔

کیا اڈمنڈ ھلری سے کسی اخبار نویس نے سوال کیا تھا کہ حضور آپ نے جو ایورسٹ فتح کیا ہے اس سے نیوزی لینڈ کو کیا فائدہ پہنچا؟ اب بات ایک نوحہ گر کو ساتھ رکھنے تک آ گئی ہے غالب کے اس شعر کا اطلاق میری ذہنی کیفیت پر ہوتا ہے:

حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

اگر اس پڑھے لکھے ان پڑھ نے ہمارا بروشر پڑھ لیا ہوتا (جو ان کو مہیا کر دیا گیا تھا) تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس قسم کا بچگانہ سوال نہ کرتا حقیقت یہ ہے کہ دریائے سندھ کے بڑی حد تک ایک پاکستانی دریا ہونے کے باوجود اب تک کسی پاکستانی نے (بلکہ یہ کہ کسی غیر سفید فام شخص نے) سندھ کے منیع تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی اور جو سفید فام اب تک وہاں گئے ہیں ان کا شمار ایک ہاتھ کی انگلیوں پر ہوسکتا ہے بلکہ نصف ہاتھ کی انگلیوں پر۔

اب ہم واپسی کے راستے پر ہیں ان جانوروں سے کل شام چھٹکارا ملے گا جب ہم دارچن پہنچیں گے۔ ہم سب دارچن پہنچنے کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں کہ ان جانوروں کی پیٹھ پر مزید سواری سے چھٹی ملے گی۔ آپ نے کبھی بھینس کی سواری کی ہے؟ پشت کی ہڈی سے ٹانگوں کی رگوں پر زور پڑنے سے ٹانگیں سو جاتی ہیں بعینہٖ اسی طرح جیسے بائیسکل کے ڈنڈے پر سواری کرنے سے ان جانوروں پر تو دونوں ٹانگیں ایک طرف کر کے سواری نہیں کی جاسکتی اب صورت یہ ہو جاتی ہے کہ ایک آٹھ کے ہندسے پر دوسرے آٹھ کے ہندسے کو سوار کرا دیا جائے۔ نچلے والا آٹھ اوپر والے آٹھ سے بے نیاز اپنی چال چلتا رہتا ہے ایک قدم میں یہ ہندسہ دائیں سے بائیں اور نیچے سے اوپر ہوتا ہے۔ ضروری بات ہے کہ اوپر سواری کرنے والے کا جسم بھی یہی حرکت (حرکتیں نہیں) کرتا رہتا ہے نتیجہ گھنٹہ ڈیڑھ کے بعد ریڑھ کی ہڈی کے نچلے سرے سے لے کر جسم کے اس عضو تک جسے انگریزی میں خاندانی زیورات یا جواہرات (Family Jewels) کہتے ہیں سب کچھ اس چکی میں پس جاتے ہیں ذہن میں خیال آتا ہے کہ اگلے وقتوں میں لوگ خواہ مخواہ جراحی کے ذریعے خواجہ سرا بناتے تھے یاک پر چند دن سواری کرا دیتے تو اگلا پچھلا بھول جاتا۔ میرے بھانجے اظہر علی شاہ کا کہنا ہے کہ یاک پر ہفتہ بھر سواری کرنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ آدمی کا پچھواڑہ عرصہ دراز سے غیر فطری کاموں میں مصروف رہا ہو مجھے تو پشاور سے نکلے عرصہ (بلکہ عرصۂ دراز) ہو گیا ہے اظہر ٹھیک ہی کہتا ہوگا میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

۴/اگست

اب ہم واپسی کے سفر پر ہیں ہوا میں آکسیجن کی کمی کبھی کبھی محسوس ہو جاتی ہے حالانکہ ہم اب پوری طرح acclimitize ہو چکے ہیں۔ آپ کو بتاتا چلوں کہ میں سحر خیز ہوں کل چھ بجے میری آنکھ کھلی (یہاں سورج ساڑھے سات آٹھ کے لگ بھگ نکلتا ہے) ہمارا خیمہ ایک ننھا منا سا گنبد نما خیمہ ہے جس میں دو آدمیوں کے سونے کی گنجائش ہے۔ سلیپنگ بیگ میں ملفوف میں نے جو خیمے کے گنبد کی طرف دیکھا تو مجھے گولائی پر قرآنی آیات لکھی نظر آئیں اسی طرح جس طرح مہابت خان صاحب کی مسجد کے گنبد کے اندر آیات لکھی ہوئی ہیں آنکھیں موند کر دوبارہ کھولیں تو وہی سماں۔ اب سلیپنگ بیگ نے بھی کفن کی کیفیت پیدا کر دی۔ چت لیٹا ہوا تھا پاؤں کی انگلیاں تو ہلا سکتا تھا لیکن سلیپنگ بیگ کے لفافے میں حرکت ممکن نہ تھی لمبے لمبے سانس لئے دماغ کو آکسیجن پہنچائی تو تھوڑی دیر کے بعد وہ آیتیں وہاں سے غائب ہو گئیں بیگ میں سے ایک ہاتھ نکالا۔ بیڑی جلائی اور گنبد کو اچھی طرح دیکھا واقعی وہاں آیتوں کا کوئی نشان نہیں تھا۔ باقی Setting تو موجود تھی اگر دو منکر نکیر بھی نظر آ جاتے تو اس ڈرامے کے کردار مکمل ہو جاتے ہیں خود تو اس کیفیت میں تھا ہی۔ اظہر کو بھی ساتھ لے لیتا (اظہر میرے خیمے کا ساتھی ہے)۔

اس کی سائنسی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہوا میں آکسیجن کی کمی تو ہے ہی خیمے کی بند ہوا میں مزید آکسیجن بھی ہمارے سانس لینے سے کم ہو جاتی ہے پردے بند ہونے کی وجہ سے باہر کی ہوا اتنی آسانی سے اندر نہیں آسکتی اس لیے نیم خوابی کی کیفیت میں انسان عجیب عجیب کرتب دیکھتا رہتا ہے۔ سترہ اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر یہ حال ہے تو اندازہ کریں جو لوگ کے ٹو یا ایورسٹ یا اسی قسم کی چوٹیاں سر کرتے ہیں وہاں ستائیس اٹھائیس ہزار فٹ کی بلندی پر ان کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ وہ تو ہر گھاٹی اور ہر چوٹی پر اپنے صحیفے دیکھتے ہوں گے۔

باقی صفحہ ۵۲ پر ملاحظہ کیجیے

''تم میرے پاس ہوتے ہو گویا''

سید امجد حسین

انگریزی سے ترجمہ

ابوحماد

۲۰ اپریل ۲۰۰۷ء

پیاری ڈاٹی

آج ہماری شادی کی انتالیسویں سالگرہ تھی مگر اپنی ہمیشہ کی طرح بھول جانے کی عادت کی وجہ سے مجھے میری بیٹی کو یاد دلانا پڑا کہ شادی کی تاریخ اٹھارہ اپریل نہیں بیس اپریل ہے۔ اہم تاریخوں کو بھول جانے کی عادت کوئی نئی نہیں، نہ ہی تمہیں اس سے کوئی حیرت ہوگی اس لئے کہ میں نے میں ماضی میں ان گنت بار ایسا کیا ہے اور اب تک تو تم اسکی عادی ہو چکی ہو۔ میں اپنی آفس منیجر بار برہ کا شکر گذار ہوں جس نے نہ صرف کئی بار مجھے ہماری شادی کی سالگرہ یاد دلائی ہے بلکہ مجھے دوسرے اہم دنوں سے بھی آگاہ رکھا ہے۔ اس نیک دل خاتون نے ہمارے درمیان ایسے معاملات کو سلجھانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس موقعہ پر میں نے اپنے بچوں کو ایک خط لکھا ہے۔ دراصل میں اپنے جذبات میں انہیں بھی شامل کرنا چاہتا تھا۔ آخر کار وہ ہماری ہی زندگی کا حصہ ہیں۔ میری خواہش تھی کہ میں انہیں بتاؤں کہ ہمارے دل میں ایک دوسرے کے لئے کتنا پیار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک باپ اپنے بچوں کو سب سے بڑا تحفہ یہی دے سکتا ہے کہ وہ انکی ماں سے بیحد پیار کرے۔ میں نے انہیں لکھا۔

میرے پیارے بچو، طاشہ، قاری اور مانی

اٹھارہ اپریل نزدیک ہے۔ ہم اس دن اپنی شادی کی انتالیسویں سالگرہ منائیں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کل کی بات ہے کہ ۱۹۶۷ء کے موسم سرما میں تمہاری ماں اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم ہمیشہ کے لئے شادی کے بندھن میں بندھ جائیں۔ میں جولائی ۱۹۶۸ء میں ٹولیڈو چھوڑ کر ڈیٹرائٹ جا رہا تھا مجھے وہاں وین اسٹیٹ یونیورسٹی میں ریزیڈنسی (پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ) شروع کرنی تھی۔ تمہاری ماں کا خیال تھا کہ اگر میں ایک دفعہ یہ شہر چھوڑ گیا تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھونگا۔ میرا خیال ہے کہ شاید وہ اس وقت مجھے اچھی طرح نہیں جانتی تھی۔ ہم ''مامی'' میں اسکے اپارٹمینٹ کے سامنے مشی گن ایونیو پر بڑی شاہراہ کے پل کے ساتھ ساتھ ٹہل رہے تھے۔ اس شام، اس لمحے کی چہل قدمی اور ہماری باہمی گفتگو نے ہمارے مقدر کو آئندہ اڑتیس سال کے لئے ایک بندھن میں باندھ دیا۔ میرے لئے یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس میں مجھے آئندہ آنے والی زندگی میں خوشگوار اور ناخوشگوار، ہر قسم کے لمحات کو خوش دلی سے گذارنا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسا وقت بھی آیا کہ کبھی کبھی یہ سب دشوار معلوم ہوتا تھا مگر یہ اہم ہے کہ ہم اپنے اس نصب العین سے کبھی دور نہیں ہٹے کہ ہمیں ایک دوسرے کو سہارا دینا ہے اور ہمارے لئے اپنے تینوں بچوں کا خیال سب سے مقدم ہے۔ تمہاری ماں کی بیماری نے مجھے اسے مزید جاننے کا موقعہ دیا۔ وہ ایسی ہستی تھی جو صرف دینا جانتی تھی اور اسکے جواب میں کچھ نہیں چاہتی تھی ہم دونوں اسکی بیماری میں ایک اذیت ناک دور سے گزرے۔ کبھی کبھی وہ اس کو خوش دلی سے سہتی تھی مگر کبھی کبھی وہ ایسا نہیں کر پاتی تھی مگر پھر بھی اسنے دنیا کے اور خاص طور سے تم تینوں کے سامنے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے رکھی۔ وہ اپنی تکلیف صرف مجھ پر ظاہر کرتی تھی بلکہ کبھی کبھی تو مجھ سے بھی چھپائے رکھتی تھی۔ اف!! کبھی کبھی مجھے کیسا خیال آتا تھا کہ اسکی بیماری اسکی ساری تکلیفیں میں اپنے سر لے لوں۔ مگر افسوس ایسا ممکن نہ تھا۔

ہمارا رشتہ یکتا اور بے مثال تھا۔ وہ میرے کنبے یعنی اپنے سسرالی رشتہ داروں کا خاص خیال رکھتی تھی اور میں اسے بار بار بتاتا تھا کہ میں اس سلسلے میں اسکی کس قدر کرتا ہوں۔ میں بھی اسکے کنبے کو بڑی عزت اور پیار دیتا تھا۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں اسکے والدین اور اسکے بہن بھائیوں کو کتنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے ڈاٹی اور اپنی محبت کی داستان، اپنی باہمی زندگی پر حیرت ہوتی تھی۔ یہ دو ایسے افراد کی کہانی ہے جن کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں تھی سوائے اسکے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، انکے درمیان محبت کا اٹوٹ رشتہ تھا اور وہ اپنے بچوں کے لئے مخلص تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے نے قناعت کے ساتھ ایک کامیاب زندگی گزاری بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ایک خوبصورت اور خوشیوں بھری زندگی گزاری۔ مجھے بھی تم سب کی طرح اسکی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ میں اس کا شکر گزار ہوں کہ اللہ تعالی نے مجھے تم جیسے تین بچے عطا کئے۔ تم دراصل ایک طرح سے اسکی یادگار، اسکی شبیہ ہو اور تمہیں دیکھ کر مجھے خیال آتا ہے کہ وہ کتنی اچھی اور کیسی بے مثال تھی۔

میری ڈھیر ساری محبتوں کے ساتھ

تمہارا ''ڈیڈ''

ڈاٹی! میں کچھ دنوں سے اس تصور کو، کہ موت کے بعد بھی زندگی ہے، نہ صرف سوچ رہا ہوں بلکہ میں اس موضوع پر کتابیں بھی پڑھ رہا ہوں۔ میں اسے سمجھ نے اسکی گہرائی میں جانے کی بھی کوشش کر رہا ہوں۔ دنیا کے ہر مذہب نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مرنے کے بعد بھی زندگی ہے اور ہر مذہب نے اسے اپنے عقیدے کے مطابق رنگ دیا ہے۔ یہ سوال اٹھتے ہیں کہ ایک بھرپور اور مطمئن زندگی کیا ہے، سزا اور جزا کا کیا تصور ہے؟ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ زندگی کا کیا مطلب ہے؟ اس قسم کے فلسفیانہ سوالات انسان کو الجھا دیتے ہیں۔ وہ انکے جوابات کبھی مذہب اور کبھی فلسفے میں تلاش کرتا

ہے۔وہ لوگ خوش اور اطمنان سے ہیں جو زندگی کو ''جیسی ہے'' کے طور پر قبول کرتے ہیں اور زندگی میں انہیں جو بھی ملتا ہے وہ اسی کے شکر گزار ہوتے ہیں ۔یہ لوگ ہوشیار اور عقلمند ہیں اس لئے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ دراصل اسکے علاوہ انکے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں۔

ڈاٹی۔میں اب بھی تمہارے وجود کو محسوس کرتا ہوں۔اگر میں یہ کہوں کہ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ تم اس بستر سے ابھی ابھی اٹھ کر گئی ہو، کہ بستر کے تمہاری جانب چادر پر ایسے نشان ہوتے ہیں کہ جیسے ابھی ابھی یہاں سے کوئی اٹھ کر گیا ہو، شاید لوگ سمجھیں کہ میرا ذہن مجھے دھوکا دے رہا ہے یا میرا تصور مجھے جاگتے میں خواب دکھا رہا ہے۔مگر میں قسم کھاتا ہوں کہ مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

میں نے اپنے گزشتہ خط میں تمہیں لکھا تھا کہ مجھے نامانوس آوازیں سنائی دیتی ہیں ۔کل رات مجھے بالائی منزل پر کھٹ کھٹ کی آوازیں آئیں۔میں نیچے اپنی نشست گاہ میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ مجھے ایسی آواز آئی جیسے کوئی اوپر کی خواب گاہ میں ہلکے ہلکے دستک دے رہا ہو۔حیرت کی بات یہ ہے کہ ماضی میں ایسی آوازیں آتیں تو شاید میں کچھ پریشان ہو جاتا مگر اب جب یہ آوازیں آتی ہیں تو مجھے کوئی تشویش یا گھبراہٹ نہیں ہوتی۔میں نے انہیں قبول کر لیا ہے مجھے معلوم ہے کہ ان کی کوئی توجیہ ہے۔اب میرے چہرے پر ان آوازوں کو سن کر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے مجھے لگتا ہے کہ یہ دوسری ''دنیا'' کی طرف سے آنے والی محبت بھری دستک ہے۔

ڈاٹی۔میری پیاری۔کیا تم مجھے کوئی پیغام دینا چاہتی ہو؟؟

پچھلے ہفتے میں نے یونیورسٹی آف ٹولیڈو کے ایک سمپوزیم کے دوران مذہب، فلسفے اور طب کے موضوع پر ایک تقریر کی تھی۔موضوع تقریر دلچسپ تھا کہ '' کیا دعاؤں سے یقینی ہونے والے انجام کو بدلا جاسکتا ہے؟'' قدرتی طور پر میں نے اپنے تجربے کی روشنی میں اس پر اظہار خیال کیا۔میرا خیال ہے کہ یقینی طور پر جو ہونا ہے اسے بدلا نہیں جاسکتا چاہے کتنا ہی گڑگڑا کر شدت اور خلوص دل سے دعائیں کی جائیں۔کیا تمہیں یاد ہے جب میں حج کرنے مکہ معظمی گیا ہوا تھا اور تم نے مجھے ہمارے دوست عطیہ اور محبوب کا پیغام دیا تھا کہ میں انکی ننھی بچی کی صحت یابی کے لئے، جسے دماغ کا سرطان ہو گیا تھا، خاص دعائیں کروں؟ میں نے دعا کی مگر جو ہونا تھا وہی ہوا۔میرا خیال ہے کہ جب خدا کے قانون کے تحت حالات گردش میں آجاتے ہیں تو پھر وہ خود بھی انہیں نہیں روک پاتا کیونکہ یہی قانون قدرت ہے ۔پانچ سال پہلے تمہارے زیرین پیٹ کے اندر ''اووری'' میں جو اس وقت بظاہر ایک بے ضرر اور اولین مرحلے کا سرطان شروع ہوا تھا اس کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ ''کیموتھیراپی'' کی وجہ سے اس میں کوئی فرق پڑا۔آخر کار جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔اگر ہم علاج نہ بھی کرتے تو بھی شاید کوئی فرق نہ پڑتا۔''اگر ایسا ہوتا اگر ویسا ہوتا!'' میں ایسے خیالات میں الجھ جاتا ہوں پھر کوشش کرتا ہوں ایسا سوچوں ہی نہیں۔جب مذہب کی روحانی اعتقادات کا طبی سائینس کی مادی اور ٹھوس حقیقتوں سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو انسان اس سے بچ نہیں سکتا کہ اسے ایسے شک وشبہات گھیر لیں اور وہ ایسے گرد وغبار کی دھند میں کھو جائے جو ان گنت شکوک اپنے ساتھ لیکر آتی ہے۔

آج صبح ڈاکٹر ''بین پینسکی'' علم الابدان و تشریح کا اعزازی پروفیسر، کچھ دیر کو میرے آفس میں آیا۔یہ باوقار اور بھاری بھرکم شخص دو سال پہلے اپنی شریک حیات سے کینسر کے ہاتھوں جدا ہو چکا ہے۔ان کا پچاس سال کا ساتھ تھا اور تشخیص کے بعد مرض اس تیزی سے پھیلا کہ ایک ہی ماہ بعد اسکی بیوی کا انتقال ہو گیا۔وہ اب تک حیران و پریشان ہے اور اسکو بھی ایسے لاتعداد شکوک اور شبہات گھیرے رکھتے ہیں جن کا سامنا ہر اس فرد کو ہوتا ہے جو اپنی رفیق حیات سے جدا ہو جاتا ہے۔ہم نے کچھ دیر باتیں کیں، ہمیں اسکا احساس تھا کہ ہماری کہانی مشترک ہے۔وہ ایک مثالی انسان ہے۔اس نے آدھی درجن بچوں کے لئے کتابیں لکھی ہیں اور علم تشریح پر ایک ایسی نصابی کتاب لکھی ہے جس کے انگریزی میں چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ کئی دوسری زبانوں میں بھی شائع ہو چکی ہے۔تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں ایسے لوگوں سے ہمیشہ متاثر ہوتا ہوں اور انکی دل سے قدر کرتا ہوں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں ''دوسری دنیا'' سے آنے والی آوازوں، آہٹوں اور دستکوں کا تذکرہ کر رہا تھا۔ہمارے ''طب اور فلسفہ'' کے سیمینار کے دوران میں نے مختصراً مشہور زمانہ ماہر نفسیات الزبتھ کبلر روس، جس نے ۱۹۶۹ء میں ''موت اور موت کے مرحلے سے گذرنے کے تجربات'' پر اہم ترین کام کیا تھا، کا بھی ذکر کیا۔اپنے بعد کے سالوں میں اس نے ''حیات بعد الممات'' پر بھی اپنے تجربات کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔اس نے اس بات کا بھی دعوہ کیا تھا کہ وہ مرے ہوئے لوگوں سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔کیا وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی یا پھر وہ اتفاقاً ایسی حدود میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی جو اب تک گمنام تھیں اور جنہیں اب تک دریافت کرنے میں انسان ناکام رہا ہے۔

کیا ایسا ممکن ہے کہ انسان اس دنیا سے دوسری دنیا میں جا کر کسی طرح واپس آسکے اور اپنے تجربات شیئر کر سکے جیسا کہ کرسٹر ریوز نے فلم somewher in time میں کیا تھا۔

چند ہفتے پہلے میں ڈاکٹر منیب الرحمٰن سے ملنے ''این آربر'' گیا تھا۔تمہیں یاد ہوگا کہ وہ اپنی سوِس (swiss) بیوی زیبا کے ساتھ کئی دفعہ ہمارے یہاں آئے تھے۔وہ ماہر لسانیات ہیں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سترہ سال تک درس وتدریس میں مصروف رہے ہیں۔انکی بیوی کا دو سال پہلے انتقال ہو گیا۔ان دونوں کی پچاس سالہ رفاقت تھی اسکے انتقال کی وجہ سے وہ ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔وہ اپنی بینائی کھو چکے ہیں مگر پھر بھی وہ اپنا کام چلا لیتے ہیں۔دراصل انہوں ہی نے اصرار کر کے مجھے کھانے پر بلایا تھا۔بینائی سے محرومی کے باوجود انہوں نے خوہی کھانا بنایا تھا۔ایسے عظیم اور علم سے بھرپور انسان سے ملنا میری روح کے لئے بالیدگی کا سبب تھا۔اس ملاقات نے مجھے بہت سہارا دیا۔خاص طور سے انکی شاعری نے جو کچھ رومانوی، کچھ گزرے وقت کی یادوں اور کچھ اندرونی درد کے

اظہار پر مشتمل تھی، نے میرے دل پر بیحد اثر کیا۔ انکی ایک نظم جو انہوں نے اپنی بیوی کی جدائی میں لکھی ہے اسکا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

اجنبی راستہ، منزل گمنام
ہاتھ تھامے ہوں کہ جانے سے تجھے روک سکوں
آہ لیکن مری کوشش ناکام
دل مسلسل یہ کہے جاتا ہے
رات تاریک ہے، مت جامت جا
جسم وجاں تیرے لیے ترسیں گے
دکھ کے آنسو مری آنکھوں سے سدا برسیں گے
کون اٹھائے گا غموں کا انبار
میں بھی مجبور ہوں، تو بھی مجبور
بے ساعت ہے محبت کی پکار
کتنی بے مہر ہے، کتنی بے نور
یہ شب تیرہ تار

ڈاٹی۔۔۔کس قدر سچ، کس قدر حسب حال اور کیسی حقیقت سے قریب
ہمیشہ کی طرح۔۔۔تمہارا اور صرف تمہارا۔

امجد

- بقیہ -

''رو میں ہے رخشِ عمر''

۱۱/اگست

ہم واپس کھٹمنڈو پہنچ چکے ہیں واپسی کا راستہ بارشوں کی وجہ سے بہت خراب تھا کئی جگہ وہ پگڈنڈی نما سڑک ٹوٹ گئی تھی ہم نے کئی جگہ سڑک کی مرمت کی پتھروں سے راستہ بنایا بارشوں سے دریاؤں میں طغیانی آ گئی تھی وہی دریا جو جاتے وقت سہولت سے عبور کیے اب مسئلہ بن گئے کئی جگہ گاڑیاں دریا میں پھنس گئیں اور بہت مشکل سے ٹرکوں کے ذریعہ نکالی گئیں ہم گاڑیوں میں محبوس بیٹھے رہے اور پانی آہستہ آہستہ گاڑی کے اندر چڑھتا گیا چند بار تو پانی سیٹوں تک پہنچ گیا بہرحال واپسی کا راستہ جیسے بھی کٹا کٹ گیا۔

(۲۴۰۰ میل کی لمبائی میں سے دریائے سندھ دو ہزار میل پاکستان کے اندر بہتا ہے باقی میں سے دو سو میل لداخ میں اور دو سو میل تبت میں)

○

''شہر ہزار جلوہ''

میں جب پہلی مرتبہ پشاور سے روم گیا تو وہاں قیام کے دوران ایک غزل کہی جس کا ایک شعر یہ تھا:

روم کا حسن بہت دامن دل کھینچتا ہے
اے مرے شہر پشاور تیری یاد آئی بہت

یوں تو اس عروس البلاد سے جس کی جتنی بھی نسبت رہی ہے وہ اس کا حسب تعلق دیوانہ رہا اور اس کے پیرہن خیال میں اس کی خوشبو رچی بسی رہی لیکن اس شہر ہزار جلوہ کے بے شمار عشاق ہیں میں دو تین ایسے دیوانوں کو بھی جانتا ہوں جو بجائے خود اہل دنیا کے لیے محبوب نظر کا درجہ رکھتے ہیں اور وہ ہیں دلیپ کمار (یوسف خان) راج کپور اور ڈاکٹر سید امجد حسین۔ دلیپ جب ملے پشاور کی باتیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ راج کپور کو پشاور کی یاد میں، میں نے روتے دیکھا ہے۔ اور امجد؟ امجد کا عشق صرف ناسٹلجیہ (Nostalgia) تک محدود نہیں بلکہ اس نے ایک تخلیق کار کی طرح اس خوشبوؤں کے شہر سے محبت کی ہے اور یہ اظہار محبت تخلیقی احساس کے ساتھ کیا ہے۔ وہ دیارِ غیر میں بیٹھ کر اس محبوبہ کے لیے صرف آنسو ہی نہیں بہاتا رہا بلکہ اس نے اس چاہت کی تعمیری صورت گری بھی کی ہے اور اس کا ایک مظہر ''یک شہر آرزو'' بھی ہے۔ اسی زنجیرِ رفاقت کی دوسری کڑی ڈاکٹر امجد کی نئی کاوش ''عالم میں انتخاب۔۔۔پشاور'' ہے۔ جس میں پشاور کے تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی منظر نامہ ابھارنے کی دل پذیر کاوش کی گئی ہے عموماً یہ کام ''کلے بندے دا'' نہیں ہوتا کہ بعض موضوعات اپنے وزن کے اعتبار سے صرف بڑے ادارے یا اکادمیاں ہی کر سکتی ہیں مگر امجد کا عشق:

''۔۔۔بدرش می کشد ایں ہمہ کو ہسار را''

احمد فراز

''نبوت کا گلشن''

نعت

نوازش کا گلشن عنایت کا گلشن — کِھلایا نبی ﷺ نے محبت کا گلشن
قیامت تلک خوشبوئے مصطفےٰ سے — مہکتا رہے گا نبوّت کا گلشن
محمد ﷺ کے آتے ہی سارے عرب میں — لگا لہلہانے اخوّت کا گلشن
اُسی ذاتِ اقدس کی خوشبو سے مہکا — صداقت، عدالت، امامت کا گلشن
یقیں ہے شفیع الورا روز محشر — کھلائیں گے اپنی شفاعت کا گلشن
معطّر کیا آپ ﷺ نے ہر بشر کو — اُگا کر جہاں میں ہدایت کا گلشن
نشیمن وہاں ہم بنائیں گے صابرؔ — جہاں مسکراتا ہے رحمت کا گلشن

صابرؔ عظیم آبادی

(کراچی)

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

ہیں جہاں سارے شاہ وگدا مطمئن ، رونقِ کائناتِ خدا مطمئن
وہ حسیں جلوہ گاہِ رسولِ امم ، ہے برستا جہاں پر کرم ہی کرم
اب مصائب کا کھٹکا نہیں ہے مجھے، اب بلاؤں کا دھڑکا نہیں ہے مجھے
علم ودانش کا منبع وہ ذاتِ حسیں، اُن کا قول وعمل بھی بہت دلنشیں
وہ جو گھبرایا پھرتا تھا چاروں طرف، وہ جو کملایا پھرتا تھا چاروں طرف
زائرینِ مدینہ سے پوچھے کوئی ، شائقینِ مدینہ سے پوچھے کوئی
کیسی تاثیر ہے ذکرِ سرکار میں ، کیسی تسکین ہے فکرِ سرکار میں
وہ انیسِ جہاں، رحمتِ بے کراں، جن کا دربار ہے مسکنِ بے کساں

جب تصور وہاں لے گیا ہے مجھے ، ہوگئی میری فکر رسا مطمئن
ایسے ماحول کو سوچ کر ہی سہی ، کیوں نہ ہو قلبِ مضطر مرا مطمئن
اُن کی یادیں مری ہمسفر ہوگئیں ، میرا ہر اک قدم ہوگیا مطمئن
اُن کی سیرت پہ چل کے ہی رہ پائے گا، ہر زمانے کا انساں سدا مطمئن
ایسے گھبرائے کو ، ایسے کملائے کو ، شہرِ طیبہ میں دیکھا گیا مطمئن
کتنے دلکش شب وروز طیبہ کے ہیں، کس قدر ہے وہاں کی فضا مطمئن
جب بھی دل کو ستانے لگے وسوسے ، پڑھ کے صلِّ علیٰ ہوگیا مطمئن
اپنی جھولی پسارے وہاں جو گیا ، ہوگئی اُس کی ہر اِک صدا مطمئن

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

(سکھر)

غمِ حسین کے سوا

اے خیام
(کراچی)

ہنسی کی آواز سنائی دی تو فاطمہ نے ڈائری پر سے نظریں اُٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اکبر اور سکینہ، اصغر کی کسی بات پر ہنس رہے تھے اور اصغران کی ہنسی کا سبب نہ سمجھ کر منھ کھولے دونوں کو باری باری حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ فاطمہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ رینگ گئی۔ لیکن فوراً ہی اس نے اُدھر سے نظریں ہٹالیں اور پھر ڈائری کے اوراق اُلٹنے پلٹنے لگی۔

خوشیاں ہمیں راس کہاں آتی ہیں!

اسے نانی امّاں کی کہی ہوئی بات اکثر یاد آتی جو کہا کرتیں.....

''ہمارے لکھنؤ میں سوالی آواز لگاتے تھے..... اللہ تمھیں غمِ حُسین کے سوا کوئی اور غم نہ دے.....!''

اور کسی کو ہنستے مسکراتے دیکھ کر وہ بھی زیرلب یہی دہرایا کرتی۔

سال شروع ہونے سے پہلے ڈاکٹر علی رضا تحفے میں ملنے والی کئی ڈائریاں اُسے لاکر دیتے۔ فاطمہ سال بھر میں ان سب ڈائریوں کو بھر دیتی۔ ڈاکٹر علی رضا خود ڈائری نہیں لکھتے تھے، لیکن فاطمہ ان ہی کی کہی باتوں کو ڈائری میں لکھتی رہتی۔ لکھی ہوئی ڈائریوں سے ایک لمبا شیلف اس کے بیڈروم میں سجا ہوا تھا۔

ڈاکٹر علی رضا نے بس ایک بار اس سے پوچھا تھا:

''یہ آپ روزانہ ڈائری میں کیا لکھتی رہتی ہیں فاطمہ بی؟''

اس نے کہا تھا، ''بس آپ ہی کی باتیں..... میرے پاس کیا ہے کچھ لکھنے کو۔''

انھوں نے غور سے فاطمہ کو دیکھا تھا، لیکن پھر انھوں نے اس سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی کبھی اس کی ڈائری دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ان کا وہی معمول رہا۔ کھانے کی میز پر یا لان میں اس کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے وہ اسپتال کی باتیں، مریضوں سے متعلق کچھ عجیب و غریب سے واقعات، مریضوں کے لواحقین کے رویّے یا اسپتال میں اپنے کولیگ سے ہونے والی کسی گفتگو کا کوئی دلچسپ حصّہ اسے سناتے۔ فاطمہ کبھی کبھار کوئی سوال کر لیتی لیکن زیادہ تر وہ بہت توجہ سے ڈاکٹر علی رضا کی باتیں سنتی رہتی۔

شادی کے تیسرے سال جب اکبر پیدا ہوا تو لکھنے کے لیے اس کے پاس ڈاکٹر علی رضا کی باتوں کے علاوہ بھی کچھ باتیں شامل ہوگئیں۔ اور جب اکبر اسکول جانے لگا تو ڈاکٹر علی رضا نے کھانے کی میز پر اس سے کہا۔

''یاد ہے فاطمہ بی، میں نے ایک بار آپ سے پوچھا تھا کہ آپ ڈائری میں کیا لکھتی رہتی ہیں تو آپ نے جواب دیا تھا کہ بس آپ ہی کی باتیں..... میرے پاس کیا ہے کچھ لکھنے کو۔''

فاطمہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں، شاید میں نے یہی کہا تھا۔ یہ اتنی اہم بات تو نہیں تھی، آپ کو کیسے یاد رہ گئی۔''

''یہ بہت اہم بات تھی فاطمہ بی۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ آپ مجھ سے شکایت کر رہی ہیں کہ آپ کے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ بے کار وقت گزاری کرتی رہتی ہیں۔ کوئی اہم کام آپ کے سپرد نہیں۔ گھر کے کام کاج نوکر نوکرانی نمٹا لیتے ہیں، لان کی دیکھ بھال مالی کر لیتا ہے، ہفتے میں ایک یا دو دن آپ خانہ داری کے سامان لینے ڈرائیور کے ساتھ چلی جاتی ہیں اور بس..... کچھ بھی ایسا نہیں جو آپ جیسی تعلیم یافتہ خاتون کرنا چاہے اور کر کے مطمئن ہو۔''

''نہیں ڈاکٹر صاحب۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ میرے کس رویّے سے آپ نے ایسا سمجھ لیا۔ میں بالکل مطمئن اور خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوں۔ ہاں شادی کے بعد سال ڈیڑھ سال میں کافی اُکتائی اُکتائی سی رہتی تھی لیکن اکبر میاں کی پیدائش کے بعد تو خاصی مصروفیت رہنے لگی ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

ڈاکٹر علی رضا کچھ دیر خاموش رہے، پھر اس کی طرف دیکھ کر آہستہ آہستہ کہا۔

''فاطمہ بی، میں نے کچھ سوچا ہے اس بارے میں۔ ہر ہفتے جو میں غریبوں کے علاقے میں مفت علاج کے لیے کیمپ لگاتا ہوں، اس میں آپ بھی میرے ساتھ چلا کریں۔'' وہ مسکرائے، پھر بولے، ''آدھی ڈاکٹر تو آپ بن ہی چکی ہیں۔ میں مریضوں کو دیکھوں گا اور آپ ان کے لیے دوائیں تیار کر دیا کریں گی۔ میرا کچھ کام آپ بانٹ لیں گی تو میں زیادہ مریضوں کو دیکھ لیا کروں گا۔''

ڈاکٹر علی رضا نے اس کے چہرے کو دیکھا جس پر بے پناہ خوشیاں بکھر گئی تھیں۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے لیکن الفاظ کے انتخاب میں اسے دقت پیش آرہی ہے۔

انھوں نے فاطمہ کی مشکل آسان کر دی۔

''تو طے ہوا کہ آپ میرے ساتھ اس فلاحی کام میں چلا کریں گی۔ دوائیں وغیرہ آپ خود اپنے ہاتھوں سے پیک کریں گی تاکہ وہاں ڈھونڈنے میں آسانی ہو۔''

ایسا نہیں تھا کہ فاطمہ کے لیے کرنے کو کچھ نہیں تھا، گھریلو کاموں کو سپروائز کرنے کے علاوہ گھر کے ایک حصّے میں بنے ہوئے ڈاکٹر علی رضا کی ڈسپنسری کی صفائی ستھرائی وغیرہ کی دیکھ بھال، پھر اکبر کی دیکھ بھال، اسکول کے لیے تیار کرنا، اسکول چھوڑنے جانا، پھر لے کر آنا، اسے کھلانا پلانا، اس کے ساتھ

کھیلنا اور پھر اسے پڑھانا۔ پھر عزیز و اقارب سے تعلقات قائم رکھنا بھی اس کی ایک سماجی ضرورت تھی کیونکہ ڈاکٹر علی رضا اپنی مصروفیت کے سبب خاندان کے افراد، عزیز و اقارب، سماجی تقریبات اور دوست احباب سے بالکل کٹ کر رہ گئے تھے۔ لیکن وہ ڈاکٹر علی رضا کی مصروفیت دیکھتی تو اسے اپنی مصروفیت بہت کم اور معمولی محسوس ہوتی۔ ڈاکٹر علی رضا صبح اسپتال جاتے، شام کو آ کر تھوڑی دیر لان میں اس کے ساتھ چہل قدمی کرتے، اکبر کے ساتھ کھیلتے اور پھر اپنی پرائیوٹ ڈسپنسری چلے جاتے۔ ڈھائی تین گھنٹے کے بعد آتے تو فاطمہ کے ساتھ کھانا کھاتے، باتیں کرتے، پھر سو جاتے۔ اسپتال سے چھٹی کے دن وہ مفت کیمپ لگاتے، دواؤں کی کمپنیوں سے وہ غریبوں کے لیے مفت دوائیں حاصل کرتے اور کبھی اپنی جیب سے بھی دوائیں خرید کر کیمپ میں مریضوں کو مہیا کر دیتے۔

اب فاطمہ کو کیمپ والے دن کا بے صبری سے انتظار رہتا۔ دواؤں کے حصول کی ذمہ داری اس نے اپنے سر لے لی تھی۔ پورے ہفتے وہ اس کام میں منہمک رہتی اور کیمپ والے دن گتے کے ایک بڑے ڈبے میں سامان رکھ کر وہ ڈاکٹر علی رضا کی اسسٹنٹ بن کر ان کے ساتھ چلی جاتی۔

ڈاکٹر علی رضا دور دراز علاقے میں، یا شہر کے مضافات میں غریبوں کی بستیوں میں کیمپ لگاتے۔ راستے بھر دونوں میں خوب باتیں ہوتیں۔ ڈاکٹر علی رضا حسب معمول اپنے تجربے اور مشاہدے اس کے گوش گزار کرتے اور فاطمہ توجہ سے ان کی باتیں سنا کرتی۔

ایک دن وہ کہنے لگے، ''آج کل حالات بڑے خطرناک ہوتے جا رہے ہیں فاطمہ بی۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ میرے کسی کولیگ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آتا ہو۔''

''کیسا حادثہ.....؟''

''وہی.....موبائل، روپے اور گھڑی چھیننے کی واردات وغیرہ۔''

''ہاں، یہ تو اب معمول بن گیا ہے۔ روزانہ ایسی خبریں سننے کو ملتی ہیں۔'' فاطمہ نے کہا۔

''ڈاکٹر ہاشمی کے ساتھ چار مرتبہ یہ حادثہ پیش آ چکا ہے۔

''وہ تو پریشان ہو گئے ہوں گے۔''

''کہہ رہے تھے کہ اگلی بار ایسا کچھ ہوا تو وہ ان سے بھڑ جائیں گے۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ ایسا کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ وہ لوگ اسلحہ رکھتے ہیں، آپ نہتے ان سے بھڑ کر کیا کر لیں گے۔''

''بالکل درست۔ موبائل، پیسے، گھڑی کے بدلے میں جان تو بخش دی جاتی ہے۔''

دونوں میں زیادہ تر باتیں سفر کے دوران ہی ہوتیں۔ ڈاکٹر علی رضا ایک دن ہنستے ہوئے کہنے لگے۔

''مجھے پتہ چلا کہ ڈاکٹر مالک لُٹ گئے ہیں تو میں ان سے ہمدردی کرنے چلا گیا۔ میں نے کہا ڈاکٹر مالک! مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا۔ آپ نے کچھ بتایا نہیں۔ جانتی ہو کیا کہا انھوں نے، کہنے لگے یار ڈاکٹر علی رضا، اس میں بتانے کی کیا بات ہے۔ یہ تو روزانہ کا معمول ہے۔ بھئی آج ہم، کل تمھاری باری ہے۔ روزانہ ہم میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ ایسا حادثہ پیش آتا رہتا ہے۔ اس میں نہ کسی حیرت کی بات ہے نہ دہشت زدہ ہونے کی۔ آپ بغیر کسی چوں چرا کے روپے، موبائل اور گھڑی ان کے حوالے کر دیں اور جان بچا کر گھر آ جائیں۔''

فاطمہ نے تشویش کے ساتھ ڈاکٹر علی رضا کی طرف دیکھا تو وہ بولے۔

''ڈاکٹر مالک کے ساتھ ایسا تیسری بار ہوا تھا۔'' پھر کچھ دیر بعد بولے، ''شکر ہے میں اب تک بچا ہوا ہوں۔''

فاطمہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔

''بھئی آپ پریشان ہوں گی فاطمہ بی تو میں ایسی خبریں آپ کو نہیں دیا کروں گا۔''

''نہیں نہیں، میں پریشان کیوں ہوں گی۔ اگر کبھی.....کبھی ایسا ہو آپ کے ساتھ.....مزاحمت نہ کیجیے گا۔ ڈاکٹر مالک ٹھیک کہتے ہیں۔''

''ہاں، مزاحمت کا کیا سوال۔''

ایسے ہی ایک سفر کے دوران ڈاکٹر علی رضا نے کہا۔

''جانتی ہیں فاطمہ بی۔ ایک ٹریفک سگنل پر ڈاکٹر پنجوانی کو ایک موٹر سائیکل سوار ایک لفافہ پکڑا کر چلا گیا۔ وہ حیرت سے موٹر سائیکل سوار کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ حیرت کے اثر سے نکلے تو لفافہ کھولا۔ اس میں ایک پرچی تھی اور ایک.....''

''کیسی پرچی؟ اور دوسری کیا چیز تھی؟'' فاطمہ نے پوچھا۔

''پرچی میں ایک بڑی رقم کا مطالبہ تھا اور دوسری چیز تھی بندوق کی ایک گولی۔''

''یعنی.....یعنی.....رقم نہ دینے کی صورت میں.....'' فاطمہ کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔

''جی.....'' ڈاکٹر علی رضا نے کہا۔ ''حالات اتنے ہی خراب ہو چکے ہیں۔''

اس دو ڈھائی مہینے کے عرصے میں ڈاکٹر علی رضا بھی دو مرتبہ لُٹ چکے تھے۔ پہلی بار تو کئی دنوں تک دہشت زدہ سے رہے۔ دوسری بار جب وہ گھرے گئے تو انھوں نے بغیر کچھ کہے سنے اپنی گھڑی اُتار کر ان لوگوں کی طرف بڑھا دی، پھر موبائل فون دیا اور آخر میں پتلون کی جیب سے والٹ نکال کر اس میں سے ساری رقم نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا اور والٹ دکھاتے ہوئے بڑے

رسان سے بولے۔

''اس میں میرا شناختی کارڈ اور دوسری چیزیں ہیں، یہ میں رکھ رہا ہوں۔''

ان لوگوں نے کچھ نہیں کہا اور اسٹارٹ موٹر سائیکل کو گیئر میں ڈال کر فرّاٹے بھرتے ہوئے سیکنڈوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

یہ سب واقعے ڈاکٹر علی رضا نے اسے سنائے تو وہ دعائیہ انداز میں ہاتھ اُٹھا کر بولی۔

''مولا آپ کو اپنی امان میں رکھیں..... خدایا..... غمِ حسین کے سوا ہمیں کوئی اور غم نہ دیجئے گا۔''

''آپ تو پریشان ہو گئیں فاطمہ بی۔ اب ان چیزوں سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ ان کا مطالبہ پورا کر دیں، آپ کی جان بخش دی جائے گی۔ اب تو معاملہ اس سے بھی آگے بڑھ گیا ہے جو ڈاکٹر پنجوانی کے ساتھ ہوا تھا۔''

''کیا ہوا تھا..... اچھا، ہاں، رقم یا گولی.....'' فاطمہ اُلجھ کر بولی، ''لیکن اس سے آگے اب اور کیا ہوگا!''

''اب آپ کی شناخت آپ کی دشمن ہو گئی ہے۔ آپ کا مسلک، عقیدہ اور مذہب اگر ان سے مختلف ہے تو آپ کی بخشش نہیں ہو سکتی۔''

''کیا مطلب..... ہم.....'' وہ گڑبڑا گئی۔

''خود ہی سمجھ لیجیے فاطمہ بی۔ آپ تو بہت ذہین ہیں۔'' ڈاکٹر علی رضا نے کہا۔

''آپ تو مجھے ڈرا رہے ہیں۔''

''میں ڈرا نہیں رہا ہوں۔ آپ کو ہوشیار کر رہا ہوں۔ چوکنا کر رہا ہوں۔''

''لیکن ہم تو..... ہمارا تو کسی سے اختلاف نہیں۔ ہم تو سب کی فلاح کے لیے کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ کسی مسلک، کسی عقیدے، کسی مذہب کو مدنظر نہ رکھ کر.....''

''بالکل درست۔ لیکن کچھ لوگ ہمارے اس رویّے سے بالکل متاثر نہیں۔''

''نہیں، ہمارے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کرے گا۔ جب ہم سب کے لیے.....''

''چھوڑیے فاطمہ بی، آنکھیں بند کر لینے سے خطرہ ٹل نہیں جاتا۔ میں یہ سب آپ کو اس لیے بتاتا رہتا ہوں کہ ان دنوں ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ آپ نے تو اخبار پڑھنا چھوڑ دیا، ٹی وی پر خبریں نہیں دیکھتیں، لیکن پھر کہوں گا کہ آنکھیں بند کر لینے سے خطرہ ٹل نہیں جاتا۔''

''اب چھوڑیے بھی ڈاکٹر صاحب۔ مولا ہماری حفاظت کریں گے۔''

ڈاکٹر علی رضا نے پھر کچھ نہیں کہا۔

ایک کیمپ والے دن فاطمہ کو اکبر کے اسکول جانا پڑ گیا، پیرنٹس ٹیچر میٹنگ کے سلسلے میں۔ وہاں دیر ہونے لگی تو اس نے ڈاکٹر علی رضا کو فون پر بتا دیا کہ وہ آج ان کے ساتھ نہیں جا سکے گی، اسکول میں خاصی دیر ہو جائے گی۔

اسکول سے وہ اکبر کو لے کر گھر آئی تو اسے بڑی تکان محسوس ہوئی۔ پاؤں جیسے من من بھر کے ہو رہے تھے حالانکہ اسکول میں زیادہ وقت بیٹھے بیٹھے ہی گزرا تھا۔ اس نے اکبر کے کپڑے تبدیل کیے اور کچن میں کچھ کھانے کا بندوبست کرنے چلی گئی۔ اس نے اکبر کو آواز دینا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی گھر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ بھاری قدموں سے اس طرف گئی اور ریسیور اٹھایا۔ اس نے صرف ہیلو کہا تھا اور پھر کچھ نہ بول سکی تھی۔ وہ سنتی رہی اور دوسری طرف سے بات ختم ہو جانے کے باوجود کافی دیر ریسیور اٹھائے کھڑی رہی۔ پھر دھم سے نیچے فرش پر بیٹھ گئی۔

پولیس، اسپتال، پوسٹ مارٹم اور دیگر تمام قضیے کو فاطمہ اور ڈاکٹر علی رضا کے قریبی رشتہ دار نبٹاتے رہے۔ چند دنوں بعد جب وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی تو اس کی توجہ اکبر کی طرف دلائی گئی اور مزید چند دنوں کے بعد وہ کسی فیصلے پر پہنچ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈسپنسری والے حصّے کو خالی کر کے صفائی کروائی۔ نوکر نوکرانی کو بلا کر فاطمہ نے کہا۔

''اب مجھ میں اتنی صلاحیت نہیں کہ تم لوگوں کی تنخواہیں ادا کر سکوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اکبر کی پرورش کس طرح ہوگی۔ ایسی صورت میں تم لوگ کہیں اور ملازمت تلاش کر لو۔ میرے ذمے جو کچھ ہے وہ میں ادا کر دوں گی۔''

انیکسی بھی خالی ہو گئی تو اس نے ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے ذریعہ انیکسی اور ڈسپنسری والا حصّہ کرائے پر اٹھا دیا۔ اس نے حساب لگایا کہ کرائے کی رقم سے گزر بسر ہو سکتی ہے۔ اس نے اکبر کی عمر پر غور کیا کہ اسے ڈاکٹر بننے میں کتنے سال لگیں گے۔ گویا ابھی چودہ پندرہ سال اسے اور زندہ رہنا پڑے گا۔ اس نے سوچا اتنا عرصہ وہ ڈاکٹر علی رضا کے بغیر کس طرح زندہ رہ پائے گی!

لیکن وہ زندہ رہی اور سب کچھ اسی طرح ہوا جس طرح اس نے اور ڈاکٹر علی رضا نے اکبر کے لیے سوچا تھا۔

تعلیم کی تکمیل اور ہاؤس جاب کے بعد اکبر کو اسی اسپتال سے تقرری کا پروانہ مل گیا جہاں ڈاکٹر علی رضا متعین تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد اپنی امی کے پاس پہنچے اور ان کے ہاتھوں میں تقرری کا خط رکھ دے۔ لیکن وہ تنہا نہیں تھا، اس کے ساتھ سکینہ بھی تھی۔

''امّی اس لفافے کو کھولیں۔''

''کیا ہے اس میں؟'' فاطمہ نے لفافہ لیتے ہوئے پوچھا اور سکینہ

کی طرف دیکھا۔

''پہلے آپ لفافہ کھولیں، پھران سے تعارف کرواؤں گا۔'' اکبر جھینپتا ہوا بولا۔

فاطمہ نے لفافہ کھولا، تقرری کا خط پڑھا اور پڑھ کر بھی خط اس کی نظروں کے سامنے رہا۔

آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، اس نے سکینہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے اکبر کا سر اپنے قریب لا کر اس کی پیشانی چوم لی۔

''اللہ تمھیں غمِ حُسین کے سوا کوئی اور غم نہ دے۔''

''امّی یہ.....'' اکبر نے کہنا چاہا۔

''میں خود پوچھ لوں گی اس سے۔ تم کچھ مت بتاؤ۔''

اکبر مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ فاطمہ نے سکینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔

سکینہ ابھی ہاؤس جاب کر رہی تھی۔ وہ میڈیکل میں اکبر سے دو سال جونیئر تھی، ہاؤس جاب میں دونوں کا ساتھ رہا اور اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی۔

سکینہ مہینے میں دو تین بار فاطمہ سے ملنے آجاتی۔ دونوں گھرانوں میں بھی آنا جانا ہوگیا۔ سکینہ کی تقرری کے ایک سال بعد دونوں کی شادی ہوگئی۔ دونوں جاب سے منسلک رہے، دو سال کے بعد جب اصغر پیدا ہوا تو سکینہ نے لمبی چھٹی لے لی۔

فاطمہ نے شہر کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھی۔ اس کے خیال میں حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔ وہ خود بھی خوف زدہ رہتی اور یہی محسوس کرتی کہ پورا شہر دہشت زدہ ہے۔ وہ اگر بازار جاتی تو کام نبٹا کر جلد از جلد گھر لوٹ آتی۔ اس نے اکبر اور سکینہ کو بھی ایسی ہی تنبیہ کر رکھی تھی۔

ایک دن اکبر نے کہا، ''امی آپ بتا رہی تھیں کہ ڈسپنسری والے حصّے کے کرائے دار جارہے ہیں؟''

''ہاں انھوں نے ایک مہینے کا نوٹس دے رکھا ہے۔'' فاطمہ نے کہا۔

''امی، اب اسے کرائے پر نہ اٹھائیں۔ میں اور سکینہ اس میں نجی ڈسپنسری قائم کریں گے۔ اصغریوں بھی زیادہ تر آپ ہی کے پاس رہتا ہے۔ ہم لوگ انتظام کرلیں گے۔''

فاطمہ نے ایک لمحے کو سوچا، پھر آہستہ سے سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے، جیسا تم لوگ مناسب سمجھو۔''

ڈسپنسری قائم ہوگئی تو کچھ دنوں بعد اکبر اور سکینہ اس کے پاس آ بیٹھے۔ فاطمہ کو لگا کہ دونوں کچھ کہنا چاہ رہے ہیں۔

''کیا بات ہے، کچھ کہنا چاہ رہے ہو تو کہہ ڈالو۔ جھجک کیوں رہے ہو۔''

اکبر اور سکینہ نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر اکبر بولا۔

''امی، ہم لوگ ہفتے میں ایک دن فری کیمپ لگانا چاہ رہے ہیں، مضافات میں، جہاں طبی سہولتیں بہت کم ہیں یا بالکل مفقود ہیں۔''

فاطمہ کو چکّر سا آنے لگا..... بالکل اپنے باپ کے نقشِ قدم پر.....اس نے چاہا کہ انھیں اس کام سے روک دے لیکن اکبر بول اٹھا۔

''امّی، ان غریبوں کا بھی ہم پر حق ہے۔ انھیں ہم تھوڑی سی طبی سہولت مہیا کردیں تو کیا حرج ہے۔''

''بیٹے کوئی حرج نہیں۔ بہت اچھا اور نیک خیال ہے۔ لیکن کیا حالات ایسے ہیں کہ دور دراز کا سفر کیا جائے، مضافاتی بستیوں میں فلاحی کاموں کے لیے پہنچا جائے، زیادہ سے زیادہ گھر سے باہر رہا جائے.....'' فاطمہ نے آہستہ آہستہ کہا۔

''امّی سارے کام ہو رہے ہیں نا انھیں حالات میں۔ اور پھر آپ اور ابّو بھی تو یہ سب کرتے رہے ہیں۔''

''اس کا انجام دیکھ لیا نا تم نے..... تم بہت چھوٹے تھے اس وقت.....'' فاطمہ کی آواز رُندھ گئی۔

''میں جانتا ہوں امّی۔ بڑی جدوجہد کی ہے آپ نے۔ لیکن جس انجام کا آپ کو سامنا کرنا پڑا وہ آپ کے فلاحی کاموں کی وجہ سے نہیں..... آپ اچھی طرح سمجھتی ہیں۔''

فاطمہ رونے لگی۔ سکینہ اس کے اور قریب ہوگئی۔

''اچھا ٹھیک ہے امّی، ہم فری کیمپ کا پروگرام موخر کردیتے ہیں۔''

''نہیں بیٹے، تم لوگ ضرور فری کیمپ لگاؤ۔ اس ماحول میں تھوڑا سا اچھا کام بھی ہوتا رہے تو امید کا دِیا روشن رہے گا۔''

سکینہ اس کے گلے سے لگ گئی۔ اکبر نے بھی اس کا ہاتھ اٹھا کر چوم لیا۔

فاطمہ گم صم رہی..... کیا سب کچھ ویسے ہی ہوگا..... سب کچھ!!

گھر کا اور گھر کے افراد کا معاملہ کسی حد تک ٹھیک ٹھاک ہی تھا۔ چھوٹی چھوٹی وارداتوں کے شکار اکبر اور سکینہ دونوں ہوتے رہے۔ لیکن اسپتال کی ملازمت بھی ٹھیک چل رہی تھی اور مکان کے ملحقہ حصے میں 'ڈاکٹر علی رضا میموریل کلینک' بھی جم گئی تھی۔ انیکسی میں ملازمین رہنے لگے تھے اور دادی کے چہیتے اصغر میاں اسکول جانے لگے تھے۔

فاطمہ کو فرصت ملتی تو اپنی ڈائری الٹ پلٹ کرنے لگتی۔ پڑھی ہوئی چیزیں پھر پڑھتی۔ کچھ لکھ بھی لیتی۔

اور ایک دن پھر گھر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ فاطمہ نے کچھ دیر دیکھا، پھر اٹھ کر ٹیلی فون کے پاس پہنچی۔ دوسری طرف سکینہ تھی۔

''امّی، ہمیں کچھ دیر ہوجائے گی..... گھبرائیے گا نہیں..... سب ٹھیک ہے امّی..... پریشانی کی کوئی بات نہیں..... آپ سن رہی ہیں نا میری بات.....''

باقی صفحہ ۸۲ پر ملاحظہ فرمائیے

دھوپ کی تپش

سید سعید نقوی
(نیویارک)

آج بھی وہ اپنے مقررہ وقت پر ہی آئے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ بچپن سے ہی میں نے سیکھ لیا تھا کہ وہ جس وقت کا وعدہ کرتے ہیں اسی وقت پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کی آمد کی امید رکھنا عبث ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی ایک خوشگوار حیرانگی لئے بغیر اطلاع کے بھی پہنچ جاتے ہیں۔ آج بھی اپنے مقررہ وقت پر ہی پہنچ گئے۔ دسمبر کی یخ بستہ شام ان کی گاڑی ڈرائیوے میں داخل ہوئی تو میں صدر دروازے پر ان کا منتظر تھا۔ بڑھ کر ان سے بغل گیر ہوا تو لگا کہ اپنے آپ سے مل رہا ہوں۔ ان کا سامان ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

جب سے وہ تنہا رہ گئے تھا ان کا یہی وطیرہ تھا۔ سال میں دو تین بار چند ہفتوں کے لئے میرے پاس آجاتے۔ خاص طور پر دسمبر کے کرسمس کے دوران تو ضرور آتے کہ نیویارک میں کرسمس کا موسم بہت زندہ اور جیتا جاگتا ہوتا ہے۔ ویسے تو جب ہمارا گھر بہت بھرا پرا تھا مجھے وہ اس وقت بھی بہت تنہا لگتے، اپنے وقار اور سربراہی میں تنہا۔ پھر اولادیں جوان ہو کر گھونسلہ چھوڑ گئیں، لیکن جس مکان میں وہ گزشتہ تیس سال سے رہ رہے تھے اُسے چھوڑ کر کسی کے ساتھ منتقل ہونے کو تیار نہیں تھے۔

''آیئے، یہاں آتشدان کے سامنے آجایئے۔ میں نے اسے آپ کے انتظار میں پہلے ہی دہکا دیا تھا''

''ہاں بھئی سردیوں میں آتشدان کے سامنے پیر پسارے، کافی پینے، اور کچھ نہ کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔'' وہ ہنس کر بولے۔ میں پہلے ہی کافی مشین میں پانی بھر کر اس کا پلگ لگا رہا تھا۔ بیٹھک میں نشست کی ترتیب کچھ یوں تھی، کہ آتشدان ان کے صوفے کے داہنے ہاتھ پر تھا، سامنے ٹی وی چل رہا تھا۔ جب کہ بائیں ہاتھ پر کھینچ کر کھولنے والا بڑا فرنچ دروازہ مکان کے عقب میں میرے چھوٹے سے باغ میں کھلتا تھا۔

'' بھئی یہ پردہ ہٹاؤ، تمھارے باغ کے درختوں پر بھی برف دیکھیں۔''

''بس ابھی کافی بنا کر ہٹاتا ہوں۔ آتش دان کی گرمی زیادہ تو نہیں، آپ موزے اتار دیجئے'' میں نے ان کے موزے میں تلوے کی سمت سوراخ پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ سوراخ دیکھ کر میں نے ایک سکون کا سانس لیا تھا کہ سب ٹھیک ہے۔

''ابھی تک تو حرارت اچھی لگ رہی ہے۔ کچھ دیر میں موزے پگھلنے لگیں گے تو اتار دوں گا۔ پچھلے سال تمھارے ہاں کی گرمی سے ہی موزے میں سوراخ ہوا تھا۔ یادگار کے لئے رکھ چھوڑا ہے'' لیجئے مجھے یقین ہو گیا کہ سب ٹھیک ہے،، کچھ بھی نہیں بدلا۔ ''اور بھئی سچ بات تو یہ ہے کہ ہمیں کبھی پتا ہی نہیں چلا کہ کتنی آنچ ٹھیک ہوتی ہے۔ ابھی اچھا لگ رہا ہے، کچھ ہی دیر میں یہی حرارت بری لگنے لگے گی۔ حالانکہ کمرے کا درجہ حرارت تو اتنا ہی ہوگا۔ یہ تو اطراف سے باہمی اختلاط کا مسئلہ ہے میاں'' مجھے ان کا لہجہ معانی خیز لگا۔

میں نے جواب نہیں دیا۔ ان کی کافی بہت آسان ہوتی ہے۔ نہ شکر کی جھنجھٹ، نہ دودھ کا مسئلہ۔

''میاں اچھائی میں ملاوٹ نہیں کیا کرتے'' وہ مجھے چھیڑتے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی کافی میں شکر ڈالنا تو چھوڑ دی تھی، لیکن دودھ کی ملاوٹ ابھی باقی تھی۔ مگ میں کافی انڈیل کر مگ انہیں پکڑا دیا، اور فرنچ دروازوں کے سامنے پڑا پردہ ہٹا دیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر میرے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔

''بھئی ماننا پڑتا ہے کہ کم از کم باغ تو تم سلیقے سے رکھتے ہو'' یہ ان کی گفتگو کا ایک خاص انداز تھا جیسے چھیڑ رہے ہوں۔ اب دیکھئے یہاں ''کم از کم'' بالکل بلاضرورت ہے یا نہیں۔ غیر آلودہ تعریف نہیں کرتے۔ اس 'کم از کم' میں جو بلاغت ہے اس سے ان کی اولاد خوب واقف ہے۔

''ارے یہ سیب کے درخت کے گرد تم نے ربن باندھ رکھی ہے۔ یہ وہی ہے ناں جو میں نے پچھلی بار بھی دیکھی تھی'' انہوں نے استعجابیہ استفسار کیا۔

بچپن میں کبھی مجھے عادت پڑ گئی تھی کہ جب کسی نئی الجھن کا سامنا ہوتا تو اپنے پچھواڑے کے درخت پر ایک ربن باندھ دیتا۔ پہلے وہاں باندھتا رہا جہاں اب وہ رہتے تھے، میں نے اپنا علیحدہ گھر تو بنا لیا لیکن یہ عادت نہ گئی۔ وہ الجھن خواہ امتحان کی ہوتی یا نوکری کی، یا کسی نئے منصوبے کی۔ کبھی تو ایک ہی ہفتے میں کئی ربنیں بندھ جاتیں اور کبھی مہینوں کوئی نئی ربن نہیں بندھ پاتی۔ جلد یا بدیر، اپنے تئیں، جب وہ معمہ سلجھ جاتا تو ربن بھی کھل جاتی۔ وہ میری اس کمزوری کے عادی تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ انہوں نے ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کی۔

''جی، یہ وہی ربن ہے، آپ پچھلی بار ستمبر میں آئے تھے جب سے ہی بندھی ہے'' میں نے کچھ جھینپ کر اقرار کیا۔ گویا یہ اپنی شکست کا اقرار تھا۔

''اب تک کھلی کیوں نہیں۔ بات کریں؟'' ان کی اس دعوت میں یہ خواہش مخفی تھی کہ میں اس الجھن پر ان سے بات کروں، گویا خود سے بات کروں، اس گفتگو میں شاید کوئی راستہ نکل آئے۔

''ابھی میں تیار نہیں ہوں'' میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے مجھے بھی کوئی جلدی نہیں۔ بہت کم ہی کوئی ربن میں نے اتنا طویل عرصہ بندھی دیکھی ہے۔ لیکن اس میں تمھاری مستقل مزاجی کا قصور نہیں بلکہ کامیابی کے تناسب کی سند ہے' انہوں نے چٹکی لی۔

''آپ کو اس پر حیرت نہیں کہ کبھی کبھی تو کوئی ربن مہینوں نہیں بندھتی، کبھی ایک ہی دن میں دو بندھ جاتی ہیں۔ کوئی ربن تو چند روز میں ہی اُتر جاتی ہے تو کبھی سال بھر بھی لگی رہی ہے'' مجھے اپنے لہجے میں شکوے پر حیرت اور ندامت محسوس ہوئی۔

''بھئی وقت خود اپنے قابو نہیں آتا تو ہمارے قابو کیسے آئے گا۔ ہمیں تو وقت کا ادراک بس اتنا ہی ہے کہ جیسے یہ ناپنے کا کوئی آلہ ہو۔ یہاں سے وہاں تک چھ فٹ، کل سے آج تک چوبیس گھنٹے، اور بس۔''

''سچ پوچھیں تو مجھے تو اس وقت پر بہت غصہ آتا ہے''

''کیوں؟'' وہ مسکرائے

''جس چیز پر کوئی اختیار نہیں ہو، لیکن جس کے تعاقب میں زندگی گزر رہی ہو اس پر غصہ نہیں آئے گا؟''

''تعاقب میں کہاں۔ ابھی کتنے پچاس کے ہی تو ہوئے ہو۔ مجھے یاد ہے جب تم میڈیکل اسکول سے فارغ ہوئے تھے تو تمھارا خیال تھا کہ تم وقت کے آگے آگے بھاگ رہے ہو!''

''صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔ یہی تو رونا رو رہا ہوں۔ اس وقت کا خیال کتنا دلفریب لیکن خام تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ پچاس کے قریب پہنچ کر معاملات زیادہ سمجھ میں آنے لگیں گے۔ وقت، مذہب، وجود سب الجھنیں واضح ہونے لگیں گی۔ مگر اب تو لگتا ہے معاملہ کچھ اور بگڑ گیا ہے۔''

''ہاں میاں'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری ''یہی کہہ سکتا ہوں کہ سمجھ لو تم اکیلے نہیں ہو۔ تو کیا معاملہ محض اختیار کا ہے؟''

''نہیں اختیار تو دور کی بات، یہاں تو نیم اختیار بھی نہیں۔ میں نے تو ہار مان کر برسوں پہلے صرف حال میں ہی جینا شروع کر دیا تھا؟''

''بھئی یہ تو بہت زیادتی ہے، کچھ مستقبل کا بھی تو حق ہے تم پر!'' آپ نے اگر ان کے ساتھ عمر گزاری ہوتی تو آپ سمجھ جاتے کہ اس سوال کا جواب تھا ان کے پاس۔ یہاں محض مقصد یہ تھا کہ وہ اس گفتگو پر مزید گفتگو کے خواہاں ہیں۔

''بھئی مستقبل میں تو بہت دور دور تک امکانات ہیں، یہاں تو کل صبح بلکہ اگلے پل کا بھی نہیں پتہ، تو اس کا مجھ پر کوئی حق ہونا زیادتی ہے۔''

''میں اس پر تم سے متفق نہیں۔ بظاہر سطحی طور پر بات صحیح کہہ رہے ہو، لیکن میں چاہتا ہوں خود ہی سوچو''۔

مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ ہم کتنی دیر سے دروازے کے پاس کھڑے باہر دیکھ رہے ہیں، وہ یقیناً تھک گئے ہوں گے۔

''آیئے آتشدان کے پاس بیٹھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس دفعہ حرارت سے آپ کا موزار فو ہو جائے'' اب موقع تھا کہ میں بدلہ چکا دیتا۔

''ہوں'' انہوں نے سن کر میرے شانے پر ہاتھ مارا اور وہیں رہنے دیا۔ ہم اسی طرح صوفے کی طرف بڑھ گئے اس سے جہاں محبت، قربت اور یگانگت مقصود تھی وہیں میری خود اعتمادی کو بڑھاوا دینا بھی شامل تھا۔ پہلے ایسی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ وہ اکثر غیر ضروری طور پر مجھ پر یوں انحصار کرنے لگتے کہ مجھے حیرت ہوتی کہ سب تو یہ خود کر سکتے ہیں۔ مگر جب عمر پچاس کے قریب ہونے لگتی ہے تو فہم و ادراک کی نئی کھڑکیاں روشن ہونے لگتی ہیں۔ میرے خیال میں ذہن میں کچھ خلیے ایسے پروگرام کئے گئے ہیں کہ وہ عمل پذیر ہونے کے لئے کم از کم چالیس سال کا وقفہ مانگتے ہیں۔

''آپ کا پسندیدہ پروگرام آرہا ہے'' Everybody loves Raymond''، لگا دوں ٹی وی۔''

''بالکل لگا دو، نیکی اور پوچھ پوچھ۔ تمھارے ساتھ دیکھوں گا تو اور مزا آئے گا''۔ غریب الوطنی میں انہیں ٹی وی پر مزاحیہ پروگرام ہی زیادہ پسند آتے۔ ''بھئی رونے دھونے کے لئے پچھلی کدورتیں کم ہیں کہ نئے پنڈورے کھول لوں۔'' وہ بیزاری سے کہتے۔

کھانا کھا کر ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میرا تو سارا ماضی ان کے ساتھ مشترک تھا۔ ہم نے خوب پچھلے قصے دہرائے۔ ان کا بستر میں نے اپنے برابر والے کمرے میں ہی کر دیا تھا۔ ان کے سرہانے پانی کا گلاس رکھ کر میں نے انہیں شب بخیر کہا۔

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے دینا۔''

''نہیں کل ہفتہ ہے، تمھاری بھی چھٹی ہے، آرام سے اٹھنا۔ بہت دنوں سے تمھارا کوئی افسانہ بھی نہیں پڑھا۔ بلکہ صبح خود مجھے سنانا۔''

سارا زمانہ افسانہ پڑھ لے۔ بڑے جید نقاد بھی داد دے دیں تو وہ مزا نہیں ملتا جو ان کے چند الفاظ سے ملتا تھا۔ نہ معلوم کیوں۔ شاید ان کی آواز میں مجھے خود اپنی رائے کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ لکھتا تو آدمی اپنے لئے ہی ہے۔ اوروں کو دھوکہ دینا تو آسان ہے، خود کو دھوکہ دینا ایک اور ہی فریب ہے۔ میں ذہن میں اپنے نئے لکھے افسانوں میں سے بہترین کا انتخاب کرنے لگا۔ وہ، نہیں اس میں تو کچھ جھول تھا، اچھا تو پھر وہ، نہیں اس کا اختتام تو پہلے ہی پتہ چل جاتا ہے۔ کسی چھوٹے بچے کی مانند ذہن کے کسی گوشے میں وہی خواہش تھی جو برسوں پہلے کوئی نیا ہنر سیکھ کر ہوتی تھی کہ کس طرح یہ بات ان تک پہنچ جائے۔

صبح چہل قدمی کا شوق برف باری کی نذر ہو گیا۔ لہٰذا ناشتے کے بعد، کافی کے مگ بھرے اور دوبارہ اپنی پسندیدہ نشستیں سنبھال لیں۔

''کس وقت زیادہ لکھتے ہو، جب دکھی ہو یا خوش''

یہ سوال غیر متوقع تھا، میں گڑبڑا سا گیا ''کوئی خاص فرق نہیں پڑتا'' میں نے ٹالا

''اچھا چلو سناؤ، کوئی نئی چیز؟''

''اب نیا لکھنے کا وہ جوش نہیں رہا۔ میرے خیال میں، میں نے اپنی حدوں کو چھو لیا ہے۔''

''واقعی'' وہ مسکرائے، پھر وہی سرپرستانہ مسکراہٹ۔ ''میں تو خود

اب تک اپنی حدیں نہیں پہچان سکا، تم کیسے پہچان گئے۔ یا در کھو جب بھی اپنی حد کو پہنچتے ہو، تو گویا ایک نئی حد مقرر ہونے لگتی ہے۔ میرے خیال میں تو کسی کے لئے کوئی حد مقرر کی ہی نہیں گئی۔ تم تو خود ڈاکٹر ہو۔ سوچ کا saturation point تو آ ہی نہیں سکتا۔ اب کیا مکان کے دروازے بھی گنے چنے ہونے لگے۔'' لگتا تھا انہیں میری بات بری لگی، یا شاید مایوسی ہوئی۔ میں نے تو محض یہ بات مدافعانہ حکمت عملی میں کہی تھی کہ اگر میرا نیا افسانہ پسند نہ آئے تو اس دیوار کے پیچھے چھپ سکوں۔ اب اپنے بچھائے جال میں خود ہی پھنس چکا تھا۔

''ان خیالات کے حامل مصنف سے کوئی کیا سنے؟'' ان کی ناراضگی برقرار تھی۔

''جیسے آپ کی مرضی'' میں نے شانے اچکائے

'اچھا چلو سناؤ'' یہ سوچی سمجھی پسپائی تھی۔ ایک فاتح سپاہ سالار کی حکمت عملی۔ بہت سنجیدگی اور خاموشی سے افسانہ سنتے رہے۔

''واہ میاں، پھر کہتے ہو اپنی حدوں کو چھولیا ہے۔ تم صرف یہ چاہ رہے تھے کہ میں تمھاری تعریف کروں۔'' ان کے جملے سے میرا خون سیروں بڑھ گیا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر ہم دونوں گھر سے باہر نکل گئے

''مال چلتے ہیں، میں چاہتا ہوں آپ کو ایک اوورکوٹ دلا دوں۔''

''مجھے ضرورت نہیں، دیکھ تو رہے ہو، یہ جو پہنے ہوں اس میں کیا کمی ہے؟''

''لیکن پھر بھی۔ ایک سے دو اوورکوٹ بہتر ہیں۔ کبھی بدل کے یہ پہن لیا کبھی وہ۔''

''دیکھو میں اپنی مرضی سے علیحدہ اور تنہا رہتا ہوں۔ سب ہی بچوں نے کئی کئی مرتبہ پورے خلوص سے کہا ہے کہ ساتھ آ کر رہیں۔ لیکن فی الحال میں اپنی آزادی تم لوگوں کے تابع کرنے کے حق میں نہیں۔ لہذا تمھارے ذہن میں کوئی Guilty Concious نہیں ہونا چاہئیے۔''

''اس بات کا اوورکوٹ سے کیا تعلق ہے؟''

''سوچو، سمجھ جاؤ گے''

میں مصر رہا اور اوورکوٹ دلا کر ہی رہا۔ مال سے واپسی پر میرا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ وہ بھی خوش تھے۔ سڑک کے کنارے کسی گاڑی کا شکار ایک گلہری کا جسم دیکھا تو افسردہ ہو گئے ''ان جانوروں کی دنیا، ہماری دنیا سے ایسی پیوست ہے کہ علیحدگی اب مشکل ہے۔ لیکن انہیں اس کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے!''

''تمھارا مذہب پر اعتقاد بحال ہوا یا نہیں؟'' وہ ایسے ہی اچانک حملہ آوار ہوتے۔

''وہی بے یقینی کی کیفیت ہے، بہت سے سوال اٹھتے ہیں ذہن میں۔''

''تو اس میں کیا حرج ہے؟ بے یقینی ہی سے تو یقین کا کھوج ملے گا۔ میں خود ابھی تک بے یقینی کا شکار ہوں۔ بس یہی کہنا ہے کہ دروازہ کھلا رکھنا''

''دروازہ تو کھلا ہے، لیکن یقین کیجیے کچھ پتہ نہیں۔ سوچو تو پچاس سال میں کتنی تعلیم حاصل کر لی ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ہونے اور نہ ہونے کی بابت جتنا علم پیدائش کے وقت تھا، بالکل اتنا ہی آج بھی ہے، ایک حرف زیادہ نہیں''

''خوب'' وہ مسکرائے۔ ''یہ ادراک 'کہ نہیں معلوم' تمھاری جستجو جاری رکھے گا، یہ ایک خوش آئند بات ہے''

میں نے بہت کوشش کی کہ رات کا کھانا ہم کہیں باہر کھائیں، لیکن وہ نہ مانے، میں نے جو گھر پر بنایا، وہی خوش ہو کر کھایا اور تعریف بھی کرتے گئے۔

''میاں میں اس دفعہ تمھارے پاس صرف دو دن کے لئے آیا ہوں صبح ہی نکل جاؤں گا'' انہوں نے انکشاف کیا۔

''کیوں؟ کم از کم ایک ہفتہ تو ٹھہرتے۔''

''نہیں، اور اب تو تم نے اوورکوٹ بھی دلا دیا ہے'' میری آنکھوں میں جانے کیا دیکھا کہ کاندھے پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا۔ ''نہیں میر خیال میں تمھیں صرف دو ہی دن کی ضرورت تھی۔ اس دفعہ یہاں سے نکل کر چھوٹے کے پاس جاؤں گا، وہاں ایک دو ہفتے ٹھہروں گا، اگر تم کو کوئی اعتراض نہیں ہو'' انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''اور اگر مجھے اعتراض ہو؟'' میں نے ذرا شوخی سے پوچھا۔

''ہم نے یہ استحقاق کسی جذباتی دباؤ میں نہیں دیا ہے، کچھ دیکھ کر ہی دیا ہے'' وہ سنجیدہ تھے۔ مجھ سے صرف یہی جواب بن پڑا:

''نہیں جہاں آپ خوش رہیں'' گویا ہتھیار ڈال دیئے

صبح انہیں گاڑی میں بٹھا کر بھاری قدموں سے واپس گھر آیا۔ پچھلے دروازے سے باغ میں جا کر سیب کے درخت سے بندھی ربن کھول دی۔

۔ نوبل ۲۰۱۳ء ۔

بیاسی سالہ کینیڈین مصنفہ ایلس منرو نے مختصر کہانیوں کی مہارت پر ادب کا نوبل انعام برائے سال ۲۰۱۳ء جیت لیا ہے۔ ایلس منرو کو بارہ لاکھ چالیس ہزار ڈالر کی انعامی رقم اور الفریڈ نوبل کی سالگرہ کے دن اسٹاک ہوم میں ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔ اہم بات یہ ہے کہ ادب کا نوبل انعام جیتنے والی ایلس منرو کینیڈا کی پہلی اور دنیا کی تیرہویں خاتون ہیں۔

''وقت نے کِیا کیا حسین ستم''

ڈاکٹر رینو بہل
(چندی گڑھ، بھارت)

گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلنا اُسے اچھا لگتا تھا۔ جب کبھی طبیعت بے چین ہوتی اور اُداسی ستانے لگتی تو وہ گاڑی نکالتی اور سیدھے سمندر کے کنارے پہنچ کر ننگے پاؤں گیلی ریت پر چلتے چلتے دُور تک پھیلے سمندر کے گہرے نیلے پانی کو دیکھتی رہتی۔ سمندر میں اُٹھتی لہروں کو خاموشی سے دیکھتے رہنا اور پھر اُن لہروں کا کنارے سے ٹکرا کر پلٹ جانا اُسے اپنی زیست کی تصویر لگتی۔ راشد اُسے ''پیار کا سمندر'' کہتا تھا اور آج وہی سمندر خود تشنگی کی گہرائی میں ڈوب رہا ہے۔ سمندر کی لہروں کی طرح پورا چاند دیکھ کر اُس کی دبی ہوئی خواہشیں سر اُٹھانے لگتیں۔ سمندر کی لہروں میں تلاطم مچلتا، لہریں چاند کو پانے کی خواہش میں بے صبری سے، بے چینی سے مچلتیں، اوپر اُٹھتی شور مچاتیں اور پھر ساحل سے ٹکرا کر اپنا سر پٹک کر واپس لوٹ آتیں۔ یہی حال اُس کا بھی ہوتا۔ تنہائی میں اسے گزرے زمانے یاد آتے، اس کی بانہوں کی گرماہٹ، اس کے سانسوں کی مہک، اس کے ہاتھوں کی اٹھکیلیاں، اس کے لبوں کی شرارتیں، اس کے جسم کی خوشبو یاد آتی تو وہ ان لمحوں کے لیے ترس جاتی۔ بیتے لمحے آ آ کر اُسے شدت سے اُس کی کمی کا احساس دلاتے رہتے۔ اس کی زندگی انتظار صرف انتظار کی صلیب پر ٹنگی رہتی۔ انتظار کے دن گن گن کر کٹتے اور مقرر وقت سے ایک روز پہلے ہی راشد کا فون آ جاتا۔ ہر بار کوئی نیا مسئلہ ہر بار کوئی نئی بات۔ ہر بار وہ وعدہ کر کے توڑ دیتا اور ہر بار وہ اندر سے ٹوٹ کر بکھر جاتی۔ راشد اس کی کمزوری تھا۔ اس کے علاوہ دنیا میں اُس کا ہے ہی کون؟ اُس کی پوری کائنات راشد کے اردگرد ہی گھومتی تھی۔ پھر خود کو سمیٹتی، پھر اس کی باتوں کے جال میں پھنس جاتی اور پھر اُس کے آنے کے انتظار میں دن گننا شروع کر دیتی۔ انہیں اداسیوں اور مایوسیوں کے بھنور سے نکلنے کی چاہ میں گیلی ریت پر ٹہل رہی تھی، خود میں سمٹی، اپنے خیالوں کی دنیا میں کھوئی کہ کسی کا ہاتھ اپنے کاندھے پر محسوس کر کے چونک پڑی۔ ایک ادھیڑ عمر گٹھیلے جسم، پُر رعب چہرے پر مسکراہٹ بکھیرے شخص اُس سے مخاطب تھا:

''تم غزالہ ہو نا؟''

''جی ہاں! بالکل صحیح پہچانا۔ آپ۔۔۔؟''

''کمال ہے! مجھے نہیں پہچانا؟ ایک ہم ہیں جو تمہیں بھولے نہیں اور ایک تم ہو جسے بھولے سے بھی ہم یاد نہیں۔''

اس کی چمکتی مسکراتی آنکھوں سے شرارت جھلک رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ یہ شرارت اُسے برسوں پیچھے لے گئی۔

''نلیش شرما'' اسے پہچانتے ہی وہ اُچھل پڑی۔

''Thank God تمہیں میرا نام تو یاد ہے''

''دوستوں کے نام بھی کوئی بھولتا ہے بھلا! تم یہاں ہوتے ہو؟ میں نے تو سنا تھا کہ کرنل صاحب کشمیر کی خوبصورتی کے مزے لیتے ہیں۔ رنگین وادیوں نے طبیعت بھی رنگین کر دی ہے''

''غزالہ میڈم سُنا تو تم نے بالکل ٹھیک، اُن حسین وادیوں میں خوبصورت چہروں کو دیکھ کر کون کمبخت دل کو سنبھال سکتا ہے۔ پھر میں ٹھہرا آزاد پرندہ۔ مگر ایک بات بتاؤں میں نے کہیں پڑھا تھا کہ مرد پہلی بار جب کسی کو چاہتا ہے تو محبت کرتا ہے دوسری بار بدمعاشی اور اس کے بعد صرف عیاشی ہی کرتا ہے۔ اس لیے تم صرف میری پہلی چاہت پر غور فرماؤ باقی جانے دو۔'' یہ سنتے ہی اُس کا چہرہ لال ہو گیا۔ جھینپ مٹاتے ہوئے وہ جھٹ سے بولی:

''شادی شدہ آدمی آزاد کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیا سبھی باتیں یہاں کھڑے کھڑے کریں گے؟ وہ سامنے والی بلڈنگ میں میرا فلیٹ ہے۔ چلو وہاں چلتے ہیں اور اگر کوئی اعتراض ہو تو اس کافی شاپ پر چلتے ہیں۔''

''کافی شاپ چلتے ہیں، گھر کسی اور روز آؤں گی''

ایک عرصے کے بعد دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ کالج کے دنوں کے ساتھی ایک مدت بعد ملے تو بھولی بسری باتیں، دوستوں کے قصّے چھیڑ بیٹھے۔ آٹھ لوگوں کا اُن کا گروپ کالج میں کافی مشہور تھا۔ تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں۔ تین سال سبھی ساتھ رہے پھر گریجویشن ختم ہوتے ہی سب الگ راستوں پر اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے نکل پڑے۔

نلیش شرما فوج میں سیکنڈ لفٹیننٹ تعینات ہو گیا۔ سبھی جانتے تھے کہ نلیش شرما اس پر فدا ہے مگر اُس نے کبھی زبان سے اپنی چاہت کا اظہار نہیں کیا۔ مذہب کی دیوار دونوں کے بیچ حائل تھی جسے توڑنے کی اُس کی مرضی بھی تھی اور ہمت بھی پر اپنی بیوہ ماں کو دُکھ دے کر وہ زندگی کی خوشی حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اکثر وہ یہ کنگنایا کرتا ''عشق نہ دیکھے دین دھرم عشق نہ دیکھے ذات''۔ اُس نے اپنے خواب اپنی خواہشیں اپنے اندر ہی دفن کر دیئے۔

''تم نے بتایا نہیں تمہاری بیوی کیسی ہے؟''

''کلپنا سے میری علیحدگی ہو چکی ہے۔ بنٹی کو لے کر وہ اپنے والدین کے پاس کینیڈا میں سیٹل ہو گئی۔ شادی کے صرف پانچ سال ہم نے ایک ساتھ گزارے۔ اس کا اصرار تھا کہ نوکری چھوڑ کر کینیڈا چلوں اور میری ضِد تھی کہ نہ میں نوکری چھوڑوں گا نہ اپنا وطن اور نہ ہی اپنی ماں۔ جس ماں کی خاطر میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ترک کر دی اُسے بھلا میں کیسے چھوڑ کر جا سکتا تھا۔ لہٰذا ہمارے راستے الگ ہو گئے۔''

''اور اب یہاں پوسٹنگ ہے؟''

''میں نے ریٹائرمنٹ لے لی۔ ماں بیمار ہوئی تو اُس نے بستر پکڑ لیا۔ نوکر تو تھے اس کی خدمت کے لیے مگر میں نہیں تھا۔ اُن کے علاوہ میرا اس دنیا میں ہے ہی کون اس لیے نوکری سے ریٹائرمنٹ لے لی''

''اب کیسی ہیں تمہاری ماں؟''

وہ دومنٹ خاموش رہا۔

''اب میں اور میری تنہائی ہے۔ ماں بھی مجبور تھیں۔ میں انہیں بھی نہ روک سکا۔ وقت اور پیسے کا صحیح استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ بے سہارا بزرگوں کے لیے ایک آشرم کھول رہا ہوں۔ تم بھی اس میں میری مدد کرسکتی ہو''۔

وہ خاموشی سے اُس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ آج بھی وہ ویسے ہی دلکش ہے، چوڑی پیشانی، سفید اور کالے ملے جلے گھنے چھوٹے چھوٹے بال، ویسی ہی ملے جلے رنگ کی ہلکی ہلکی مونچھیں۔ اس کھلی ہوئی رنگت اور شاداب چہرے کے پیچھے کون جان سکتا ہے کہ درد اور تنہائی کا سیلاب چھپا ہے جو بات کرتے کرتے اُس کی آنکھوں میں دکھائی دینے لگتا ہے۔

''میں نے تمہیں اپنے بارے میں سب بتا دیا۔ تم بتاؤ کیسی ہو؟ راشد آج کل ادھر ہیں یا اکیلی ہی ہو؟''

''تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟'' اس نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تُم سے دُور چلا گیا تھا مگر تم مجھ سے کبھی دور نہیں گئیں! تمہاری زندگی میں کب کیا ہوا، مجھے سب معلوم ہے''

''وہ کیسے؟''

''جذبے صادق ہوں تو راستے بھی نکل آتے ہیں۔ گھورنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ میں کئی سالوں سے رجنی سے مسلسل رابطے میں ہوں۔

''مگر اُس نے تو کبھی مجھ سے تمہارا ذکر نہیں کیا!''

''اسے بھی میرا ایک اور گناہ سمجھو!''

''اوہ! تو وہ مجھ سے زیادہ تمہاری دوست ہے''

''Come on غزالہ! میں نے اُسے قسم دے رکھی تھی جس کو اُس نے پوری وفاداری سے نبھایا''

''راشد دو دن بعد آ رہے ہیں پھر تم سے اُن کی ملاقات کراؤں گی۔ کافی وقت گزر گیا مجھے اب چلنا چاہیے''

وہ یہ کہہ کر اٹھنے لگی تو نلیش نے یک دم سے اُس کا بازو پکڑ کر بٹھا دیا۔

''تمہیں کیا ہوا؟ ایک دم سے بھی کوئی اس طرح جاتا ہے؟''

''نہ اپنا فون نمبر دیا نہ میرا اتہ پتہ لیا۔ راشد سے کیسے ملواؤ گی مجھے؟''

اُس نے جیب میں سے ملاقاتی کارڈ نکال کر اُسے تھما دیا اس اُمید پر کہ وہ جلد ملیں گے۔

نلیش سے مل کر غزالہ خود کو کافی ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ بہت دنوں بعد اُسے اپنے اندر کی گھٹن سے راحت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ صرف راشد بلکہ ساری دنیا کیا خود سے بھی مایوس تھی، ناراض تھی۔ یہ اس کی شخصیت کی خوبی تھی یا خامی کہ وہ غصّہ بھی ہوتی تھی خفا بھی ہوتی تھی مگر جھگڑا کبھی نہیں کرتی تھی۔ اُسے تو ڈھنگ سے گِلہ بھی نہیں کرنا آتا تھا۔ سارا کرب ساری تکلیفیں اپنے اندر خاموشی سے ضبط کر لیتی، اندر ہی اندر جلتی رہتی، کُڑھتی رہتی مگر کسی سے بھی شکایت نہ کرتی۔ راشد اُس کے چہرے کی خاموشی اور آنکھوں میں اُمڈتے اُداسی کے بادلوں کو دیکھ کر سمجھ جاتا کہ اُس کے دل پر غبار چھایا ہوا ہے۔ وہ اکثر اُسے کہتا کہ سب باتیں صاف صاف کہہ دینی چاہیے اس سے دل کا بوجھ کم ہوتا ہے اور دوسرے کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے مگر سب کچھ ویسے کا ویسا ہی رہا۔ نہ غزالہ کو گِلہ کرنا آیا نہ راشد کو خاموشی کی زباں سمجھنے کا ہُنر آ سکا۔

باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ نادرا بُوا سب کام نپٹا کر سو چکی تھیں۔ امّاں کے بعد وہ ہی ایک واحد بزرگ تھیں جو اُس کا ہر طرح سے خیال رکھتیں۔ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا نادرا بُوا کو اس گھر میں پایا۔ ویسے تو وہ خادمہ تھیں مگر اُن کی عزت گھر کے بڑے بزرگ سے کم نہیں تھی۔ دیر رات جب کروٹیں بدلتے بدلتے تھک گئی تو اُس نے اٹھ کر راشد کی کتابوں میں سے اُس کے پسندیدہ شاعر احمد فراز کا شعری مجموعہ 'جاناں جاناں' اُٹھا لیا۔ آج بھی فراز کی شاعری راشد کو ویسے ہی سحر زدہ کرتی تھی جیسے جوانی میں۔ یہ اور بات ہے کہ اب تو نہ وہ عمر رہی نہ وہ اُمنگیں، نہ وہ خواہشوں کا تلاطم۔ وہ عمر کے اُس پڑاؤ پر آن پہنچا تھا کہ گزری زندگی کی یادوں کا انبار تو لگا تھا مگر اُن لمحوں کا جادو کہیں کھو گیا تھا۔ پہلے وہ ساون کی بارش کو سُکھا نہیں جانے دیتا تھا اُس کا ہاتھ تھامے بارش میں دُور تک ٹہلتے رہنا اُسے بہت پسند تھا اور اب بارش آتے ہی کھڑکیاں بند کروا دیتا۔

راشد نے ہی اُسے بتایا تھا کہ اگر وہ اُسے اُس روز بارش میں بھیگتے نہ دیکھتا تو شاید وہ ایک ساتھ نہ ہوتے اور نہ ہی اُن کے عشق کی داستان وجود میں آتی۔

وہ بھی ساون کی ایک سہانی شام تھی۔ جب وہ دفتر سے لوٹ کر اپنے کمرے میں فراز کی شاعری میں غرق تھا۔ اچانک بادلوں کے گرجنے کی آواز سن کر اُس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو کالے کالے بادلوں نے نیلے آسمان پر اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالی گھٹا ٹوٹ کر برسنے لگی۔ گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو چھت پر برستے پانی کا سنگیت اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ ایک مدت ہو گئی بارش میں بھیگے ہوئے یہ ہی سوچ کر اُس نے کتاب ایک طرف رکھی اور چھت کی طرف لپکا مگر آخری سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے اس کے قدم ٹھٹھک کر وہیں رک گئے۔ سامنے غزالہ کو بارش میں بھیگتے ہوئے دیکھ کر وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ خاموش دکھنے والی ہمیشہ سنجیدہ نظر آنے والی لڑکی ایک الگ ہی روپ میں اُس کے سامنے تھی۔ بارش کی تیز و تند بوچھاڑ اُس کے گداز جسم، کتابی چہرے کو ایسے بھگو رہی تھی جیسے تازہ گلاب کے پھول شبنم میں نہائے ہوں۔ وہ دیوار کے سہارے آسمان کی طرف اپنا چہرہ اٹھائے، آنکھیں موندے دھیرے دھیرے کچھ گنگناتی ہوئی بارش کی پھواروں کو ایسے دعوت دے رہی تھی کہ ''میں نے اپنے

آپ کو تمہارے حوالے کر دیا آ ؤ آ کر میرے رخسار، میری آنکھیں اور میرے لبوں کو اپنے لمس سے سرشار کر دو''۔ وہ آنکھیں بند کئے اُن لمحوں میں ڈوبی ہوئی تھی اور وہ اس سرشاری میں بھیگتا چلا گیا۔ غزالہ کا بھرا بھرا بھیگا ہوا گداز جسم، کھلی سیاہ گھنی زلفوں سے ٹپکتا پانی اُسے خود سے بھی بے خبر کر گیا۔

وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے لاتعلق، وہی آخری سیڑھی پر ساکت کھڑا رہا مگر اُس کے دل کے چور نے تصور میں ہی آگے بڑھ کر اُس کے بھیگے بھرے بھرے جسم کو بانہوں میں بھر کر اُس کی تپش محسوس کر لی۔ اس سحر زدہ ماحول میں وہ اتنا کھویا کہ یہ بھی بھول گیا کہ ان دونوں کے بیچ پندرہ سال کی گہری کھائی ہے اس کی ایک بیوی بھی ہے ایک چار سال کا بیٹا بھی ہے۔ اسے پتا ہی نہیں چلا دل کے دروازے کب کھُل گئے اور دل کے نہاں خانوں میں خواہش کی ننھی سی کلی چٹکی جس نے اُسے محبت کے جذبات سے آشنا کر دیا۔

ساون میں کِھلی خواہش کی وہ ننھی سی کلی دل ہی دل میں پنپنے لگی، جواں ہونے لگی۔ اُس نے اپنی خواہشوں کو ضبط کرنے کی اُنھیں جکڑنے کی، باندھنے کی بڑی کوشش کی مگر یہ محبت کی خوشبو اُس کی بند مٹھی سے پھسل کر پورے وجود کو تر بتر کر گئی۔ پھر یہ خوشبو بڑھتے بڑھتے اس کے وجود کے حصار سے نکل کر اُس کے اردگرد ہواؤں میں اپنا جادو بکھیرنے لگی اور یہ بھینی بھینی خوشبو کا احساس غزالہ کو بھی ہونے لگا۔ راشد کا دل اب اُس کے اختیار سے باہر تھا۔ وہ لبوں کو تو خاموش رہنے کا حکم دے سکتا تھا مگر اس کا دل بغاوت پر اتر آتا اور اُس کی آنکھوں کی چمک سے سب حال بیاں ہو جاتا جس کی شدت سے غزالہ کے سرد جذبات بھی پگھلنے لگے تھے۔ بقول انجان:

عقیدت شرط ہے یاروں محبت اور عبادت میں
یہ جذبہ گر سلامت ہو تو پتھر بھی پگھلتا ہے

زبیدہ بی بی کی تجربہ کار آنکھوں نے اُن کی آنکھ مچولی کا کھیل اور ان کہی کیفیت کو محسوس کر لیا۔

بیٹی کے مستقبل کو لے کر زبیدہ بی بی اُس دن سے پریشان تھیں جب وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھی۔ ہر جوان ہوتی لڑکی کی ماں بیٹی کے لیے فکرمند ہوتی ہے مگر اُس کی فکر کی وجہ قدرت کے فیصلے کو لے کر تھی جس نے اس کی بچی کے ساتھ ناانصافی کر دی تھی۔ وہ اپنے خدا سے ناراض تھی کہ اُس نے اس کی بچی کو اس نعمت سے محروم رکھا جس سے وہ مکمل عورت بن سکے۔ والدین نے کوئی در نہیں چھوڑا چاہے وہ ڈاکٹر ہو، درگاہ ہو، پیر فقیر ہو، کوئی سجدہ کوئی تعویذ کوئی دعا کام نہیں آئی۔ دھیرے دھیرے یہ بات سارے خاندان میں پھیل گئی کہ غزالہ آدھی ادھوری ہے اس میں ماں بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ خاندان سے کسی اچھے رشتے کی انہیں امید تھی ہی نہیں۔ اسی لیے والدین نے اسے تعلیم دے کر اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ اب انہیں یہ فکر ستانے لگتی کہ اُن کے بعد غزالہ کا کیا ہوگا۔

بیوہ زبیدہ بی بی نے جب راشد کی آنکھوں میں اپنی بیٹی کے لیے چمک دیکھی تو ماں کے دل میں ایک آس کی اُمید جاگی۔ انہیں اس بات کی پرواہ نہ تھی کہ وہ اُس کی بیٹی سے پندرہ سال بڑا ہے، پہلے سے شادی شدہ ہے ایک بچے کا باپ بھی ہے۔ انہیں تو بس اپنی بیٹی کے لیے ایک شریک حیات مل رہا تھا جس کو اُس سے اولاد کی بھی توقع نہ ہو۔

راشد نے غزالہ کو قبول کر کے اپنی خواہش تو پوری کر لی مگر اس کی خبر ملتے ہی ریحانہ نے اُس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ زبیدہ بی بی بیٹی کی ذمہ داری سے فارغ ہو کر حج کی تیاریاں کرنے لگیں اور راشد ریحانہ کو راضی کرنے کی تراکیب سوچنے لگا۔ بار بار وہ یہ دھمکی دے رہی تھی کہ وہ انور کو ساتھ لے کر مائیکے چلی جائے گی۔ انور کی خاطر دونوں میں یہ طے ہوا کہ غزالہ کبھی اُس گھر میں قدم نہیں رکھے گی۔ یہ گھر ہمیشہ اُسی کا رہے گا۔ وہ کبھی خوشی یا غمی میں ایک دوسرے کو نہیں ملیں گے۔ اُس گھر میں غزالہ کا نام لینا اُس کا ذکر کرنا منع تھا البتہ راشد جب بھی اُس کے پاس ہوتا تو اپنی زندگی کی ہر چھوٹی بڑی بات، ہر خوشی ہر مسئلہ غرض کہ سب کچھ اُس سے بانٹتا۔

جب تک راشد کی پوسٹنگ آدم پور تھی غزالہ کی زندگی بڑی پُرسکون تھی۔ مہینے میں دو دن کے لیے ہی راشد ریحانہ اور انور کے پاس جاتا مگر جب سے اُس کا تبادلہ پُرانے دفتر میں ہو گیا تو اُس کی زندگی میں بھی تبدیلی آ گئی۔ دونوں دُور ضرور تھے مگر دن میں کئی کئی بار فون پر موبائل پر بات ہو جاتی کہ دوری کا احساس ہی نہ ہوتا۔ ہر پندرہ دن بعد راشد بیگ اٹھاتا اور غزالہ کے پاس آدم پور پہنچ جاتا۔ آدم پور کا نام سنتے ہی ریحانہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نظر آنے لگتے۔ اس وقت اس کا چہرہ ایسے لگتا جیسے کسی نے زبردستی کڑوی کسیلی دوائی منہ میں ٹھونس دی ہو۔ مگر وہ خاموش رہتی۔

راشد سے نکاح کے بعد بھی غزالہ کی زندگی وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کے لیے وقت تھم سا گیا تھا۔ راشد کی خود کی زندگی بڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ انسان کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ بڑھاپے کا احساس تو اُسے اپنے بچوں کو جوان ہوتے دیکھ کر ہوتا ہے۔ کہنے کو تو وہ انور کی چھوٹی ماں تھی مگر اپنی امّاں کی طرح اس نے بھی کبھی اس رشتے کو قبول نہیں کیا تھا۔

نادرہ بُوا نے چائے کی پیالی اُس کے بستر کے پاس رکھی اور اُس کے قریب ہی بیٹھ کر اُٹھانے لگیں۔ کتاب اُس کی آنکھوں سے لگی تھی۔ شاید پڑھتے پڑھتے سو گئی ہو۔

''بٹیا آج چھٹی ہے کیا؟''

''نہیں بُوا چھٹی کل لوں گی راشد آ رہے ہیں''

''پکی بات ہے ناں!''

''یہ کیا بات ہوئی بُوا۔ کوئی ضروری کام آن پڑے تو دوسری بات ہے وگرنہ اُن کا پروگرام۔۔۔''

''پچھلے تین مہینے سے یہ ہی سن رہی ہوں مگر دولہے میاں ہر بار

ضروری کام میں پھنس جاتے ہیں''

''آپ میرا ناشتہ تیار کردیں مجھے دیر ہورہی ہے''

یہ کہہ کر اُس نے بُوا کو وہاں سے روانہ کردیا جو منہ میں نہ جانے کیا بُڑبُڑاتی نکل گئیں اور وہ سکول جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ دماغ میں بُوا کی باتیں ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھیں۔

پچھلے تین مہینوں سے راشد آدم پور کا پروگرام بناتا مگر ہر بار کوئی نہ کوئی اڑچن پڑ جاتی اور اُسے پروگرام ملتوی کرنا پڑتا۔ جب جب اُس نے غزالہ کو نہ آنے کی خبر دی تب تب وہ کرچی کرچی ٹوٹتی بکھرتی۔

راشد نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اس کے پاس ہی رہے گا مگر جب وہ ریٹائر ہوا تو انور نے اپنے نئے کاروبار کی ذمہ داری باپ کو سونپ دی۔ راشد کا اپنا پیسہ بھی لگا تھا اس کاروبار میں لہٰذا اُس نے غزالہ کو یہ کہہ کر مطمئن کرایا کہ:

''جوان بچہ ہے نا تجربہ کار بھی ہے۔ اتنا پیسہ لگا ہے خیال تو رکھنا ہی پڑے گا۔ پھر تمہاری نوکری بھی ابھی ہے۔ تم سارا دن سکول جاؤ گی تو میں اکیلا گھر میں کیا کروں گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب جلدی جلدی آیا کروں گا۔''

اس کی یہ بات بھی ماننے کے علاوہ اس کے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ راشد کی بٹی ہوئی زندگی سے وہ تھک چکی تھی۔ مگر وہ شکایت بھی نہیں کرسکتی تھی۔ نکاح سے پہلے ہی اُس نے غزالہ کو سب باتیں کھُل کر صاف صاف کہہ دی تھیں۔

''تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میرے دل میں تمہارے لیے کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میری شادی ریحانہ سے دس سال پہلے ہوئی۔ ریحانہ میری ماموں زاد میری ماں کی پسند اور بچپن کی ساتھی ہے۔ ہماری شادی بچپن میں ہی طے ہوگئی۔ وہ میرے آٹھ سال کے بیٹے انور کی ماں بھی ہے۔ وہ ایک اچھی بیوی اور اچھی ماں بھی ہے۔

میں بڑی پُرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ اپنی زندگی سے مطمئن بھی تھا۔ پھر تبادلہ ہوکر تمہارے شہر آ گیا۔ تم لوگوں کے یہاں کرایہ پر کمرہ ملا تو صرف اپنے کام سے کام رکھا۔ صبح سے شام دفتر اور شام کے بعد اپنی کتابیں اپنا کمرہ۔ چھٹی ہوئی تو گھر کا رستہ دیکھا۔ اُس روز بارش میں تمہیں بھیگتے دیکھا تو میری پُرسکون زندگی میں طوفان آ گیا۔ دل کا دھڑکنا کیا ہوتا ہے، محبت کسے کہتے ہیں، کسی کو چاہنے اور اُسے پانے کی طلب کیسی ہوتی ہے، خواہشوں کا پنپنا پھر ٹوٹ کر بکھرنے کا درد کیا ہوتا ہے، تمہاری چاہت نے ان احساسات سے آشنا کردیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میری زندگی ادھوری ہے۔ تمہاری چاہت کے بغیر میں مکمل نہیں۔ تمہیں پانے کی چاہ کو میں مسلسل دباتا رہا۔ اور جب امّاں نے اپنی خواہش کا اظہار دبے لفظوں میں کیا تو میں یہ موقعہ کیونکر ضائع کرتا۔

جانتا ہوں میں اس وقت خودغرضی کی بات کررہا ہوں۔ مگر تمہیں بتانا ضروری ہے میں ریحانہ اور انور کو کبھی چھوڑ نہیں سکتا وہ میری ذمہ داری ہیں۔ وہ دونوں کسی بھی صورت ہمارے رشتے کو قبول نہیں کریں گے۔ اس کا ایک ہی راستہ نکلتا ہے کہ تم اپنی نوکری جاری رکھو تو میں دونوں گھروں کی ذمہ داریاں پوری کرسکتا ہوں۔ مگر اس کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت پڑے گی۔

غزالہ نے پوری وفاداری سے اُس کا ساتھ دیا۔ کبھی اُس کی ذمہ داریوں کے بیچ نہیں آئی۔ ہر لڑکی کی طرح اس نے بھی چاند ستاروں کی خواہش ضرور کی تھی مگر کبھی اس طرح کی بٹی ہوئی زندگی اُس کے حصے میں آئے گی یہ اُس نے نہ سوچا تھا نہ چاہا تھا۔

راشد سے فون پر دن میں کئی کئی بار بات ہوجاتی مگر اب وہ باتیں بھی بڑی مختصر ہوگئی تھیں۔ وہی گھسے پٹے جُملے ''کیسی ہو؟ کیا کررہی ہو؟ نیا کیا ہے؟'' پھر وہی ''اور۔۔۔۔'' جیسے اب کوئی اور بات کرنے کو نہیں ہے فون رکھ دیا جائے۔ وہ گزرے لمحے، وہ میٹھی یادیں اور یہ بدلتے حالات، اس کی تنہائی، اس کا اکیلا پن اُسے پریشان کرنے لگتے تھے۔ راشد کی مصروفیت بڑھی تو غزالہ کی تنہائیاں بڑھتی گئیں۔ دھیرے دھیرے اُس کے دل میں یہ بات گھر کرگئی کہ جیسے اُسے پہلے محسوس ہوتا تھا کہ راشد اس کے بغیر جی نہیں پائے گا اب اُسے یوں لگنے لگا کہ راشد کی زندگی میں اس کی خاص ضرورت نہیں ہے۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا راشد کی مصروفیت بڑھتی گئی۔ پہلے بیٹے کے کاروبار کا سیٹ کرنا پھر اُس کی شادی کا مسئلہ۔ یہ مسئلہ سلجھ گیا تو شادی کے ہنگامے۔ انور کی شادی میں وہ چاہ کر بھی شریک نہیں ہوسکی۔ راشد نے کہا ضرور کہ ''تم کو بھی آنا ہے''۔ مگر وہ جانتی تھی کہ ماں بیٹا اُسے ایک آنکھ بھی برداشت نہیں کریں گے اور اُس وقت وہ راشد کے لیے کوئی نیا مسئلہ کھڑا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے انور کو سہرا باندھے دیکھنے کی تمنا دل میں ہی دبالی اور دلہا دلہن کے لیے ڈھیر سارے تحفے خرید کر راشد کے ہاتھ بھیج دیئے۔ ادھر شادی کا ہنگامہ تھا اور اِدھر غزالہ اپنی تنہائی کے خول میں دھنستی جارہی تھی۔ شادی کے بعد جب راشد آیا تو ساتھ میں فوٹو البم بھی لے آیا۔ اس کا تعارف دلہن اور باقی رشتے داروں سے تصویروں کے ذریعے ہی ہوا۔ سب کو خوش دیکھ کر اُسے اپنی محرومیوں کا احساس شدت سے ہوا۔ جلد سے جلد آنے کا وعدہ راشد پورا نہ کرسکا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ اب صحت بھی ڈھلنے لگی تھی۔ عمر اپنا رنگ دکھانے لگی تھی۔ دن بہ دن صحت گرتی جارہی تھی۔ اب وہ سفر سے بھی کترانے لگا۔ غزالہ نے اس سچائی سے بھی سمجھوتہ کرلیا۔ اس نے اب گلہ کرنا بھی چھوڑ دیا۔ بدلتے حالات، بدلتی زندگی سے وہ بظاہر سمجھوتہ کرتی رہی مگر اندر سے ٹوٹتی بکھرتی رہی۔ اسے اپنی زندگی اپنا وجود بے مقصد بے معنی لگنے لگا۔

اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ رشتوں کی بھی عمر ہوتی ہے۔ کبھی وہ وقت بھی تھا جب اُن کے رشتے میں بچپنا تھا جب وہ ایک دوسرے کو دیکھے بنا ایک دن بھی رہ نہیں سکتے تھے۔ پھر اُن کا رشتہ جوان ہوا تو راشد کو بھاگتے لمحوں سے ہمیشہ گلہ رہتا اُسے یہ شکایت رہی کہ ''نہ جانے کیسا جادو کردیا ہے تم نے کہ نہ ہاتھ تھکتے

ہیں، نہ لب تھکتے ہیں اور نہ دل بھرتا ہے'' اور اب شاید شباب کے دور سے نکل کر اُن کا پیار بھی اُس کی طرح پیری کی دہلیز پر جا پہنچا ہے۔ ناتواں جسم کی طرح اس کے جذبات، اس کے احساسات، اس کی ضرورتیں بھی سرد پڑ گئی ہیں۔ مگر یہ ایک ایسی سچائی تھی جسے وہ قبول کر چکی تھی۔ سچائی تو یہ بھی تھی کہ اُسے آج بھی راشد کی ضرورت تھی۔ اُس کے ساتھ کی، اس کے پیار کی۔ مرد کا پیار دل سے شروع ہوتا ہے اور عورت کے جسم کو پا لینے کے بعد وہ سمجھتا ہے کہ اس نے عورت کا پیار پا لیا وہ پُرسکون ہو جاتا ہے جبکہ عورت مرد کے جسم سے پرے اس کے ذہن و دل پر اپنا قبضہ اپنی ملکیت جمائے رکھنا چاہتی ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ بے چین ہو اُٹھتی ہے۔ اور اب غزالہ کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ راشد کے دل و ذہن پر اُس کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اُسے چاہے جانے والی شدت اب اُسے محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس شدت کے لیے ترس رہی تھی تڑپ رہی تھی۔ یہ سحر شاید اس کی زندگی سے گزر چکا تھا کبھی نہ لوٹنے کے لیے جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی یا پھر نظر انداز کر رہی تھی اسے قبول نہیں کرنا چاہتی تھی۔

دوپہر کو وہ سکول سے لوٹی تو ڈھیر سارا سامان بھی ساتھ تھا۔ آتے ہی نادرہ بُوا کو تھما دیا۔

''بُوا کل سے میں دس دن کی چھٹی پر ہوں۔ آپ کو سارا سامان لا دیا ہے اب بس راشد کے پسندیدہ کھانے کی تیاریاں کر لیں کہ کس روز کیا بنے گا''

اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ راشد نے فون پر بتایا تھا کہ صبح سات بجے ہی چل پڑے گا اور بارہ بجے تک پہنچ جائے گا۔ اس بار وہ جلدی جانے کے لیے نہیں آ رہا۔

''اطمینان سے رہوں گا اور جب اجازت دو گی تبھی جاؤں گا''

یہ سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ پہلی بار اُس نے بھی دھمکی دی تھی

''اگر اس بار بھی تم نہ آئے تو قسم سے میں اپنا وعدہ توڑ دوں گی اور خود چلی آؤں گی وہاں۔ ساری عمر تمہاری باتیں سُنتی آئی ہوں اب نہیں سُنو گی۔ بیوی ہوں تمہاری دُنیا کے سامنے نکاح کیا ہے بھگا کر نہیں لائے جو خاموشی سے سب برداشت کرتی رہوں''۔

''میں تمہیں موقع ہی نہیں دوں گا کہ تمہیں اپنے وعدے سے مکرنا پڑے''

غزالہ نے بھی سوچ لیا تھا کہ اگر راشد ہمیشہ کے لیے اُس کے پاس رکنے کو تیار ہو جائے تو وہ نوکری چھوڑ دے گی۔ اب وہ دل میں کوئی بات نہیں رکھے گی۔ ہر بات، ہر جذبہ اس پر ظاہر کر دے گی۔ اس بار تو وہ اس کی ایک نہ سنے گی وہ چاہے کتنا ہی منع کرے۔ اُسے بارش میں ٹہلنے ضرور لے جائے گی۔ بارش میں راشد کے ساتھ بھیگنے کا سرور ہی کچھ اور ہے۔ رات دیر تک وہ گھر کو سجانے سنوارنے میں لگی رہی۔

صبح فون کی گھنٹی کی آواز سُن کر اُس کی نیند کھلی۔ اُس نے گھڑی دیکھی آٹھ بج چکے تھے۔ اتنی دیر تک تو وہ کبھی بھی نہیں سوتی۔ بُوا نے بھی نہیں اٹھایا۔ اس نے یہ ہی سوچ کر فون اٹھایا کہ راشد کا فون ہو گا بتانے کے لیے کہ چل چکا ہے۔ ہیلو کی تو دوسری طرف نلیش شرما تھا۔

''سب خیریت اتنی صبح صبح فون؟'' اس نے ناگواری سے پوچھا۔

''غصہ کیوں ہوتی ہو۔ میں نے تو یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ میں جس آشرم کی تم سے اُس روز بات کر رہا تھا۔ دو بزرگ تو رہنے کو آ بھی گئے۔ اگر تم کچھ وقت نکال سکتیں تو اس کے بارے میں بیٹھ کر بات کر لیتے۔

''نلیش سُنو! آج راشد آ رہے ہیں۔ پہلے میں اُن سے بات کروں گی پھر آگے کی سوچوں گی۔ ابھی مجھے بہت سے کام کرنے ہیں بعد میں بات کرتے ہیں''

''جیسے تم ٹھیک سمجھو'' اس کی مایوسی غزالہ سے چھپی نہ رہ سکی۔ ابھی وہ فون رکھ کر مُڑی ہی تھی کہ پھر گھنٹی بج گئی۔

''ہیلو''

''غزالہ میں بول رہا ہوں۔ فون بہت Busy آ رہا تھا؟''

''یہ بتاؤ کہاں پہنچے؟'' اس نے اُس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنا سوال داغ دیا۔

''میں یہ کہہ رہا تھا۔۔۔'' وہ بولتے بولتے ہکلانے لگا۔

غزالہ کا دل ایک دم سے بیٹھ گیا۔

''غزالہ تم سن رہی ہو ناں؟''

''بولو''

''صبح ہی ریحانہ کی طبیعت خراب ہو گئی اُسے لے کر ہسپتال آیا ہوں''

''کیا ہوا؟''

''سینے میں درد کی شکایت کر رہی تھی۔ ابھی تو ٹھیک ہے ڈاکٹر کہہ رہے ہیں گھبرانے کی بات نہیں پر سبھی ٹیسٹ کروانے پڑیں گے''

اس نے اتنا سنتے ہی اُس نے فون رکھ دیا۔ ایک بار پھر راشد وعدہ کر کے نہیں آئے۔ ایک بار پھر اُس کے خواب کرچی کرچی ہو کر بکھر گئے۔ بس اب اور نہیں۔ وہ اپنی باقی زندگی اس طرح انتظار کی صلیب پر لٹک کر نہیں کاٹ سکتی۔ وہ اب آدھی ادھوری زندگی بسر نہیں کرے گی۔ یا تو اُسے سب کچھ چاہیے یا کچھ بھی نہیں۔ فون کی گھنٹی لگاتار بج رہی تھی، نادرہ بُوا کچن سے کہہ رہی تھیں ''فون اٹھا لو بیٹا'' اس نے ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ دیا۔ موبائل بجنا شروع ہوا۔ راشد لائن پر تھا اس نے فون کاٹ کر بند کر دیا۔ پورے اعتماد کے ساتھ نشست سے اُٹھی۔ ثابت قدموں سے آگے بڑھی۔ پانچ منٹ میں تیار ہو کر گاڑی نکال کر گھر سے باہر تھی۔ اُس کا ذہن اُس کی گاڑی سے تیز بھاگ رہا تھا اور گاڑی سمندر کی طرف سڑک پر دوڑی چلی جا رہی تھی مگر یہ وہ ہی جانتی تھی کہ یہ گاڑی نلیش کے فلیٹ کی طرف جا رہی ہے یا راشد کے شہر یا پھر ہر بار کی طرح اس کے ننگے پاؤں گیلی ریت سے لپٹ کر لوٹ آئیں گے!!!

شہد

ڈاکٹر شکیل احمد خان

(حیدرآباد، سندھ)

''دوستو! مبارک ہو سرکاری بجٹ آنے سے پہلے ہی ہماری آمدنی میں خاصا اضافہ ہوگیا ہے'' کانسٹیبل اشرف نے پنکھے کے نیچے کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب۔۔۔؟'' میز کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے ہیڈ کلرک اسد نے حیرت سے پوچھا۔

''او یار۔۔تو نے آج کے اخبار میں ٹریفک چالان کی فیسوں میں اضافے کا نہیں پڑھا۔۔۔!''

''ہاں۔۔ہاں۔۔وہ تو پڑھا ہے، پھر۔۔!''

''پھر یہ کہ ہمارا کمیشن اس اضافے کی وجہ سے دگنا ہوجائے گا، اب ہم بھی بیس پچاس کی بجائے ڈرائیوروں سے سو، دوسو پکڑیں گے، بڑھ گئی ناں آمدنی۔۔۔بس اسی بات پر چائے منگالے'' اشرف ہنستے ہوئے بولا۔

اسد نے پٹے والے کو دو چائے لانے کا اشارہ کیا اور پھر میز پر جھکتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''اشرف بھائی۔۔اب تو رشوت لینا چھوڑ دو۔۔ابھی پچھلے مہینے تمھیں دل کا دورہ پڑا ہے''۔

''ہاں۔۔تُو پوسٹنگ ٹرانسفر پر اپنا کمیشن لیتا رہ، اس لیے کہ تجھے ابھی دل کا دورہ نہیں پڑا ہے۔۔او یار، رشوت سے دل کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔۔وہ دیکھ اپنے ملاّ احمد کو۔۔۔''

اشرف نے برابر والی میز پر بیٹھے احمد کی طرف گردن سے اشارہ کیا۔

''یہ بھی تو رشوت نہیں لیتا، پھر اسے کیوں دل کا عارضہ لاحق ہوا۔؟''

''اس بیچارے کو بیچ میں کیوں گھسیٹ رہے ہو یار، رشوت نہ لینے کا مطلب ہے اس کا ریکارڈ لگانا اور اسے ملاّ ملاّ کہنا، یہ تو زیادتی ہے''۔

''اوہو۔۔آج تو بڑی حمایت لے رہا ہے ملاّ کی۔۔۔خیریت تو ہے''۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے، اس کا بیٹا تین دن سے بخار میں پھک رہا ہے، ملاّ سے روزانہ دعا کے لیے کہتا ہے'' عابد کانسٹیبل درمیان میں بولا، وہ کچھ دیر پہلے ہی کمرے میں داخل ہوا تھا۔

''یار بیٹے کا مذاق نہیں، میں اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں، اگر دعا کے لیے احمد سے کہہ دیا تو کیا برا کیا'' اسد غصے سے بولا۔

''اوئے عابد۔۔تُو واقعی کبھی کبھی اپنی حد سے نکل جاتا ہے، اپنی زبان پر کنٹرول رکھا کر'' اشرف نے عابد کو آنکھیں دکھائیں ''یار تو اپنے پتر کا ٹیسٹ ویسٹ کرا، یہ آج کل ڈینگی بہت چل رہا ہے، خدانا خواستہ، میرے منہ میں خاک، وہ نہ ہو'' اشرف نے اسد سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

''وہ تو نہیں ہے، البتہ ملیریا ہے،'' اسد نے دکھی لہجے میں کہا۔

''فکر نہ کر، اللہ سب خیر کرے گا۔۔۔''

سب نے مل کر زور سے ''آمین'' کہا

''یار اس احمد کا بھی کچھ سوچو، مجھے تو اس کی بھی فکر کھائے جا رہی ہے'' اسد احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''کیوں۔۔؟ اب اس کا کیا مسئلہ ہے۔۔؟'' عابد پھر بیچ میں بولا۔

''مسئلہ وہی پرانا ہے، اس نے انجیو گرافی کے وقت بھی ہم سے رقم نہیں لی تھی اور اپنی ساری جمع پونجی اور بیوی کا زیور اس پر لگا دیا تھا، اب بائی پاس کے لیے بھی یہ ہم سے مدد لینے کے لیے تیار نہیں ہے، جب کہ ڈاکٹر نے جلد از جلد آپریشن کروانے کے لیے کہا ہے'' اسد نے تشویش ظاہر کی

''اوئے انسان دا پتر بن۔۔۔'' اشرف اپنا اور اپنی کرسی کا رخ احمد کی طرف موڑتے ہوئے جذباتی انداز میں بولا ''تیرا بڑا بھائی، اللہ اسے جنت نصیب کرے میرا بڑا اچھا یار تھا، اس کے ناتے میں بھی تیرا وڈا ہوں،۔۔۔اوئے ٹھیک ہے ہم رشوت لیتے ہیں، ہماری رقم میں یہی خرابی ہے ناں۔۔۔لیکن تیرے لیے تو یہ رقم قرضہ ہوگی، آپریشن کے بعد واپس کر دینا''۔

احمد نے کمپیوٹر سے نظریں ہٹائیں اور ان کی طرف منہ کر کے نہایت نرمی سے بولا۔

''برا نہ منائیں اشرف بھائی، میرے لیے یہ رقم کسی طرح بھی قابل قبول نہیں، اللہ نے مجھے اس امتحان میں ڈالا ہے، وہی مجھے اس امتحان سے نکالے گا بھی، میں کل اپنے آبائی شہر جا رہا ہوں، وہاں میرے پیر و مرشد حضرت صاحب رہتے ہیں، وہ طب سے بھی وابستہ ہیں، مجھے یقین ہے اللہ ان کی دعا اور دوا کے طفیل مکمل صحتیابی عطا فرمائے گا، آپ سب اگر میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں تو صرف دعا کیجیے، میرے لیے یہی بہت ہے''۔

''جیسی تیری مرضی پتر۔۔'' اشرف نے احمد کا جواب سن کر نہایت مایوسی سے کہا۔ اسد نے بھی اپنا چہرہ نیچے کر لیا

''میں بھی کل بائی پاس کرانے کے لیے لمبی چھٹی پر جا رہا ہوں، اگر تجھے میری کہیں ضرورت پڑ جائے تو بتا دینا، چل یار عابد۔۔۔'' اشرف نے عابد کے کاندھے پر بے دلی سے ہاتھ مارا ''شام تک کچھ اور مرغے پکڑ لیں، آپریشن پر نہ جانے کتنا خرچہ آ جائے۔۔'' یہ کہہ کر وہ اور عابد کلرکس روم سے چلے گئے۔

ایک ماہ بعد اشرف آفس جوائن کرنے کے لیے جب کلرکس روم

پہنچا تو وہاں احمد کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، وہ سیدھا اس کے پاس چلا گیا، احمد نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا اور اشرف کی خیریت دریافت کرنے لگا۔

''کیا ہوا اشرف بھائی؟ خاصے کمزور نظر آرہے ہیں؟''

''ایک مہینے سے تو تُو نے کوئی خبر نہیں لی کہ میں زندہ ہوں کہ مر گیا، اب سامنے ہوں تو خیریت پوچھ رہا ہے، یہ منہ دیکھے کی محبت، پتر مجھے پسند نہیں'' اشرف نے ہلکی پھلکی ناراضی کا اظہار کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔۔۔ میں آپ کی خیریت اسد بھائی سے لیتا رہا ہوں، مجھے یہ بھی علم ہے آپ کا آپریشن بلڈ پریشر بڑھے رہنے کی وجہ سے نہیں ہو سکا'' احمد نے اپنی صفائی پیش کی۔

''یہ تو ٹھیک ہے، لیکن خیریت معلوم کرنے کے لیے ایک کال تو ہو سکتی تھی! گھر تو آسکتے تھے!''

''آپ کو پتا ہے جب سے میرا موبائل چھنا ہے، میں نے دوسرا نہیں لیا، آفس کا فون میں ذاتی استعمال میں لیتا نہیں۔ رہی بات آپ کے گھر گلشنِ حدید آنے کی تو اتنی دور کے لیے ہمت نہیں کر پایا اور ویسے بھی مجھے آفس سے سیدھا گھر جانا ہوتا ہے، بیوی بچے اکیلے ہوتے ہیں' احمد نے سادگی سے جواب دیا۔

''ہر بات کا جواب ہے تیرے پاس۔۔۔ خیر۔۔۔ یہ بتا تیرے دل کا کیا حال ہے؟''

''اللہ کا بہت بڑا کرم ہے'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے سرشاری سے کہا ''دو دن پہلے ہی ای سی جی اور ایکو کرایا تھا، بہت معمولی سی رکاوٹ رہ گئی ہے، ڈاکٹر بھی رپوٹ دیکھ کر حیران تھا''۔

''یہ سب کیسے ہوا پتر۔۔۔؟'' اشرف نے تعجب سے اس کی میز کے اور قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''شہد سے، میرے مرشد نے مجھے زیادہ سے زیادہ شہد کھانے اور نیم گرم پانی میں ملا کر پینے کا مشورہ دیا تھا، اس میں اللہ تعالیٰ نے موت کے علاوہ ہر مرض کے لیے شفا رکھی ہے''

''لیکن اس کے اثر کے لیے ضروری ہے کہ وہ جائز کمائی سے خریدا گیا ہو اور آئندہ کے لیے حرام کمائی سے توبہ بھی کر لی جائے'' اسد اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا، وہ دونوں اس کی آمد پر چونکے، انہیں اپنی گفتگو میں پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب کمرے میں داخل ہوا۔

''اوہو تو یہ بات کر رہا ہے، کیا گنگا نہا کر آرہا ہے؟'' اشرف نے طنز کیا۔

''جب اوپر سے ہدایت مل جائے تو پھر کسی گنگا ونگا کی ضرورت نہیں رہتی اشرف بھائی، اللہ تمھیں بھی ہدایت دے''۔

''ابے کیا یہاں سب ہی ملاّ ہو گئے ہیں، او بھائی تو میری آج سے جوائننگ کے کاغذات بنا، سائن وائن بعد میں ہوتے رہیں گے، دھندے کا وقت ہے، میں صاحب سے مل کر چوکی پر جا رہا ہوں' وہ یہ کہتے ہوئے برابر والے کمرے میں چلا گیا۔

دوپہر کو جب احمد اور اسد ظہر کی نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوئے تو وہاں اشرف کو دیکھ کر حیران رہ گئے، اشرف نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا لیکن کچھ بولا نہیں، نماز سے فارغ ہو کر اسد اور احمد مسجد سے باہر نکل آئے اور ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اشرف کا انتظار کرنے لگے، تھوڑی دیر بعد وہ بھی باہر آگیا اور سر جھکائے ان کے پاس چلا آیا۔

''یار دیکھو، مجھ سے کوئی سوال جواب مت کرنا۔ میں دل سے ہر بات کے لیے شرمندہ ہوں'' یہ کہتے ہوئے اشرف کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

اسد صورت حال کو بھانپتے ہوئے ان کے قریب آیا اور گلے میں دایاں بازوں ڈال کر بولا ''ایسی کوئی بات نہیں ہے اشرف بھائی، ہم تو یہاں تمھیں آفس اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کھڑے تھے، تمھاری جوائننگ بھی تیار کر دی ہے''

''نہیں اسد۔۔ میں ابھی مزید چھٹی کرنا چاہتا ہوں،'' اسکے لہجے میں درد امڈ آیا تھا ''تو نے ہدایت کی بات سچ کہی تھی، میں آفس ہی آرہا تھا کہ آج ظہر کی آذان سن کر نہ جانے کیوں میرے قدم خود بہ خود مسجد کی طرف اٹھ گئے اور۔۔۔ سب کچھ بدل گیا یار۔۔۔ سب کچھ''

پھر وہ احمد کی طرف مڑا اور نہایت عاجزی سے کہا ''پُتر۔۔۔ پانچ سو روپے ادھار تو دے۔ جلد لوٹا دوں گا''

''ارے اس غریب کے پاس پانچ سو کہاں۔۔ یہ لیں مجھ سے لے لیں'' اسد نے اپنی جیب سے نوٹ نکال کر اشرف کی طرف بڑھا دیا

''پگلے اس سے دگنی تگنی رقم تو میری جیب میں بھی پڑی ہے۔۔۔ پھر تیری کمائی میں بھی ابھی کچھ کسر باقی ہوگی'' وہ اسد کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے صرف حلال کمائی کی رقم چاہیے اور وہ احمد پتر کے علاوہ کس کی ہو سکتی ہے''

''مجھے گناہ گار نہ کریں اشرف بھائی، میرے پاس یہ ساڑھے تین سو روپے ہیں، اگر آپ کے کسی کام آجائیں تو مجھے خوشی ہوگی'' احمد نے اشرف کی جانب رقم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں اس سے کام چل جائے گا، فی الحال کم مقدار میں خرید لوں گا'' اشرف نے رقم لے کر اپنی جیب میں رکھ لی۔

''آخر لینا کیا ہے؟'' اسد نے جھنجھلاتے ہوئے پوچھا۔

''زندگی بھر کی حرام کمائی سے دل میں جو گند جمع ہو گئی ہے، اس کی صفائی کے لیے، میرے بھائی شہد خریدنا ہے'' اشرف کی بات سن کر ان دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''قولِ فقیہہ''

محمودالحسن
(راولپنڈی)

سوئے عدم رواں ہیں کوئی راہبر نہیں
کیسا سفر کہ جس میں کوئی ہمسفر نہیں

تصویرِ خستگی کی اگر بام ودر نہیں
اہلِ خرد کا ہوگا ہمارا وُہ گھر نہیں

کہتے ہیں میرے حال کی اُن کو خبر نہیں
یہ بے رُخی تو میری وفا کا ثمر نہیں

ہر ہر قدم پہ یُورشِ آلام گر نہیں
کچھ بھی سہی وہ راہ تری رہگذر نہیں

خود بین و خود شناس نہیں، خود نگر نہیں
عشق اس کے باوجود مگر بے بصر نہیں

کہیے اُسے کہ اہلِ جنوں سے ہر فیض یاب
قولِ فقیہہِ شہر ابھی معتبر نہیں

ہر سمت دیکھ دیکھ کے آخر کھُلا یہ راز
آنکھیں تو بے شمار ہیں، اہلِ نظر نہیں

جلوہ نما وُہ شاہدِ رعنا ہے ہر طرف
کیا پُوچھتے ہو ہم سے کہاں ہے، کدھر نہیں

دل بھی تو سوزِ عشق و محبت سے ہے تہی
پھر اس کا کیا گلہ کہ دعا میں اثر نہیں

دھوئے بھی اپنے دل کی سیاہی تو کس طرح
دامن ہی جس کا اشکِ ندامت سے تر نہیں

جو رہنما ہے نقشِ کفِ پا ہے آپ کا
انجم نہیں ہے، شمس نہیں ہے، قمر نہیں

جلوے ہیں اُن کے عارض و گیسو کے ہر طرف
اس کے سِوا کچھ اور تو شام و سحر نہیں

اللہ کا دِیا تو ہے سب کچھ ہمارے پاس
لیکن اگر نہیں تو متاعِ ہنر نہیں

آلامِ روزگار کا اس میں گذر ہے کیوں
آخر یہ میرا دل ہے کوئی رہگذر نہیں

ہر اِک تمہاری بزم میں موجود ہے مگر
محمودِ خستہ حال سا آشفتہ سَر نہیں

○

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

لاکھ طوفان گزرنے دیتے
دل سے آسان گزرنے دیتے

راستہ دے چکے شیطانوں کو
ایک انسان گزرنے دیتے

کو چۂ عشق میں رکنا کیسا
ہم کو انجان گزرنے دیتے

اٹھ گئے بعد حصولِ مطلب
آن دو آن گزرنے دیتے

سفرِ جان کو کر تے آ سان
پہلے سامان گزرنے دیتے

ہوش گزرے نہیں پورے جاوؔید
سارے اوسان گزرنے دیتے

○

سرورانبالوی
(راولپنڈی)

کسی کے سامنے یہ سر کبھی جُھکا ہی نہیں
ترے حضور جھکا ہے تو پھر اُٹھا ہی نہیں

بس ایک بار تجھے آنکھ بھر کے دیکھا تھا
پھر اُس کے بعد نظر میں کوئی جچا ہی نہیں

مرے شعور، مری فکر پر مسلط ہے
تمام عمر میں جس سے کبھی ملا ہی نہیں

نہ جانے وقت کے ماتھے پہ کیوں شکن آئی
تمہارا نام تو میں نے ابھی لیا ہی نہیں

رُخِ حیات پہ زُلفیں بکھیرنے والے
چراغِ مہر و وفا تو ابھی جلا ہی نہیں

پلک پلک پہ ستارے سجے ہیں جس کے لیے
وہ اس طرح سے ملا جیسے جانتا ہی نہیں

یہ اور بات تری بزم سے ہم اُٹھ آئے
ہمارے بعد چراغِ وفا جلا ہی نہیں

ہجوم سیم تناں میں سُرور رہتا ہے
ترے سوا تو اُسے اور کچھ پتا ہی نہیں

○

غالب عرفان
(کراچی)

مخاطب کر کے اکثر بولتا ہے
مرے اندر سمندر بولتا ہے

ہوا طوفان بنتی جا رہی ہے
چٹانوں کا بھی پتھر بولتا ہے

فضا خاموش ہو جائے اچانک
تو سنّاٹے کا منظر بولتا ہے

نہ جانے کیوں ہے وہ چپ چاپ آخر
جو یوں تو مجھ سے بہتر بولتا ہے

بنایا میں نے جو اس مورتی میں
مرے اندر کا آزر بولتا ہے

جو ہے اندر سے کچھ باہر سے کچھ ہے
وہ جب بولے تو بن کر بولتا ہے

بہت دن بعد جب واپس ہوا تو
ہوں میں خاموش اور گھر بولتا ہے

ہم عرصے بعد مل جائیں کبھی تو
گِلوں، شکوں کا دفتر بولتا ہے

سفر میں فاصلہ اور وقت بھی اب
رہِ عرفاں سے ہٹ کر بولتا ہے

○

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

ودیعت تجھ سے ہر آنسو ہے مائے
مری یادوں میں تُو ہی تُو ہے مائے

کتابت میں ترا احساس مجھ کو
کتابوں میں تری خوشبو ہے مائے

اسے مل جائے تیرے بن میں مسکن
یہ دل بھٹکا ہوا آہو ہے مائے

اسی سے گھر گل و گل زار ہوگا
ترا حرفِ دعا جادو ہے مائے

میں کیسے اپنے ماں جائے سے روٹھوں
مرا بھائی مرا بازو ہے مائے

میں کس میلے میں جاؤں کس کو دیکھوں
مرے تو سامنے اک تُو ہے مائے

تری تربت پہ رکھنے آ گیا ہوں
ہتھیلی پر مری جگنو ہے مائے

اسے دل سے جدا ہونے نہ دینا
یہ ثاقب تیرا ہی ''باہُو'' ہے مائے

○

تشنہ بریلوی

(کراچی)

ہوش کی سن لے میکش مت بن، ساغر بن جا پیمانہ بن
دور سے آئیں پیاس بجھانے، بننا ہے تو میخانہ بن

بانکی سجیلی ناریاں آئیں، سیس نوائیں نرت دکھائیں
عشق نہیں ہے تیرے بس کا، مندر بن جا بت خانہ بن

چھوڑ نگر کی ہر اک محفل، راہِ وفا میں کب کوئی منزل
عشق و جنوں کا ہے یہی کہنا، جنگل صحرا ویرانہ بن

قصّہ کہانی لکھنا کیسا، سارا جگ ہی ایسا ویسا
قصّہ کہانی تج دے لیکھک، درد بھرا اک افسانہ بن

من میں تیرے کیا یہ سمایا، تن کا سودا کرنے آیا؟
پیسہ دھیلا ایک جھمیلا، تحفہ ہدیہ نذرانہ بن

دل بنتا ہے روز نشانہ، نگری نگری دل کا فسانہ
دل کے ستم سے جان چھڑانے تو داغِ دل کا دیوانہ بن

گلشن میں ہر ایک مگن ہے، تیرا نصیبہ رنج و محن ہے
گھائل پنچھی تو ہے تشنہؔ، اب خاکِ پرِ پروانہ بن

○

سریواستوا رندؔ

(نوئیڈا، بھارت)

بکھرتی سوچ کا اِک دائرہ ہوں
میں اپنی ہی غزل کا قافیہ ہوں

رسالوں میں کتابی سلسلہ ہوں
مگر شہرِ غزل میں لاپتہ ہوں

میں اک دشتِ برہنہ، بے کراں سا
خلا میں گونجتا اِک قہقہہ ہوں

سُلگتی سی تھکن ہوں آسماں کی
سرابوں کا زمینی سلسلہ ہوں

میں دروازے پہ چسپاں خشک دستک
خزاں آہٹ کا زخمی سلسلہ ہوں

کبھی دشتِ سرابِ سنگ ہوں میں
کبھی کانٹوں پہ چلتا راستہ ہوں

مری تہذیب ہے میری امانت
پرانی نسبتوں کا مرثیہ ہوں

میں ہوں اسّی برس کا رندؔ لیکن
گئی تہذیب کا اِک سلسلہ ہوں

○

پروفیسر خیال آفاقی (کراچی)

پتھّر ہوں ، آئینہ ہوں؟ مجھے بھی تو دیکھئے
کیا سمجھوں میں کہ کیا ہوں، مجھے بھی تو دیکھئے

اچھا ہوں کہ بُرا ہوں، مجھے بھی تو دیکھئے
جیسا ہوں آپ کا ہوں، مجھے بھی تو دیکھئے

خود کو تو آپ دیکھ چکے ہیں ہزار بار
میں کیسا لگ رہا ہوں، مجھے بھی تو دیکھئے

کس کی طرف نہیں توجہ حضور کی
میں کب سے چپ کھڑا ہوں، مجھے بھی تو دیکھئے

ساحل کی آرزو میں سفینے کو چھوڑ کر
موجوں سے آملا ہوں، مجھے بھی تو دیکھئے

سیرِ چمن میں مجھ سے کہا خار نے جناب
میں بھی یہیں پڑا ہوں، مجھے بھی تو دیکھئے

آئے نہ آئے جس کا بھروسا نہیں کوئی
اسی دم پہ پھولتا ہوں، مجھے بھی تو دیکھئے

بولا دوا فروش کے مجمع میں اک فقیر
میں درد بیچتا ہوں، مجھے بھی تو دیکھئے

وہ ہے ہر اک فکر وتخیل سے ماورا
میں اس کو سوچتا ہوں، مجھے بھی تو دیکھئے

ارض و سما میں آپ کی تمثیل ڈھونڈ کر
میں خود میں آچھپا ہوں، مجھے بھی تو دیکھئے

ہر ذرّہ مجھ کو روک کے کہتا ہے اے خیالؔ
میں اک جہاں نما ہوں، مجھے بھی تو دیکھئے

انتظار باقی
(جھنگ)

محل ہواؤں کی دیوار پر بنانے لگے
اندھیری شب میں چراغِ سحر جلانے لگے

نہیں کسی بھی ستارہ شناس کی حاجت
نجو م خود ہی مرا زائچہ بنانے لگے

وہ جن کی اپنی شبیہیں بھی نامکمل تھیں
وہ مجھ کو ٹوٹا ہوا آئنہ دکھانے لگے

نمو پذیر تھیں یادیں عجیب طرح سے
شجر پہ بُور نہ آیا تو عکس آنے لگے

جلا لیے ہیں پرندوں نے اپنے بال و پر
دیئے کے طاق انہیں اپنے آشیانے لگے

نجانے کونسی خوبی ہمارے اندر تھی
تمام لوگ ہمیں رازداں بنانے لگے

عجیب طرز کے نازک طبع ہیں لوگ یہاں
جو برگِ خشک کی آہٹ سے خوف کھانے لگے

ہوئی تھی درد کو سہنے کی ایک عادت سی
بچے نہ خار تو پھولوں سے زخم کھانے لگے

بگاڑ پائے گی کیا دھوپ ہجر کی باقیؔ
کہ صحنِ قلب میں یادوں کے آشیانے لگے

○

پروازانبالوی
(بھارت)

چھتوں پہ شام کے کچھ سائے جب اُترنے لگے
بگڑ چکے تھے جو چہرے وہ پھر چمکنے لگے

اُداسیوں کا یہ جھونکا کہاں سے آنکلا
رفاقتوں کے دیئے سسکیاں سی بھرنے لگے

وہ دھوپ، شاخوں پہ پھوٹی تھیں کونپلیں، جس سے
ہوئی جو تیز تو باغوں کے باغ جلنے لگے

یہی ہَوا کہ جو مرتی ہے آج پھولوں پر
عجب نہیں کہ اُنہیں پاؤں سے مسلنے لگے

ابھی ہے وقت اگر ہو سکے تو آن مِلو
نہ جانے سلسلہ سانسوں کا کب بکھرنے لگے

گھروں کے بند رہے رات بھر جو دروازے
وہ تیرے پاؤں کی آہٹ پہ آپ کھُلنے لگے

یہ کیا ہوا ہے کہ پرواؔز اسی نئی رُت میں
جو زخم بھرنے لگے تھے وہ پھر اُبھرنے لگے

○

پروفیسرزہیرکنجاہی
(راولپنڈی)

عشق پر تیرے قرباں اے دل
یہ محبت کا ہے ارماں اے دل

یوں تو سب پیار کیا کرتے ہیں
مجھ سا کوئی نہیں قرباں اے دل

شعر لکھے ہیں وطن کی خاطر
تُو بھی ہوتا ہے غزل خواں اے دل

حکم رانوں نے اِسے لوٹ لیا
تُو بھی ایسے میں ہے نالاں اے دل

اِس پہ جاری ہے خدا کی رحمت
ہم کو رکھتا ہے وہ شاداں اے دل

تجھ سے نسبت یہ رہی ہے اپنی
تُو نے بخشا غمِ جاناں اے دل

کتنا غم گیں ہے بھرے گھر میں زہیؔر
سارا ماحول ہے ویراں اے دل

○

صدیق شاہد
(شیخوپورہ)

پناہ کوئی نہیں ، بارگاہ کوئی نہیں
فریبِ عصر سے بچنے کی راہ کوئی نہیں!

ہر ایک گام پہ دھرتی کا تخت ڈولتا ہے
پناہ دینے کو عالم پناہ کوئی نہیں

غمِ زمانہ، غمِ یار، سب کچھ اس میں ہے
ہمارے دل کے سمندر کی تھاہ کوئی نہیں

ہوا کی چاپ ہے باہر نہ پاؤں کی آہٹ
نکل کے دیکھ ہی لوں گھر سے خواہ کوئی نہیں

فضا کی تیرگی دل میں یہ وہم ڈالتی ہے
ستارہ کوئی نہیں ، مہر وماہ کوئی نہیں

وفا کا قرض جتاتے تھے سب مری جاں پر
میں جاں بہ کف ہوں تو اب قرضخواہ کوئی نہیں

میں جانتا ہوں کہ جو ہوگا معرکے کا حال
سپاہ دار سبھی ہیں سپاہ کوئی نہیں

رہِ حیات سے شاہدؔ وقار سے گزرو
پھر اس کے بعد سفر جانکاہ کوئی نہیں

○

مقبول منظر
(جھارکھنڈ، بھارت)

ظالموں سے برسرِ پیکار ہونا ہے ابھی
آندھیوں کے روبرو دیوار ہونا ہے ابھی

ہم سفر ہیں آبجو کے یہ جو قطراتِ حقیر
مل کے دریا سے انہیں منجدھار ہونا ہے ابھی

کر رہے ہیں خون سے اپنے جسے سیراب ہم
سنگلاخ اس دشت کو گلزار ہونا ہے ابھی

کر رہے ہیں وہ بھروسہ کاغذی نوکاؤں پر
جن کو طوفانِ بلا سے پار ہونا ہے ابھی

جو سُلگتی دھوپ لے کر سر پہ میرے ہے سوار
دن ڈھلے اُس کو پسِ دیوار ہونا ہے ابھی

چھوڑ کر گھر میں جو نکلا تھا مجھے معلوم تھا
گردشِ حالات سے دوچار ہونا ہے ابھی

روک پاؤ گے نہیں تم انقلابِ وقت کو
تم کو اس کے واسطے تیار ہونا ہے ابھی

بے زباں الفاظ کو منظرؔ زباں جو دے سکے
ایسا جادو گر تجھے فنکار ہونا ہے ابھی

○

جاوید زیدی
(نیویارک)

ایک حیرت سے نکل کر دوسری حیرت میں ہوں
زندگی کی دسترس یا موت کی قدرت میں ہوں

پاؤں تھامے ہے مری واماندگی ، منزل کہاں
ہوں محبت کا مسافر ، قریۂ نفرت میں ہوں

اتّفاقاتِ زمانہ ہیں، مرا ہے کیا یہاں؟!
میں حوادث کا امیں ہوں، سایۂ وحشت میں ہوں

سچ کا جھوٹا نام ہے اور جھوٹ ہے یاں باوقار،
دیکھتا ہوں رنگِ محفل، لمحۂ عبرت میں ہُوں

اِک عجب حالت ہے دل کی اِک عجب احساس ہے
حالِ زارِ دل لکھوں کیا، میں عجب حالت میں ہُوں

○

عرش صہبائی
(جموں، کشمیر)

اب بھی ہے جانگزیں اس دل میں محبت اُس کی
وہ اگر دور ہے مجھ سے تو یہ قسمت اُس کی

نظر انداز جو کردیتا ہے آوازِ ضمیر
اپنی نظروں میں بھی رہتی نہیں عزّت اُس کی

ہر کلی کو ہے گلہ بادِ صبا سے اتنا
جب بھی چلتی ہے یہ لے اُڑتی ہے نکہت اُس کی

مسکراتے ہوئے جو کچھ بھی کہا نظروں نے
خود بھی کر پایا نہیں ہے وہ وضاحت اُس کی

جس نے حق گوئی کو ہے زندگی میں اپنایا
میرے دل میں کبھی کم ہوگی نہ عزّت اُس کی

اُس کے ماحول کا انساں پہ اثر ہوتا ہے
کچھ بھی ہو جائے بدلتی نہیں خصلت اُس کی

اُس نے ہر جورِ مسلسل سے نوازا ہے مجھے
زندگی میں نہ چُکا پاؤں گا قیمت اُس کی

دور رہ کر وہ مرے پیشِ نظر رہتا ہے
میرے احساس میں تحلیل ہے صورت اُس کی

زندگی جس کی گزر جاتی ہے سجدوں میں عرشؔ
کاش بیدار کبھی ہو سکے غیرت اُس کی

○

میں بھی ڈیانا ہوں

فرخندہ شمیم
(راولپنڈی)

اپنی اپنی سلطنت میں دنیا کی ہر لڑکی شہزادی ہوتی ہے۔ اُسی جیسی نازک احساسات کی مالک۔۔۔ اسی کی طرح ملکہ بننے کے خواب دیکھنے والی۔ چاہے وہ کوئی عام سی لڑکی ہی کیوں نہ ہو سکول ٹیچر ڈیانا کی طرح۔ کسی بھی ڈیانا کو اس کے شہزادی ہونے کی تمنا کو نہیں روکا جا سکتا۔۔۔ جہاں تک میری بات ہے میں تو مکمل ڈیانا جیسی ہوں۔ ایک سکول میں پڑھاتی تھی جب ناصر نے مجھ سے کہا تھا۔

''فرزانہ۔۔۔ آپ تو بالکل پرنسس نظر آتی ہیں۔ کسی محل کے سپید ستونوں جیسی رنگت، محل کے ہال کمروں میں جلتے فانوس جیسی آنکھیں، آرائشی محرابوں جیسا بدن، سنہری بال اور انیس سال کی عمر''۔ آپ تو ہو بہو لیڈی ڈیانا جیسی ہیں۔ تب میں ناز و ادا میں اور بھی تن گئی تھی۔۔۔ ''اپنی تعریف خود کرنا اچھا تو نہیں لگتا لیکن میں بھی کسی چارلس سے کم نہیں ہوں'' وہ ہنسا تھا۔

''تیسری دنیا میں رہنے والا ایک باشندہ اگر ایک کارخانے کا مالک ہو، عالی شان کوٹھی میں رہتا ہو اور مستقبل میں اپنے باپ کے کل اثاثوں کا اکلوتا وارث ہو تو وہ بھی کسی شہزادے سے کم نہیں ہوتا۔'' ناصر نے ایک خوبصورت اعتماد کے ساتھ کہا تھا۔ پھر وہی ہوا جو لیڈی ڈیانا کے ساتھ ہوا تھا۔ میں اپنے شہزادے کے ساتھ اس کے محل میں آباد ہو گئی۔ محل کا ڈسپلن بڑا سخت تھا۔ میری ساس بڑی بااصول تھیں۔ گھر میں نوکروں کی ایک لمبی قطار تھی جس سے وہ بڑی مہارت اور ہوشیاری کے ساتھ نمٹتی تھیں۔ اسی قطار میں وہ کبھی کبھی مجھے بھی شامل کر لیتی تھیں اور ان کا روّیہ میرے ساتھ بھی ایک ملازم جیسا ہو جاتا تھا۔ ایسے میں، میں پریشان سی ہو جاتی۔

ناصر کی غیر مشروط محبت نے میری چاہت کو اس کے احترام میں بدل دیا تھا اور میں ایک حسنِ بے بہا رکھنے کے باوجود اِترانا چھوڑ چکی تھی۔ جب ناصر کو یہ یقین ہو گیا کہ میں اس کی محبت میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں تو وہ ایسے مطمئن ہو گیا جیسے کوئی زندگی کا بیمہ کرانے کے بعد حادثے سے بے خوف ہو جاتا ہے۔ اس دوران میرے سسرال میں میرے حُسن اور انداز کے چرچے عام ہو چکے تھے۔ ناصر کی کزنز اور رشتہ دار لڑکے ہم دونوں کو رشک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ناصر نے ایک سے ایک ڈریس اور ایک سے بڑھ کر ایک گہنا دنیا بھر سے منگوا کر میری نذر کر دیا تھا اور میں انہیں پہن کر بالکل ڈیانا جیسی لگتی تھی۔

میرا خیال ہے حسن میں ایک عجیب سا اعتماد ہوتا ہے کبھی کبھی بہت اونچی اڑان اڑنے لگتا ہے اور نیچے زمین پر کھڑے محل بھی اُسے جھونپڑی دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے یہ احساس بھی دلایا جاتا تھا کہ ناصر بے شک پرنس چارلس کی طرح بااثر ہے لیکن جس طرح چارلس شکل وصورت میں ڈیانا سے کئی قدم پیچھے کھڑا نظر آتا تھا اسی طرح ناصر بھی میدانِ حسن کا محض سپاہی ہے میں ڈیانا جیسی سحر انگیز اور نوخیز ہوں اور ناصر مجھ سے بہت دبتا ہے لیکن سیانے کہتے ہیں کہ مرد کے لیے صرف سٹیٹس ہونا ضروری ہوتا ہے جو اس کے ان گنت عیب چھپا لیتا ہے بالکل جس طرح حُسن عادتوں کی بدصورتی پر اکثر پردہ ڈالے رہتا ہے۔ خوبروئی کے بعد میری زندگی کی دوسری بڑی خوشی میری کوکھ کے صحن میں اترنے والا وہ پہلا چاند تھا جسے ناصر کی ریاست کا ولی عہد بننا تھا۔ اس نے بلا تکلف اپنے بیٹے کا نام کراؤن پرنس رکھ چھوڑا تھا۔ میرے بیٹے کو بھی اپنی دادی یعنی مادر ملکہ کے نظم و نسق کا سامنا تھا۔ ابتدائی عمر ہی میں اُسے بورڈنگ سکول بھجوا دیا گیا۔ میری آغوش سونی ہو گئی۔ چند سال بعد وہ کھیلوں کی تربیت پر چلا گیا۔ بعد میں اُسے آسٹریلیا بھیج دیا گیا پڑھنے کے لیے میں ہکا بکا دیکھتی رہ گئی۔ کچھ نہ بول سکی۔ ناصر ایفائے محبت کے نام پر مجھ سے کبھی ختم نہ ہونے والے انتظار کا وعدہ لے چکا تھا۔

اس نے دوبارہ میری گود بھی آباد نہیں کی۔ اس کا بیشتر وقت بزنس سپاٹس اور نائٹ کلبوں میں گذرنے لگا تھا۔۔۔ میں بے زار ہونے لگی۔ خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کی لیکن کہاں کرتی۔۔۔ ساس، ماں نہیں بن سکتی تھی جو اُسے اپنی تنہائیوں کے نوحے سناتی، سہیلی بنانے کی اجازت نہیں تھی کہ میرے محل جیسے سسرال میں باہر سے صرف باندی آ سکتی تھی سہیلی نہیں۔ والدین میرے تھے نہیں جو ان کی چھاؤں میں روتی ہوئی عمر کاٹ لیتی۔۔۔ میرا شوہر گھر نہیں آتا تھا۔۔۔ مجھے اپنا آپ ایک اکیلی شہزادی جیسا لگنے لگا تھا۔ جس کے پاس سچ مچ کے زر و جواہر ہوں اور سچ مچ کا ہیروں جیسا حُسن، لیکن اس کا قدر دان کوئی نہ ہو۔ ایک دن تو مجھ پر قیامت ہی ٹوٹ گئی۔۔۔ میری اس قدر بے حرمتی ہو گی یہ تو میں نے سوچا تک نہیں تھا۔ ناصر ان ساری امانتوں میں جو اس کے جسم میں میری تھیں، خیانت کر چکا تھا۔۔۔ میں نے اُسے سونگھتے ہی بتا دیا تھا کہ اب اس کے اندر کوئی استعمال شدہ خوشبو ناچ رہی ہے۔۔۔ وہ بھاؤ کھا گیا۔۔۔ پے در پے طمانچے اس نے میرے رخسار پر جڑ دیئے۔ میرا شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے واقعی چوری کی تھی۔ تھانے دار کب برداشت کرتا ہے کہ اس کی چوری عملے کا کوئی معمولی سا سپاہی پکڑ لے۔ وہ اسے جرم ضعیفی کے عوض لاک اپ میں بند کر دیتا ہے۔ میرے چارلس کی زندگی میں بھی ایک پامیلا پار کر آ چکی تھی۔ جو آزادی سے Move کر سکتی تھی جبکہ میں قیدِ شہزادی میں بند گھر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔

اچانک ناصر نے گھر میں میرے الاؤنسز بڑھا دیے۔ میرا جیب خرچ تگنا کر دیا۔ اس نے مجھے سب کچھ دے دیا لیکن اپنا آپ دوبارہ نہیں سونپا۔ میں اس کے چہرے پر چارلس کی بے رحمی اکثر دیکھتی تھی جو ڈیانا کے لیے اس کے

باقی صفحہ ۸۲ پر ملاحظہ کیجیے

''ایڑی میں آنکھ''

نجیب عمر
(کراچی)

آ ؤ شفیق، ادھر آ جاؤ۔

وہ شفیق کو لیے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اس نے بیگم کو آواز دی۔

''کومل شفیق کے لیے چائے اور ساتھ کچھ وائے ضرور لانا''۔

شفیق ہنسنے لگا اور بولا ''بھابی کو کیوں زحمت دیتے ہو، تم تو جانتے ہو، اتوار کی صبح تم سے ملے بنا طلوع ہی نہیں ہوتی''

''یہ میں بھی جانتا ہوں اگر تمہیں آنے میں دیر ہو جائے تو پھر میں تم سے ملنے چل پڑتا ہوں''

تھوڑی دیر بعد کومل چائے کی ٹرے لیے داخل ہوئی جس میں کیک بھی رکھا تھا۔

''کل تمہاری بھابی کی سالگرہ تھی۔ یہ کیک اس کی باقیات ہیں''

''تم نے ذکر نہیں کیا، ورنہ میں کوئی گفٹ لے کر آتا''

''ڈونٹ بی فارمل، میں اور کومل تمہارے خلوص کی قدر کرتے ہیں، خیری ہمارا ساتھ تو بیس برس پرانا ہے تاہم کومل بھی تمہیں دو سال سے جانتی ہے۔ شفیق اب تمہاری شادی بھی ہو جانی چاہیے۔ کہاں ہم منصوبہ بنایا کرتے تھے کہ ایک گھر میں دو بہنیں ڈھونڈیں گے اور شادی کے ذریعہ ہم دوستی کو رشتے داری میں بدل دیں گے۔ لیکن انسان سوچتا کچھ ہے اور اوپر والے کی مرضی کی ہمیں خبر نہیں ہوتی''

''اسی لیے تو کہتے ہیں، مین پریوز زاینڈ گاڈ ڈسپوزز'' شفیق نے لقمہ دیا۔

''لیکن میرا خیال ہے اب شادی میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ اگر تمہاری مرضی شامل ہو تو ہم کومل کو بھی مارکٹنگ میں لگا دیتے ہیں''

''اس سے اچھی کیا بات ہوگی۔ میں شفیق بھائی کے کسی کام آ جاؤں'' کومل نے اضافہ کیا۔

شفیق کے جانے کے بعد کومل نے دریافت کیا ''یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ شفیق بھائی کی پسند کیا ہے تا کہ اس کے مطابق لڑکی تلاش کی جائے، شفیق کوالیفائیڈ، ریپوٹڈ ملازمت، بھلا خاندان انہیں رشتے کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ انہیں کوئی لڑکی پسند نہیں آتی۔ ان کے خاندان کے لوگ بھی سرگرم ہوں گے۔ ہم بھی کوشش کر لیتے ہیں۔ میری تو کوئی بہن نہیں ورنہ آپ لوگوں کے منصوبہ کی تکمیل ہو سکتی تھی۔''

''کومل! خیر تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہو تو بتانا ضرور''

میرے میاں کے ایک دوست ہیں بلکہ جگری دوست ۔ دانت کاٹے روٹی جیسا تعلق ہے۔ ماشاءاللہ اچھی خاصی پرسنالٹی ہے۔ اچھی ملازمت ہر طرح آسودہ حال ۔ انہیں کوئی لڑکی پسند نہیں آتی۔ ایک عدد دلہن کی تلاش ہے۔ اب مجھے بھی اس تلاش میں شامل کر لیا گیا ہے۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں اپنے میاں سے ڈسکس نہیں کر سکتی۔ سوچا تم میری ہمراز ہو، تم مجھے صائب مشورہ دے سکتی ہو۔

وائی ناٹ، کومل۔ ضرور، کبھی ہمیں بھی تو ملواؤ۔ میں تم سے سینئر ہوں اور قیافہ شناسی میں مجھے قدرے دخل ہے۔ میں ان سے مل کر ہی کوئی پروپوزل دے سکتی ہوں۔

تم کسی دن میرے گھر آ جاؤ، ملوائے دیتی ہو۔ لیکن تم نے تو م میری بات سنی نہیں۔

ارے سناؤ بھئی، میں ہمہ تن گوش ہوں۔

''شفیق جیسے لوگ ہمارے معاشرے میں خواب وخیال کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ایسے کنوارے پٹھے پر ہاتھ رکھنے نہیں دیتے۔ سنا ہے موصوف کے آگے کئی پروپوزل رکھے گئے لیکن انہوں نے تمام رد کر دیئے۔ ان کی بوڑھی ماں نے تو یہاں تک کہہ دیا شفیق جہاں کہے میں شادی کے لیے راضی ہوں بس اس کا گھر بس جائے''

دیکھتے ہیں تمہاری قیافہ شناسی کہاں تک ہمارے کام آتی ہے۔ تمہارا ایک ڈیمو مجھے یاد ہے۔ شادی کی ایک تقریب میں تمہارے ایک شناسا نے تمہارا امتحان لیا کہ اس تقریب میں اس کے پانچ بھائی اور دو بہنیں موجود تھیں جنہیں تم جانتی نہیں تھیں تاہم تم نے ان کے چار بھائیوں اور دو بہنوں کو ڈھونڈ نکالا۔ سائل نے کہا میرا ایک بھائی ابھی رہتا ہے اُسے کھوج لیجیے میں آپ کی سو فی صد کامیابی کا اعلان مائیک پر کر دونگا۔ تم پھر سرگرم ہو گئیں لیکن پندرہ منٹ بعد تم نے دعویٰ کر دیا کہ ان کے وہ بھائی اس وقت شادی ہال میں نہیں اب سائل کے پاس فرار کی کوئی راہ نہیں تھی اور انہوں نے اعتراف کیا کہ بجا میرے ایک بھائی سمندر پار ہیں۔ پھر تم نے مہابھارت کا وہ تاریخی جملہ دہرایا تھا کہ بیوپاری آئندہ کسی سور یہ ونشی آریہ ورت کو آزمانے کی غلطی نہیں کرنا۔

یہ تو قیافہ شناسی کا معمولی مظاہرہ ہے ۔ عربوں کو اس میں کمال حاصل تھا۔ دو بھائی ساتھ ساتھ سو رہے تھے۔ سائل نے قیافہ شناس سے کہا میں چادر ہٹائے دیتا ہوں۔ آپ دونوں جوانوں کے درمیان رشتہ معلوم کیجیے۔ اس نے جواب دیا اس کی ضرورت نہیں اور چادر ہٹا کر صرف ٹخنہ اور پنجہ دیکھ کر بتا دیا کہ یہ سوتیلے بھائی ہیں یعنی ان کی ماں ایک ہے لیکن والد مختلف۔ جواب سن کر

سائل نے سر پیٹ لیا کہ یہ تو سگے بھائی ہیں۔ قیافہ شناس نے کہا۔ ان جوانوں کی ماں ہی میرے دعویٰ کی تصدیق کر سکتی ہے۔ کوئی اور نہیں اور اس کے لیے بھی انہیں غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔

''خیر بہت ہوگئی قیافہ شناسی اب میری اڑچن سنو۔ میری ایک آبزرویشن ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے شفیق صاحب کی شخصیت ہمارے سامنے پوری طرح کھلی نہیں ہے۔ جب میں اپنے میاں سے ذکر کرتی ہوں تو وہ اسے تسلیم نہیں کرتے۔ کہتے ہیں ان کے لڑکپن کا ساتھی ہے اور ان کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔

''تم جانو، کچھ لوگ اپنے راز اس طرح پالتے ہیں کہ کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔ بہرحال یہ میرا قیاس ہے۔ ممکن ہے غلط ہو، مجھے شفیق سے ہمدردی ہے۔ اس کا گھر بس جائے میرے لیے خوشی کی بات ہوگئی''

''اچھا، اب شفیق صاحب سے جلد ملاقات کی سبیل نکالو تاکہ میں قیافہ شناسی کا عملی مظاہرہ کرسکوں''

''ایک شام یہ اہتمام بھی ہوگیا۔ دوسرے روز کومل نے اپنی دوست کو صبح سویرے ہی جگا دیا۔ ہاں بھئی تمام رازوں سے جلدی پردہ اٹھاؤ میں نے رات بڑی مشکل سے گزاری''

''ارے صبر کرو۔ میرے حواس تو بحال ہونے دو۔ میں ناشتے کے بعد تمہیں فون کرتی ہوں''

دوست کی روداد سن کر کومل کو بڑی مایوسی ہوئی۔ کوئی سین سیشن ہی نہیں کہ ''شفیق ایک سنجیدہ اور بردبار شخص ہے، مہربان اور پرخلوص کوئی پھل کپٹ نہیں۔ چلو ہم مل کر ان کے لیے ایک مناسب نا کتخدا ڈھونڈتے ہیں اور اپنے میاں سے کہنا ذرا ڈٹ کر پروپوز کریں آخر دام میں آ ہی جائیں گے''

دو مہینے کی تگ و دو کے بعد وہ ہیرا تلاش کر ہی لیا گیا کہ وہ مہتاب سے بھی سوا تھی جس میں کوئی داغ نہیں۔ ہاتھ لگاؤ تو لگتا تھا میلی ہو جائے گی۔ خاندانی پس منظر اعلیٰ وارفع۔ تعلیم یافتہ۔

کومل نے اپنی دوست سے کہا'' دیکھتے ہیں کیسے انکار کرتے ہیں اور وہی ہوا کہ شفیق نے اپنے دوست سے فیصلہ کرنے کے لیے ہفتے بھر کی مہلت مانگ لی۔ کومل اور اس کے میاں کو سو فیصد مثبت جواب کو توقع تھی۔

لیکن مہلت ختم ہونے سے دو روز قبل شفیق اپنے دوست کو لے کر لانگ ڈرائیو پر نکلا اور ایک سنسان جگہ گاڑی روک کر جب شفیق نے اپنا انکار سنایا تو اسے حیرت کے ساتھ ساتھ مایوسی بھی ہوئی لیکن شفیق بولتا گیا۔

اس مرتبہ کومل بھابی کا انتخاب اتنا عمدہ اور شاندار ہے کہ میں سرسری انکار نہیں کرسکتا اسی لیے میں تمہیں یہاں لے آیا۔

میرے دوست ہمارا دیرینہ ساتھ ہے اور ہم ایک دوسرے کے لیے کھلی کتاب ہیں لیکن میرے دل میں ایک پھانس چبھی ہوئی ہے جس کے عواقب و نتائج مجھے چین سے رہنے نہیں دیتے۔ آج میں تمہارے سامنے اعتراف کرنا چاہتا ہوں میں پارسا نہیں۔ آج سے تین سال قبل حادثاتی طور پر ایک لڑکی میری زندگی میں آئی اور ہم تمام حدود و قیود پار کر گئے۔ یہاں تک تو احساسِ گناہ اور احساسِ ندامت لیکن جب سے مجھے اس حقیقت کا ادراک ہوا ہے مجھے کسی پل چین نہیں۔

وضاحت تو کرو میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔

مجھے بتایا گیا کہ یہ کائنات کی اٹل حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مبنی بر انصاف قانون ہے کہ پاک مردوں کے لیے پاک عورتیں، بدکاروں کے لیے بدکار۔

میں تمہاری بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

یعنی میری ہونے والی بیوی Virgin (کنواری) نہیں ہوگی، چاہے میں کچھ کرلوں۔ اب تم بتاؤ میں کیا کروں؟

میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اللہ کے حدود توڑنے کا ایسا بھیانک انجام بھی ہوسکتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ میں شادی سے ہی انکاری ہوں۔ امیدوار کے کوائف سے ہٹ کر۔ مثلاً اس مرتبہ بھابی کومل نے میرے لیے جو انتخاب پیش کیا ہے میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میری سوچ کچھ یوں ہے کہ اگر موصوفہ پاکباز ہیں، میرا رشتہ ہی نہیں ہوگا اور دوسری صورت میں تم سمجھ رہے ہو میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

میرے یار تم نے تو مجھے بھی چکرا دیا۔ اب مجھے بھی غور و فکر کے لیے تھوڑا وقت چاہیے۔

کومل کافی دیر خاموش رہنے کے بعد گویا ہوئی۔ میں کوئی عالمِ غیب نہیں لیکن شفیق سے متعلق ایک انجانی سی الجھن کا شکار تھی اور اسے کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔

اب شفیق بھائی کا علاج یہ ہے کہ وہ اپنی بھول کا ازالہ آنے والی کے لیے معافی اور درگزر میں تلاش کریں۔ اس سے ان کا اپنا ضمیر ہلکا ہوگا۔ اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کرتے زندگی کے کسی مرحلے میں یہ سب کچھ سامنے آجائے تو فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے سب کچھ بھول جائیں۔

کومل کے شوہر نے یہی بات شفیق کے سامنے رکھی۔ جسے اس نے صدق دل سے قبول کیا۔ اس احساس نے کہ وہ کسی کو معارف کرنے جا رہا ہے۔ کسی کی خطا پوشی کرنے والا ہے۔ اس کو روحانی بالیدگی حاصل ہونے لگی۔ اس کا دل اعتماد سے بھر گیا۔

دوسرے روز شفیق اپنے دوست اور کومل کے سامنے تھا اور رشتے کے لیے ہاں کردی۔

☆

☆ ''عورت کی ایڑی میں بھی آنکھ ہوتی ہے'' عصمت چغتائی

مکمل ہوتا ہوا نوٹ

نصرت بخاری

(اٹک)

''کتنے پیسے ادھر اُدھر کر دیتے ہو، مجھ سے بھی فضول خرچی ہو جاتی ہے، تم نے تو کبھی پروا نہیں کی تھی۔ ایک ٹکڑا گم ہو گیا تو پریشان ہو رہے ہو۔ پانچ سو کا پورا نوٹ ہوتا تو بھی کوئی بات نہیں تھی۔ تمھاری آج کی چھٹی تو اسی کی نذر ہو گئی۔ دن کو کھانا بھی نہیں کھایا۔ اب شام ہو گئی ہے۔ تھوڑا آرام کر لے۔ یہیں کہیں کھونے کھدرے میں پڑا ہو گا۔ صبح ملازمہ جھاڑو دے گی تو مل جائے گا''۔ حبیب کی ماں نے اسے سمجھایا

اب وہ ان کو کیسے بتاتا کہ یہ کوئی عام ٹکڑا نہیں تھا۔ اس کو رہ رہ کے وہ دن یاد آ رہے تھے جب وہ یونی ورسٹی میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ پہلے چند دن کوئی بھولنے والی چیز تھے، جب اس کے تیور بتاتے تھے کہ یونی ورسٹی میں نو وارد ہے، گھبرایا گھبرایا سا، خوف زدہ آنکھیں؛ چہرے کے خدوخال میں رچی معصومیت، چلتے چلتے ڈگمگا سا جاتا۔ اس کا انداز آپ بتاتا تھا کہ وہ کسی دیہاتی علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ رک رک کر جلترنگ جیسی میٹھی آواز والی پریوں جیسی حسین لڑکیوں کو حیرت سے دیکھتا؛ جو اس پر ایک عام سی نظر ڈال کر آگے گزر جاتیں، ان لڑکیوں کو دیکھ کر یہ کسی خیال میں کھو جاتا اور پھر یکا یک کسی خیال سے خود بخود سہم سا جاتا۔

''پہلی بار آنکھ کھولی ہے؟'' قریب سے گزرتے ہوئے لڑکوں کی ٹولی میں سے کسی نے اس کی حالت دیکھ کر جملہ کسا۔

''وہ بھی یونی ورسٹی میں''۔ سب کھلکھلا کے ہنس پڑے۔ پھر وہ گروپ ہاتھوں پر ہاتھ مارتا اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا

اس کے اوسان تو پہلے ہی خطا ہو رہے تھے؛ اس صورتِ حال سے وہ اور سراسیمہ ہو گیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر اس نے کتابوں اور مطالعے میں پناہ لی۔ دوسرے طلبہ سمجھتے تھے کہ یہ کتابیں اور کاپیاں ہی اس کی دنیا ہے کیونکہ وہ کسی سے غیر ضروری بات تک نہ کرتا تھا؛ لیکن ایسا ہرگز نہیں تھا۔ بھلا کسی نے یہ منظر دیکھا ہے کہ آگ جل رہی ہو اور گھی نہ پگھلے؛ اس کو خوابوں میں بھی لڑکیوں کے وجود کی خوش بو آتی رہتی؛ اگر رات کو کسی وقت آنکھ کھل جاتی تو یہ اُٹھ اُٹھ کر دیکھتا کہ ابھی صبح کتنی دور ہے۔ لیکن چونکہ یونی ورسٹی میں نو وارد تھا، اور ابھی کوئی دوست بھی ایسا نہیں بنا تھا جس سے اس معاملے میں کوئی بات کرے۔ یونی ورسٹی میں اس صورتِ حال سے دوچار صرف یہی ایک نہیں تھا؛ دور دراز کے دیہاتی علاقوں سے آنے والا تقریباً ہر لڑکا اس عجیب و غریب کیفیت میں مبتلا تھا۔ پھر اس تمام گھبرائی ہوئی مخلوق نے اپنا ایک گروہ بنا لیا۔ رفتہ رفتہ ان کا اعتماد بحال ہونے لگا تھا۔ پھر تو ان کے پر پرزے نکلنا شروع ہو گئے۔

''یار آؤ ایک کام کرتے ہیں؟'' ایک دن اسی گروہ کے ایک رکن نے کہا

''وہ کیا''؟

''اپنی اپنی پسند بتاتے ہیں؟''

کیا مطلب؟

''بھئی یہی کہ کس کو کون سی لڑکی پسند ہے''؟

''مجھے نیلم پسند ہے''۔ اسی لڑکے نے پہل کرتے ہوئے دل کھول کر سب کے سامنے رکھ دیا۔

''مجھے تو دردانہ پسند ہے''۔ دوسرے نے بھی جھٹ اپنی پسند بتا دی

''تم یہاں پڑھنے آئے ہو یا عشق لڑانے، ماں باپ کے پیسے یوں ہی بے کار چلے جائیں گے؛ اور یہ جو لڑکیاں ہیں نا، جو کبھی کبھار تمھاری طرف مسکرا کر دیکھ لیتی ہیں اور تم لوگ فوراً ان کے شوہر بننے کے خواب دیکھنے لگتے ہو، یہ تمھارے ہاتھ نہیں آنے والی''۔ اس نے ناصح بنتے ہوئے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ باقی لڑکے شرمندہ سے ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔

اگرچہ اس نے اپنی پسند کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس کو کوئی پسند نہیں تھا۔ اس کے دل کے نہاں خانے میں شمشاد کب کی بسیرا کر چکی تھی؛ اور وہ بھی اس کے جذبات سے غافل نہیں تھی، مگر دونوں طرف سے ابھی تک کسی نے اظہارِ محبت نہیں کیا تھا۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب ایک دن ہال میں ایک تقریب کے دوران فیصلہ کیا گیا کہ ہر لڑکا اپنے حصے کی پرچی اٹھائے گا اور اس پرچی پر جو کچھ لکھا ہو گا، اس کو اسی کی اداکاری کرنا ہو گی۔ وہی کچھ کرنا ہو گا۔ اس تقریب میں لڑکے آتے گئے اور اپنے اپنے حصے کی اداکاری کرتے گئے؛ لیکن اس تقریب میں اس کی توجہ کا مرکز صرف اور صرف شمشاد تھی۔ اس دن تو وہ بہت خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا قرعہ نکالا گیا تو اس پر بھیک مانگنا لکھا تھا۔ اس نے فقیروں کی سی چال چلتے ہوئے شمشاد کے آگے دامن پھیلا دیا۔ اس کی اداکاری حقیقت کے اتنے قریب تھی کہ تمام حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ یہ بات صرف وہ اور شمشاد جانتے تھے کہ یہ اداکاری نہیں حقیقت ہے۔ شمشاد نے اپنے پرس سے چند سکے نکال کر اس کی جھولی میں پھینک دیے اور کہا ''بابا دعا کرنا''۔ اس اداکاری پر ہال میں قہقہے گونج اٹھے۔ اس کے بعد ان کی باقاعدہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

''شاید ہم زندگی میں کبھی ایک نہ ہو سکیں''۔ ایک دن شمشاد کا ضبط اس خدشے کی راہ نہ روک سکا۔

''یہ الہام آپ کو کب ہوا؟''۔

''حقیقت پسند بن کر سوچو۔ ہم ایک شہر میں نہیں رہتے، ہماری آپس میں رشتہ داری نہیں، پھر بھلا ہم کیسے ایک ہو سکتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں شاید یونی ورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد ہم کبھی ایک دوسرے سے مل بھی نہ سکیں''۔

''چلو ایک وعدہ کرتے ہیں، ہم ہمیشہ رابطے میں رہیں گے، اور اگر ایک نہ ہو سکے تو کبھی شادی نہیں کریں گے؛ ہم ایک دوسرے کا انتظار کریں گے۔ اگر ہماری نیت ٹھیک ہوئی تو خدا ضرور ہماری مدد کرے گا''۔

''مجھے منظور ہے''۔

''یہ پانچ سو کا نوٹ ہے، آدھا تم رکھ لو، آدھا میرے پاس رہے گا۔ یہ آدھا نوٹ ہمیں ہمیشہ ایک دوسرے کی یاد دلائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آدھا نوٹ ایک دن ضرور مکمل ہوگا''۔ اس نے نوٹ کے دو ٹکڑے کر کے ایک شمشاد کو دے دیا۔

فائنل امتحان کا اعلان ہو چکا تھا اور جدائی کے دن قریب آ رہے تھے۔ ایک ہفتے بعد ان دونوں سمیت فائنل امتحان دینے والے تمام طالب علم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے، شاید زندگی کے کسی موڑ پر پھر ملاقات ہو جائے۔ لیکن یونی ورسٹی چھوڑنے سے پہلے ایک حادثہ ہو گیا۔ ایک طلبہ تنظیم کا رکن اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا، اسے قتل کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے یونی ورسٹی میں فضا صبح سے ہی کشیدہ تھی۔

طلبہ و طالبات اپنی کلاسوں میں جا چکے تھے لیکن ہر ایک کے چہرے پر خوف صاف پڑھا جاتا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ کچھ ہی دیر بعد یونی ورسٹی میں فائرنگ ہونے لگی، طلبہ و طالبات کے ہوسٹل کو آگ لگا دی گئی، کوئی اپنے کمرے میں واپس نہ جا سکا۔ کسی کو کسی کی کوئی خبر نہیں تھی۔ سب اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ اسی افراتفری میں شمشاد اور وہ بھی ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ رابطے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ چونکہ کلاس میں موبائل لانے کی اجازت نہیں تھی، اس لیے دونوں کے موبائل کمروں ہی میں رہ گئے، جس کو آگ چاٹ چکی تھی۔ یونی ورسٹی انتظامیہ نے حالات کو دیکھتے ہوئے ایک ماہ کے لیے یونی ورسٹی بند کر دی۔

حبیب تعلیم مکمل کر کے کچھ عرصہ بے روزگاری کی زد میں رہا اور یہی بے روزگاری اسے ہانک کر شہر لے آئی۔ یہاں اسے ایک ادارے میں ملازمت مل گئی۔ اب تو دس بارہ سال سے وہ اسی ادارے کے لیے کام کر رہا تھا اور وہ اس ادارے کا ایک نیک نام آفیسر تھا۔ اس کے پاس دنیا کی ہر خوشی تھی۔ اگر کمی تھی تو شمشاد کی۔ وعدے کے مطابق اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اسے شمشاد کا انتظار تھا۔ اپنے طور پر اس نے اس تک پہنچنے کی بہت کوشش کی مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود اسے یقین تھا کہ وہ اس کی زندگی میں ضرور آئے گی۔ اس نے وہ پانچ سو کے نوٹ کا ٹکڑا سنبھال کے رکھا ہوا تھا؛ اور وہی نوٹ آج کہیں گم ہو چکا تھا، اور امی کہتی ہیں ایک ٹکڑا ہی تو ہے۔ ان کے لیے بے شک یہ ٹکڑا ہی ہوگا مگر اس کے لیے تو یہ دنیا کی سب سے قیمتی شے تھی۔ وہ جب بھی اسے دیکھتا گویا شمشاد اس کے سامنے آ جاتی۔

وہ اس ٹکڑے کو یوں تلاش کر رہا تھا جیسے شمشاد کو تلاش کر رہا ہو۔ بس ایک چیز کی تلاشی رہ گئی تھی یعنی اس کی بھتیجی منی کے بیگ کی۔ وہ الماری کے اوپر پڑا تھا؛ منی کی یہ عادت تھی کہ وہ بچوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے گھر بھر میں بکھرے کاغذ اپنے بیگ میں ڈالتی رہتی اور اپنی نگرانی میں وہ بیگ الماری کے اوپر رکھوا دیتی کہ مبادا اس کے بیگ سے کوئی کاغذ نکال لے۔ الماری بڑی تھی اس لیے بیگ تک پہنچنے کے لیے اسے کرسی کا محتاج ہونا پڑا۔ اس کی محنت رنگ لائی اور بیگ سے وہ نوٹ برآمد ہو گیا۔ نوٹ پا کر وہ خوشی خوشی کرسی سے اتر رہا تھا کہ وہ پھسل گئی جس سے اس کے سر پر ایسی چوٹ لگی کہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے ہسپتال لے جایا گیا۔ ہسپتال کے ایمرجنسی روم میں جب اس کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر ایک بے ہوش لڑکی پر جھکا ہوا تھا۔ لڑکی کی ماں ایک عورت کو بتا رہی تھی: ''شادی نہیں کرتی بہن، میں نے بہت کوشش کی ہے، اس کے ساتھ کھیلنے پڑھنے والی چار چار بچوں کی مائیں ہیں''۔

''یہ حادثہ کیسے پیش آیا''

''یہ پانچ سو کے نوٹ کا ایک ٹکڑا سنبھال رکھتی تھی؛ آج وہ گم ہوا تو اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے کرسی سے گر گئی۔

اس نے غور سے دیکھا تو وہ زخمی لڑکی شمشاد تھی۔ اسی اثنا میں اسے بھی ہوش آ چکا تھا۔ وہ اس کی ماں کی گفتگو سن رہی تھی جو ایک عورت کو بتا رہی تھی: شادی نہیں کرتا بہن، میں نے بہت کوشش کی ہے، اس کے ساتھ کھیلنے پڑھنے والے چار چار بچوں کے باپ ہیں۔ شمشاد نے حیرت اور خوشی سے اس کی طرف دیکھا۔ پانچ سو کا نوٹ مکمل ہونے لگا تھا۔

''قدردانی''

انیسویں صدی کے معروف امریکی شاعری ریڈگر پولن کی ہاتھ سے تحریر کردہ نظم میری یون کے ایک کلیکٹر نے تین لاکھ امریکی ڈالر میں خرید لی ہے۔ نظم کے نیچے ریڈگر پولن کے دستخط بھی ہیں جس کی تحقیق کے لیے خریدار کو ایک ہفتہ کا وقت دیا گیا ہے۔

○

وقت کی رَیت

احسان بن مجید
(اٹک)

شہر کے گنجان علاقہ میں ایک تین منزلہ عمارت کی دوسری منزل کے کمرہ نمبر چار میں رہائش اختیار کیے اسے کم وبیش گیارہ ماہ گزر چکے تھے۔ یہ عمارت اس کے دفتر سے زیادہ قریب تو نہیں البتہ قریب ضرور تھی۔ اس سے قبل اس نے دفتر کے قریب تر ایک اپارٹمنٹ کرائے پر حاصل کیا تھا، یہاں اسے ایک سہولت یہ تھی کہ بروقت دفتر پہنچ جاتا اور باس کی گھرکیوں سے بچ جاتا تھا لیکن اس کے برعکس ایک تلوار ہمہ وقت اس کے سر پر لٹکتی رہتی کہ وقت بے وقت باس اس کو دفتر بلا بھیجتا اور اس کو آنا پڑتا بلکہ کئی بار ایسا ہوا کہ چھٹی کا سارا دن بھی دفتر میں گزر جاتا، یوں ہفتہ میں ایک دن تھوڑی سی آوارگی کا حق بھی سلب ہو جاتا اور وہ کڑھتا سڑتا ہی رہتا۔ بالآخر اس نے اِس کمرے میں پناہ لی اور اس کے شب و روز میں قدرے سکون آ گیا تھا۔ یہ صاف ستھرا کمرہ ڈبل بیڈ، ٹیلی فون اور کمپیوٹر سے آراستہ تھا۔ اس میں داخل ہوتے ہی اسے اپنی معمولی سی دانائی پر فخر ہونے لگتا۔ کچھ دیر ٹیلی ویژن دیکھتا پھر کمپیوٹر کے سامنے آ بیٹھتا۔ اس کے کی بورڈ اور ماؤس سے کھلواڑ کرتا پھر کھڑا ہو کر بھرپور انگڑائی لیتا اور چت یا اوندھے منہ بیڈ پر دھڑام سے گر جاتا، پہلی کروٹ لیتے ہوئے اسے احساس ہوتا کہ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے، جھٹ سے اٹھتا، بوٹ جرابیں اتارتا، واش روم میں ٹنگا سلیپنگ سوٹ لا کر لباس بدلتا لیکن آج کچھ عجیب ہی ہوا تھا۔

میری طرف دیکھو! الماری میں نصب قدِ آدم آئینے نے سرگوشی کی۔

یہ تم ہو تم نے کبھی اپنا سراپا غور سے دیکھا نہیں ناں، اب دیکھو تم میں کتنی کشش ہے، تب اس نے گھوم گھام کر اپنا جائزہ لیا اس کی شریانوں میں جیسے خون کا سیلاب آ گیا اور قریب تھا کہ اس سے کوئی حماقت سرزد ہو جاتی اس نے فوراً سونے کا لباس پہنا، بتی بجھائی اور بستر پر دراز ہو گیا لیکن رات کا باقی حصہ اس کی پلکیں جڑتی رہیں۔ اٹھائی سال گزر گئے ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، آج تنہائی کا ڈنگ بار بار اس کے جسم میں اترتا اور نکلتا رہا۔ اس نے یہ بھی سوچ لیا باس چھٹی کے دن کیوں اسے دفتر میں بلا سبب کوئی نہ کوئی کام سونپ دیتا ہے اور خود دوسری کرسی پر بیٹھا اسے کنکھیوں سے تکتا رہتا ہے اور اس کی سیکرٹری تو جیسے اس سے الجھنے کے بہانے تلاشتی رہتی۔ دفتر کے سارے کولیگ اس کے دوست تھے لیکن اس کی کسی کے ساتھ گاڑھی نہیں چھنتی تھی۔ اسے خود بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا ساتھیوں کے ساتھ یہ رویہ کیونکر تھا لیکن کوئی اس سے ناراض بھی نہیں تھا۔

اس پر ایک بے چینی کا عالم تھا۔ اس کے اندر کوئی شعلہ بھڑک اٹھتا تو اسے اذیت کا احساس ہوتا۔ اس اذیت سے نجات کے لیے وہ اٹھا، فرج سے ٹھنڈے پانی کا گلاس حلق سے نیچے کیا یوں اسے یک گونہ راحت محسوس ہوئی اور وہ لیٹتے ہی سو گیا۔ صبح بیدار ہوا تو کسل مندی سی لگی، غسل کے لیے واش روم گیا تو اسے لگا جیسے اس کے ساتھ کوئی اور بھی واش روم میں داخل ہوا ہو۔ نہیں، یہ میری غلط فہمی ہے! اس نے فٹافٹ غسل کیا اور باہر آ گیا، لباس بدلنے کے بعد بال سنوارنے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو اس کی نظریں جیسے شرم سے جھک گئیں اور مردانہ وجاہت نے جیسے پیٹھ پھیر لی۔

شرماؤ نہیں، میں تمہارا رازدان ہوں۔ میرا کام تمہیں بیدار کرنا تھا، پیاس کا احساس دلانا تھا، اب تم جاگ چکے ہو، جہاں اور جب بھی نہر نظر آئے پیاس بجھا لو! آئینے نے اسے دلاسا دیا، ہمت بندھائی اور وہ ایک ارادہ لے کر دفتر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ شفاف اور نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا ایسا کہ پاس بٹھا کر باتیں کرنے کو جی چاہے۔ اس کی باتوں سے، مسکراہٹ سے محظوظ ہوا جائے، اس کے اِکّا دُکّا ساتھی دفتر آ کر اپنی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے اور وہ ان سے ملتا ملاتا اپنی سیٹ تک پہنچ کمپیوٹر سے Cover اتارنے، کی بورڈ اپنی طرف کھینچ کر ماؤس قریب رکھنے میں مشغول ہو گیا لیکن ابھی بیٹھا نہیں تھا کہ نگاہ انجانے میں اوپر اٹھ گئی۔ سیکرٹری کے دفتر کی کھڑکیوں کے پردے لہرا رہے تھے اور وہ بیٹھی کسی فائل کے مطالعہ میں مصروف تھی۔ اس نے چند لمحے اسے دیکھا، ہلکی سانولی رنگت کی یہ لڑکی بغیر سنگھار کے بھی اسے اچھی لگی۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس کے اندر کروٹ لی ہو، اس نے فوراً الماری سے ایک فائل نکالی، دو چار صفحے الٹ پلٹ کر دیکھے اور اس کے پاس جانے کا جواز تلاش کر لیا۔

میں اندر آ سکتا ہوں! اس نے دفتر کا پردہ ایک طرف سرکاتے ہوئے اجازت چاہی تو سیکرٹری نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔

آؤ! بیٹھو، اس نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک البیلی سی مسکراہٹ اس کے چہرے سے ہوتی ہوئی آنکھوں تک پہنچ گئی تھی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ ایک ارتعاش سا ابھرا اس نے اپنا پلو درست کیا نہ چہرے پر سنجیدگی طاری کر سکی۔

کچھ پوچھنا ہے! سوال کے اختتام پر اس کے نیم وا ہونٹوں سے جھانکتے سفید دانت بھلے لگ رہے تھے اور آج وہ اسے بھرپور توجہ دے رہی تھی۔

اس نے فائل کھولی، چند ورق الٹے پھر فائل اس کے سامنے رکھ دی اور نظریں اس کے چہرے پر روک دیں۔ میرا خیال ہے اس چٹھی کا جواب تو ہم نے فوراً متعلقہ پارٹی کو دے دیا تھا! اس نے فائل بند کر کے دونوں کہنیاں اس پر ٹکا دیں۔

میں پھر دیکھ لیتا ہوں! اسے لگا جیسے وہ آدھا ہو گیا ہو اور فائل واپس لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

بعد میں دیکھ لینا اور پھر مجھے بتانا، ابھی بیٹھو میں واش روم سے ہو کر آتی ہوں! اس نے کرسی پیچھے کھسکائی اور واش روم میں چلی گئی۔ اس نے انتہائی چست لباس پہن رکھا تھا۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اس کے اندر ایک کوندا سا لپکا اور اس کے واپس آنے تک کیسے کیسے خیال اس کے ذہن سے گزر گئے لیکن جو بھی گزرا اس کی پیاس میں اضافہ کر گیا۔ میں چلتا ہوں باس کا وقت ہو رہا ہے! سیکرٹری کے واپس کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے فائل سنبھالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

بیٹھ جاؤ، باس آج نہیں آئیں گے! اس کے چہرے پر آسودگی نمایاں ہو رہی تھی۔

اب کیا کیا جائے! اس نے خود کلامی کی، کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ جائے، اتنے قریب کے کندھے کو کندھا چھو جائے۔ وہ بیٹھ گیا لیکن جانے کتنی نظریں کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا کر لوٹ گئی تھیں۔ حیرانی اسے اس بات پر ہو رہی تھی کہ سیکرٹری آج اس سے الجھی نہیں تھی بلکہ اسے دوستانہ ماحول مہیا کیا تھا، شاید یوں وہ اس کے سراپا سے مرعوب ہوتے ہوئے اپنی کمتری کو تسکین دیتی ہو گی۔

لنچ بریک ہوئی، کچھ لوگ ایک میز پر اکٹھے ہو کر گپ شپ کرنے لگے، کچھ کھانا کھانے دفتر سے باہر نکل گئے۔ گھر سے ساتھ لایا ہوا اس کا ارادہ تکمیل کے مراحل تیزی سے طے کر رہا تھا لیکن اوسان بکھر رہے تھے۔ سیکرٹری کے نہ چاہتے ہوئے وہ اس وعدہ پر باہر آیا کہ آج وہ اسے اپنی گاڑی سے گھر تک چھوڑے گی۔ جگہ طے ہو چکی تھی کہاں سے وہ گاڑی میں بیٹھے گا۔

رستے میں اس نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں خریدیں اور پھر گاڑی میڈیکل سٹور کے سامنے چند منٹ رُکی۔ گھر پہنچے تو سورج قریب الغروب تھا۔

تم اپنے گھر پہنچ گئے۔ اب میں جاؤں! سیکرٹری نے گاڑی روک کر اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

تم اس وقت میرے گھر کے سامنے کھڑی ہو، گاڑی کا سوئچ آف کرو اور میرے ساتھ چلو، تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی جانا! آج کی طویل ملاقات میں آپ جناب کا تردد دونوں نے رد کر دیا تھا۔ اس سے ایک فاصلہ رہتا ہے۔ سیکرٹری اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگی اور وہ مشروب کے ساتھ لائے ہوئے لوازمات میز پر سجانے لگا، مُڑ کر دیکھا تو وہ کھڑے کھڑے کمپیوٹر پر جھکی تھی۔ اس کی صحت مند جسامت پر نظر پڑتے ہی جذبات کا ایک ریلا اُٹھا۔ اس کا جی چاہا یوں ہی اسے اپنی بانہوں میں بھر لے۔ اسی لمحے میں اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ نہیں سر ابھی گھر نہیں پہنچی۔۔۔ ایک سہیلی کے پاس ہوں، جی سر میں دفتر پہنچ رہی ہوں۔ کوئی بات نہیں سر۔۔۔ باس نے بلوایا ہے، وہ بہت اچھے ہیں، میرا خیال رکھتے ہیں۔ ہر طرح سے! وہ اسے دیکھ کر یوں مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو، وقت کی ریت تمہاری مٹھی سے پھسل چکی۔۔۔

- بقیہ -

غمِ حسین کے سوا

فاطمہ کو کچھ عجیب سا لگا۔ دیر تو انھیں اکثر ہو جاتی تھی لیکن کبھی اس طرح نہیں بتایا تھا۔ پھر سکینہ کی آواز.....

''اونہہ.....'' اس نے سر جھٹکا، ''میں بہت وہمی ہو گئی ہوں..... ہر وقت خوف زدہ..... مشکوک.....'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اس نے کارٹون دیکھتے ہوئے اصغر کو اپنی گود میں سمیٹ لیا۔

بار بار اس کی نظریں گھڑی کی طرف اٹھتیں۔ وہ بہت بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔

اسے باہر کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی تو وہ اٹھ کر برآمدے میں آ گئی۔ اصغر نے اس کے دوپٹے کا پلّو پکڑ رکھا تھا۔

اکبر کی کار اسے نظر نہیں آئی۔ ایک ایمبولینس موجود تھی۔ اسے غیر متوقع طور پر کئی قریبی رشتہ دار بھی نظر آئے۔

اگلے لمحے سکینہ ایمبولینس سے باہر نکلی اور بھاگتی ہوئی آ کر فاطمہ سے لپٹ گئی۔

فاطمہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

''امی.....'' سکینہ سسک رہی تھی۔

''لو..... اصغر کو سنبھالو.....'' سکینہ کو فاطمہ کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔ ''میں نے اپنی باری کر لی..... اب تمھاری باری ہے۔''

- بقیہ -

میں بھی ڈیانا ہوں

وجود میں رچی ہوئی تھی۔ انہی دنوں کشیدگی اتنی بڑھی کہ ڈیانا نے چارلس کا محل چھوڑ دیا۔ مادر ملکہ نے طلاق کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ ڈیانا تنہا زندگی سے اوب چکی تھی۔ پیرس کے ساحلِ سمندر پر اپنے دوست کے ساتھ گھومنا اب اُسے برا نہیں لگتا تھا۔

اب میں بھی اوب گئی ہوں اپنے شہزادے سے جسے مانگنا میری زندگی کی پہلی عبادت تھی۔ میں نے سوچ لیا ہے میں بھی ناصر کا گھر چھوڑ دوں گی۔ مجھے بھی کسی ڈوڈی الفائد کی ضرورت پڑے گی لیکن بس۔۔۔ یہاں میں ڈیانا سے ذرا مختلف ہوں۔ میں ڈوڈی الفائد کو اپنانے سے پہلے ساحلِ سمندر کی ریت پر ننگے پاؤں اس کے ساتھ دوڑ نہیں لگاؤں گی۔

''دروازۂ دل''

اجیت سنگھ حسرتؔ (لدھیانہ بھارت)

کبھی جب لوگ اُردو بولتے ہیں
مرے کانوں میں مصری گھولتے ہیں

محبت کب سے دستک دے رہی ہے
چلو دروازۂ دل کھولتے ہیں

ہمیں بھی یاد آ جاتی ہے ہجرت
پرندے جب کبھی پر تولتے ہیں

جنوں سا ہو گیا لگتا ہے ہمکو
کسی سے اب نہ ہنستے بولتے ہیں

جنہوں نے عُمر بھر تنکا نہ توڑا
یہاں وہ لوگ موتی رولتے ہیں

تری آنکھوں کو سُنتا بھی تو آئے
یہاں کے سارے منظر بولتے ہیں

ہمیں احساس ہوتا ہے یہ حسرتؔ
ترے افکار آنکھیں کھولتے ہیں

غلام نبی اعوانؔ (راولپنڈی)

تیر جب اُس کمان سے نکلا
ایک شعلہ چٹان سے نکلا

کوئی اپنا رہا نہ بیگانہ
فاصلہ درمیان سے نکلا

راستہ دے دیا سمندر نے
اشک اس آن بان سے نکلا

مٹ چکا تھا نشان جنگل کا
جب شکاری مچان سے نکلا

اب زمیں سے لپٹتا پھرتا ہے
سایہ کیوں سائبان سے نکلا

اپنی آواز لے گیا ہمراہ
جب پرندہ چٹان سے نکلا

بات دل کی زباں پہ آ نہ سکی
کام کب ترجمان سے نکلا

بے سبب تو خفا نہیں دنیا
کچھ تو میری زبان سے نکلا

نورزمان ناوکؔ (تلہ گنگ)

ہم نے کیا کیا نہیں کیا تجویز
وقت کرتا گیا خلا تجویز

پہلے دل سے گمان رُخصت کر
ایسے ہوتی ہے کب دُعا تجویز

حسنِ نسواں کے باب میں اوّل
کی گئی عفّت و حیاء تجویز

نطق کے اور زاویے تھے بہت
یہ بہت بعد میں ہوا تجویز

عشق تو جرم ہو نہیں سکتا
کیجیے حسن کی سزا تجویز

اپنے اندر شعور و ضبط، شعار
ہم نے ہونے نہیں دیا تجویز

تم تو ایسے نہیں تھے ناوکؔ جی
کر لیا کیسے رَت جگا تجویز

○

عارف شفیق

(کراچی)

چونچ میں پانی پرندے تھے جو لانے والے
ان کے پر کاٹ نہ دیں آگ لگانے والے

اِک نئے روپ میں سقراط ابھی زندہ ہے
ہیں ابھی لوگ یہاں زہر پلانے والے

ہاتھ خالی ہوئے جاتے ہیں سفر سے پہلے
ہم بہت دور بہت دور ہیں جانے والے

ہم زمیں زاد ہیں صدیوں کی تھکن اوڑھے ہوئے
آسماں سر پہ ترا بوجھ اٹھانے والے

جھانکتے رہتے ہیں ماضی کے دریچوں سے مجھے
دیپ یادوں کے سرِشام جلانے والے

روک سکتا ہے اگر ان کو کوئی تو روکے
لوٹ کر پھر نہیں آتے ہیں یہ جانے والے

تو مرے بعد اجالوں کو ترس جائے گا
یہ ذرا سوچ لے اے مجھ کو بجھانے والے

سر اٹھائے ہوئے دنیا میں جو یہ پھرتے ہیں
اک تیرے در پہ ہیں یہ سر کو جھکانے والے

بھول بیٹھیں نہ کہیں اپنا ٹھکانہ عارف
یہ درختوں سے پرندوں کو اڑانے والے

○

جاوید رحمانی

(دہلی، بھارت)

ہمراہ مرے یوں تو وہ اکثر نہ ہوا تھا
پر جیسا ہوا اب وہ ستم گر نہ ہوا تھا

اے دوست ترا غم جو مقدر نہ ہوا تھا
خوں رنگ مرے شہر کا منظر نہ ہوا تھا

سب کارِ جنوں سیکھ کے دنیا کی ہوس میں
دیوانہ جہاں ساز، جہاں گر نہ ہوا تھا

اک حشر ترے حرف جنوں پر تو اٹھا تھا
اس طرح مگر فتنہ محشر نہ ہوا تھا

ہر چند کے پہلے بھی نہ گزری تھی سکوں سے
دنیا سے مگر دل مکدر نہ ہوا تھا

وہ قطرہ بے مایہ انا الحق میں ہوا ضم
جو آنکھ سے ٹپکا تھا سمندر نہ ہوا تھا

○

نوید سروش

(میرپورخاص)

دل و نظر کا شکوہ کیسا چہرے سبھی پرائے تھے
کپڑوں سے بچھڑے تن آخر کس گھر نے اپنائے تھے

جن کی خاطر ہم دنیا میں دیوانے کہلائے تھے
وہ جب بھی ملنے آئے تھے ہاتھ میں پتھر لائے تھے

کس سے کہتے اپنے لہو سے تم دھرتی کی مانگ بھرو
ہم تو خود اس جرم کے کارن دار و رسن تک آئے تھے

جرمِ وفا پر جسم ہمارے اب تک دانغے جاتے ہیں
کہاں گئے جو راہِ وفا تک ساتھ ہمارے آئے تھے

جس کرسی کی مدہوشی تھی وہ کرسی تو خواب ہوئی
اب تو وعدے یاد کرو بس! جو تم نے ٹھکرائے تھے

تب تم کیوں خاموش رہے کہہ دیتے نادل کی بات سروش
پاس تمہارے چل کر خود جب تم سے ملنے آئے تھے

○

شفیق احمد شفیق (کراچی)

بارود کو سینے سے لگانے کے نہیں ہم
شادابیٔ گلزار مٹانے کے نہیں ہم

دانستہ کسی دل کو دُکھانے کے نہیں ہم
دل گھر ہے خدا کا اسے ڈھانے کے نہیں ہم

جو سچ ہے اسے جھوٹ بتانے کے نہیں ہم
خورشید کو ململ سے چھپانے کے نہیں ہم

تم دیکھ کے چہرے کو، کرو دل کی سیاحت
جو ہم پہ گزرتی ہے بتانے کے نہیں ہم

سو بار اسے سوچ لے، یہ نکتہ اہم ہے
نکلے تری محفل سے تو آنے کے نہیں ہم

ہر ایک لکھت اپنی لکھاری سے جڑا ہے
تخلیق کو خالق سے چھڑانے کے نہیں ہم

شیشے میں اتارو نہ ہمیں خواب دکھاؤ
اس دام زمیں رنگ میں آنے کے نہیں ہم

اب دہشت ووحشت کا یہاں راج ہے جاناں!
اس شہر میں اب تجھ کو بلانے کے نہیں ہم

○

اسد بیگ (راولپنڈی)

ہو گیا غم سے پھر نڈھال کوئی
اے مرے دل تو کر کمال کوئی

تجھ کو دیکھا تو یہ کہا دل نے
ایسے ہوتا ہے بے مثال کوئی

دیکھ کر تجھ کو بے رُخی برتیں
ہم میں ایسی کہاں مجال کوئی

درد کے تار ٹوٹ جائیں گے
پوچھ بیٹھے نہ پھر سے حال کوئی

عشق کا معرکہ مقابل ہے
پاس تلوار ہے نہ ڈھال کوئی

اب بھی رہتا ہے بن کے سایہ مرا
اب بھی کرتا ہے دیکھ بھال کوئی

ہر کسی میں وفا نہیں ہوتی
دوست ہوتا ہے خال خال کوئی

○

شگفتہ نازلی (لاہور)

ہم بھی دیکھیں خواب سہانے، آپ کے ساتھ
چاہے کتنے وہ مَن مانے، آپ کے ساتھ

ہر ہر گام پہ آپ رہے، ممنون اُن کے
کیسے شگفتہ سے ہیں بہانے، آپ کے ساتھ

گردش میں مینا و ساغر، آپ کے نام
جگ مگ سے سارے میخانے، آپ کے ساتھ

کب تک شمعِ محفل رستہ دیکھے اُن کا
ہر جائی ہیں سب پروانے، آپ کے ساتھ

دیکھنے میں تو اُن کی ادا بہکاتی رہی
در پردہ پَر رہے انجانے، آپ کے ساتھ

حسبِ ضرورت کام میں اُن کو لاتے رہے
جھوٹے سچے سب افسانے، آپ کے ساتھ

کبھی کبھی کچھ یاد تو آتے ہی ہوں گے
بیتے ہوئے رنگین زمانے، آپ کے ساتھ!

○

ابراہیم عدیل

(جھنگ)

تیرے پیڑوں پہ خزاں میں بھی ثمر آتا ہے
چشمِ کافر یہ تجھے کیسا ہنر آتا ہے

جس کی حسرت میں زمانے بھی زمانوں ترسیں
تیری مٹھی میں وہ انمول گُہر آتا ہے

جس کے ابرو کے اشاروں پہ چمن کھلتے ہیں
گردشِ وقت ٹھہر، جا وہ اِدھر آتا ہے

اہلِ غم جس کو مقدر کا سویرا سمجھیں
تیرے کاجل کی سیاہی میں نظر آتا ہے

کاٹ کر کوہ گراں زیست کے معنی لایا
وہ ستارہ جو سرِ بابِ سحر آتا ہے

پرچمِ ظلم کے سب رنگ اتر جاتے ہیں
جب تلاوت کے لیے نیزے پہ سر آتا ہے

دل لہو کر کے جو لفظوں کو اجالا جائے
سادہ باتوں میں بھی جادو کا اثر آتا ہے

رازِ ہستی سے شناسا وہ ابد کا لمحہ
وہ گزرتے ہوئے لمحوں سے ابھر آتا ہے

وقت حیراں ہے کہ یہ کیسی محبت ہے عدیلؔ
جس کا صدیوں کی صداؤں میں اثر آتا ہے

○

شائستہ سحر

(میرپورخاص)

مہک اٹھا ہے ہر اک بَن مسو
ہے میرے اندر فقط تُو ہی تُو

میرے حواسوں پہ چھا گیا ہے
تیرا ہی پیکر تیری ہی خوشبو

وہ چاند آغوش میں آئے گا کب
کھلے ہوئے ہیں صبا کے گیسو

چراغِ زیبائے یار میں ہے
میری ہی آنکھیں، میرا ہی پرتو

سمٹ سکتے ہو تو سمیٹو
بکھر رہے ہیں وفا کے جادو

○

سلیم ناز

(کراچی)

ہم مجبور ہمارا کیا
اک مجبور کا چارہ کیا

ڈوب چکے جب دریا میں
پھر یہ ساتھ کنارہ کیا

کھو بیٹھے بینائی ہم
چلمن کیا نظارہ کیا

مہر و ماہ کے طالب کو
روشن ایک ستارہ کیا

ہم خانہ بربادوں کا
آنگن کیا چوبارہ کیا

دل آخر کیوں جلتا ہے
دل میں ہے۔ انگارہ کیا

○

ڈاکٹر فریاد آزرؔ

(دہلی، بھارت)

کشش ایسی تھی شہروں کی کہ صحرا چھوڑ آئے تھے
مگر ہم لوگ جینے کا قرینہ چھوڑ آئے تھے

گئے تو پھر کوئی پہچاننے والا نہ مل پایا
کبھی ہم گاؤں کو روتا بلکھتا چھوڑ آئے تھے

ہجومِ دشمنانِ جاں کو بھی ہم نے معافی دی
کہ جن کے ظلم سے تنگ آ کے مکہ چھوڑ آئے تھے

اب اس کی جان بچ بھی جائے تو کیا زندگی اس کی
جسے وحشی درندے نیم مردہ چھوڑ آئے تھے

تو کیا اب 'لوٹ جاؤ یا مرو' کا وقت آ پہنچا؟
مگر جو لوگ طوفاں میں سفینہ چھوڑ آئے تھے؟

سنا ہے ان کے بچے بھی جدا رہنے لگے ان سے
بزرگوں کو جو گاؤں میں اکیلا چھوڑ آئے تھے

ہر اک ساماں اٹھا لائے مکاں تبدیل ہوتے ہی
مگر ہم طاقِ نسیاں پر صحیفہ چھوڑت آئے تھے

انھیں محلوں میں اب کتنے محلے بس گئے آزرؔ
جہاں ہم سبز صدیوں کا اثاثہ چھوڑ آئے تھے

○

حفیظ انجم کریم نگری

(بھارت)

لایا ہے گر شرابِ محبت کشید کر
اک گھونٹ دے کے مجھ کو بھی اپنا مرید کر

خاموش سُن رہا ہے تو بیٹے کی جھڑکیاں
تو کیسا باپ ہے اسے تھپڑ رسید کر

اک روز لہلہائے گی بنجر زمین بھی
بادل برس ہی جائیں گے ایسی اُمید کر

کس کام کی ہیں تیری بتا اختلافیاں
دروازہ دل کا کھول دے گفت وشنید کر

بچے نہارتے ہوئے بیٹھے ہیں رات دن
اچھا نہیں کیا ہے تو نے ٹی وی خرید کر!!

میں آئینہ ہوں تیرے لئے تو میری دھنک
آنکھوں میں آ کے جھانک میری، اپنی دید کر

کس بات کی ہے دیر مزہ جینے کا اٹھا
وہ آ گئے ہیں گھر پہ ترے آج عید کر!!

پاگل سمجھ رہے ہیں تجھے سارے لوگ دیکھ
کس نے کہا تھا پیار بھی اتنا شدید کر

گر مفت میں بھی دیجئے پڑھتا نہیں کوئی
انجم میں پڑھ رہا ہوں رسالے خرید کر!!!

○

فرزانہ جاناں

(راولپنڈی)

پسِ منظر میں رہ کر جی رہی ہوں
کسی پیکر میں رہ کر جی رہی ہوں

دیا جلتا ہے دل میں روز ہی اک
کسی مندر میں رہ کر جی رہی ہوں

ہے دل اُس کا تو ہیرے کی طرح سے
یہ کس پتھر میں رہ کر جی رہی ہوں

یہاں کٹنے لگے ہیں پیڑ تک بھی
میں اُجڑے گھر میں رہ کر جی رہی ہوں

ہوں جاناںؔ بھولی سی اک داستاں میں
جو چشمِ تر میں رہ کر جی رہی ہوں

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم (کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط.....۲۰

میڈیکل کالج کا چوتھا سال ۱۹۶۶ کی اگست میں شروع ہوا تھا۔ جون میں تیسرے سال کا نتیجہ نکلا اس دفعہ یونیورسٹی میں پھر میری پوزیشن تھی مگر منیر عباسی اوّل اور میں دوئم تھا۔

پورے سال ہر تقریب میں بھرپور حصہ لینے اور دوسری تفریحات میں مصروف رہنے کا یہ نتیجہ تو نکل نا ہی تھا۔ خیر منیر عباسی سے تو میرا مقابلہ انٹر سائنس سے جاری تھا جب میں یونیورسٹی میں اوّل اور وہ دوئم آیا تھا۔ وہ ایک انتہائی ذہین اور محنتی لڑکا تھا مگر اس میں اور مجھ میں یہ فرق تھا کہ وہ پڑھائی کے علاوہ کسی اور چیز میں بالکل ہی دلچسپی نہیں لیتا تھا اور اپنے کمرے میں بند رہتا تھا۔ بعد میں منیر بھی امریکا آیا اور اسنے قابل تحسین ترقی کی۔ وہ امریکی ریاست میسا چوسٹس میں دماغ کا سرجن تھا۔ اسکے پاس اسکا اپنا ایک چھوٹا ہوائی جہاز تھا جسے وہ خود اڑا کر دور دراز علاقوں میں دماغ کے آپریشن کرنے جاتا تھا۔ افسوس کئی سال پہلے ایک ایسی ہی پرواز کے دوران اسکا جہاز کریش ہوگیا اور وہ نسبتاً کم عمری ہی میں ہلاک ہوگیا۔

چوتھے سال میں امتحان نہیں ہونا تھا مگر تعلیم اسی زور شور سے جاری تھی۔ میں یہاں اس سال ہونے والے قابل ذکر واقعات کا تذکرہ کروں گا۔

کالج میں ہنگامے و ہڑتال

ہمارے کالج کے پرنسپل کرنل نجیب تھے جنکی شخصیت ایک مکمل مضمون کی متقاضی ہے۔ وہ نہایت ایماندار، محنت کش، اور مخلص انسان تھے۔ لیاقت میڈیکل کالج کے قیام اور اسکو سنوارنے میں انکا جو کردار ہے اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اگر اسلام میں اسکی اجازت ہو تو انکا مجسمہ کالج کے صدر دروازے پر نصب کر دیا جائے۔ مگر اپنی اصول پسندی کی وجہ سے وہ کچھ اساتذہ اور بدقماش قسم کے لڑکوں میں غیر مقبول تھے۔ ان لڑکوں اور اساتذہ نے ایک محاذ بنا کر کرنل نجیب کے خلاف زبردست مہم چلائی۔ اس میں کچھ صوبائی تعصب کا بھی ہاتھ تھا حالانکہ کرنل صاحب میں خود کسی قسم کا تعصب نہ تھا۔ یہ زمانہ پاکستان میں ویسے بھی شورش کا تھا کہ ۱۹۶۵ کی جنگ اور تاشقند معاہدے کے بعد صدر ایوب خان کے خلاف ملک بھر میں ہنگامے ہو رہے تھے۔ میں اس زمانے میں کالج یونین کا جنرل سیکریٹری تھا۔ میرا انتخابی نصب العین ہی یہ تھا کہ میں امتحانات ملتوی کرنے یا کسی بھی فرد کے خلاف بے بنیاد الزامات کی وجہ سے ہڑتال کی حمایت نہیں کرونگا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ طلبہ میری بات سنیں مگر ہنگامے زور پکڑتے گئے جس سے دل برداشتہ ہوکر میں نے یونین سے استعفادے دیا۔ ہڑتال کامیاب رہی اور کرنل نجیب کا تبادلہ نشتر میڈیکل کالج ملتان کر دیا گیا۔ بریگیڈئر گردیزی ہمارے نئے پرنسپل بن کر آئے۔ اس کے بعد جب تک کہ ۱۹۶۸ میں، میں فارغ التحصیل ہوکر کالج نہیں چھوڑ گیا وہی پرنسپل تھے۔

ہفتہء طلبہ

ان ہنگاموں سے پہلے جب کالج میں امن وامان تھا میں نے یونین کے سیکریٹری جنرل ہونے کی حیثیت سے کالج کے ہفتہء طلبہ کا نہایت شاندار طریقے سے انتظام کیا۔ اس دور میں ہر کالج میں یہ ہفتہ منایا جاتا تھا اور اس میں تقریری مقابلے، ڈرامے، شام موسیقی، یوم اقبال، سندھ کے مشہور صوفی شاعر شاہ بھٹائی کے اعزاز میں ایک شام، شامل تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس دفعہ قوّالی کا پروگرام بھی ہوگا۔ چونکہ گردیزی صاحب ملتان کے تھے اور یہ شہر اپنے مزاروں اور تکیوں کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا ہے اس لئے وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور میری مکمل حمایت کی۔ ڈرامہ ہمارے نئے بنے ہوئے شاندار جنرل آڈیٹوریم میں ہونا تھا۔ میں نے ایک ''ٹیبلو'' ترتیب دیا تھا جس میں میرے دوست حسن عارف اور دانتوں کی ڈاکٹری کی طالبہ شاہدہ خان نے اداکاری کی تھی۔ ڈرامہ ظفر حیدری نے ڈائرکٹ کیا تھا جس میں تمام خاکے مزاحیہ تھے اور ان میں کرنل نجیب سمیت تمام اساتذہ کی پیروڈی کی گئی تھی اور یہ طنز ومزاح سے بھرپور تھا۔ قوّالی کے لئے ہم نے پاکستان کے مشہور قوال ''یاور علی واجد علی مکے والے قوّال'' کا انتخاب کیا تھا۔ کچھ لڑکوں نے قوّالی کا سن کر ناک بھوں چڑھائی مگر جب قوّالی ہوئی تو قوّالوں نے وہ سماں باندھا کہ جب تک فجر کی آذان نہ ہوگئی پنڈال سے ایک بھی فرد اٹھ کر نہیں گیا۔ اسی تقریب کے دوران مجھے گزشتہ چار سالوں میں کالج کے بہترین مقرر کی ٹرافی بھی دی گئی۔ گزشتہ سالوں میں کئی دفعہ گھروں کی تبدیلی اور پاکستان اور امریکا کے چکروں کی وجہ سے یہ ساری ٹرافیاں تو گم ہوچکی ہیں مگر اس کے ساتھ ملنے والا سرٹیفکیٹ اب بھی میرے پرانے کاغذات کے ساتھ رکھا ہے۔ اب اس کبرسنی میں ان بوسیدہ کاغذات پر نظر ڈالتا ہوں تو لگتا ہے:

آگ تھے ابتداء عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہاء یہ ہے

چوان لائی اور بھٹو

یہ زمانہ ذولفقار علی بھٹو کے عروج کا زمانہ تھا۔ ابھی معاہدہ تاشقند کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ بھٹو وزیر خارجہ تھے اور ۱۹۶۵ کی جنگ میں جس طرح چین نے پاکستان کا ساتھ دیا تھا اس کی وجہ سے پاکستانیوں کے دل میں چین کے عوام کے لئے بیحد محبت تھی۔ اسی اثنا میں چین کے وزیر اعظم چوان لائی نے پاکستان کا دورہ کیا۔

ہمیں یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ ان کے پروگرام میں لیاقت میڈیکل کالج کا دورہ بھی شامل ہوگا۔ایک سہ پہر کو ہم سب اپنے نئے آڈیٹوریم میں جمع ہوئے۔ذبردست نظم وضبط تھا۔آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔لڑکے اپنی کلاس کے درجوں کی ترتیب سے بیٹھے تھے۔ہم چوتھے سال میں تھے اسلئے کافی آگے تھے۔ ہماری فیکلٹی سیاہ چوغوں اور سنہری کالروں کی پٹی میں تھی۔فوج کے استقبالیہ دستے چاق و چوبند تھے۔عین وقت پر بھٹواور وزیراعظم چوان لائی داخل ہوئے۔چوان لائی نیلے رنگ کا مزدوروں کا بند کالر کا کوٹ اور تھیلا نما پتلون پہنے تھے اور خود ہی تالیاں بجاتے ہوئے سٹیج پر داخل ہوئے۔ہمارے لئے یہ عجیب بات تھی اس لئے کہ اس سے پہلے میں نے کسی خصوصی مہمان کو خود ہی تالیاں بجاتے نہیں دیکھا تھا۔اس سے لڑکوں کا جوش و خروش اور بڑھ گیا اور ہال دیر تک تالیوں کی فلک شگاف آوازوں سے گونجتا رہا۔بھٹو صاحب نے نہایت پرجوش تقریر کی جسکے بعد چوان لائی نے بھی چینی میں تقریر کی جسکا ساتھ ساتھ انگریزی میں ترجمہ کیا جارہا تھا۔یہ لمحہ میری یادوں میں اہم ہے کہ اس سے پہلے میں نے غیر ملکی تو کیا کسی پاکستانی مشہور شخصیت کو بھی بالمشافہ نہیں دیکھا تھا۔

چوتھے سال کے مضامین

اگرچہ اس سال امتحان نہیں ہونا تھا مگر پڑھائی بڑے زور شور سے جاری تھی۔میڈیسن،سرجری اور پتھالوجی کی کلاسیں اور وارڈز کی ڈیوٹیاں بھی اپنی جگہ پر تھیں،ہمیں شام کو وارڈز میں جانا ہوتا تھا تاکہ نئے داخل شدہ مریضوں کی ہسٹری لیں اور انکا معائنہ کریں مگر یہ ایک خوشگوار کام تھا اس لئے کہ اس دوران وارڈز کے ڈاکٹروں نرسوں اور ہم جماعت لڑکیوں سے دوستی اور مراسم بڑھانے کا موقعہ بھی ملتا تھا۔ماحول بہت ہی خوشگوار ہوتا تھا اور شام کو جام شورو میں موسم بھی بہت اچھا ہوتا تھا۔ریگستان کی شامیں اپنی ٹھنڈک اور خنکی کے لئے مشہور ہیں۔

اسی سال ہماری ڈیوٹی بچوں کے وارڈ میں بھی لگی جس کے پروفیسر ابراہیم میمن تھے۔اس کے علاوہ ہمارے کالج میں امراض قلب کا نیا نیا شعبہ کھلا تھا۔اسکا وارڈ بہت خوبصورت تھا۔دراصل اس زمانے میں ''ہارٹ'' کے علاوہ میڈیسن میں کوئی اور سپیشلٹی نہیں تھی۔اس کا بڑا گلیمر تھا۔اس کے علاوہ اس کے سربراہ کریم عباسی نوجوان تھے اور کچھ ہی دن پہلے سکاٹ لینڈ سے آئے تھے۔یہ بیحد ہینڈسم تھے اور انہیں اپنی خوبصورتی کا احساس بھی تھا وہ ہم لڑکوں کا آئیڈیل بن گئے مگر جلد ہی انہوں نے ہمیں بہت مایوس کیا اس لئے کہ وہ پڑھانے میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ انہیں کالج اور اس خیراتی وارڈ سے اپنی پرائیویٹ کلنک کو فروغ دینے میں کہیں زیادہ دلچسپی تھی۔

امراض خواتین اور زچگی اس قسط کی سب سے اہم اور خوشگوار یاد امراض خواتین اور زچگی کے وارڈ میں ہماری پوسٹنگ تھی۔اگر ایمان داری سے اسکا اعتراف کیا جائے تو پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ ہم جس ماحول میں پلے بڑھے تھے اور جو بات ہمارے کلچر کا حصہ ہے وہ یہ تھی کہ ہمارے لئے ''عورت'' ایک معمہ اور پر اسرار چیز تھی۔قدرتی تقاضوں کے تحت ہمیں اسکے اسرار جاننے کی ذبردست خواہش تھی۔ہمارے وہ دوست جو انجینئرنگ کالج میں تھے انہوں نے تو ہم سے شروع سالوں ہی میں ایسے سوال کرنے شروع کردئے تھے جنکے ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھے افسوس کی بات تو یہ ہے کہ نہ صرف ہمیں، کہ ہم تو لڑکے تھے ہمارے معاشرے میں تو خواتین کی اکثریت کو بھی اپنے متعلق خاطر خواہ اور سائنس پر مبنی معلومات حاصل نہیں وہ سینہ بسینہ روایات اور بڑی بوڑھیوں کی فراہم کی ہوئی معلومات پر بھروسہ کرتی ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ کم ازکم میرے زمانے تک جنسیات، زچگی اور مراحلِ پیدائش کے متعلق پاکستان کے کسی سکول میں تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔یہ ایک انتہائی غلط روش ہے کہ اسکی وجہ سے غلط مفروضے جنم لیتے ہیں اور نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مختلف اوہام میں مبتلا ہوجاتے ہیں (میں نے ۱۹۹۶ میں امریکا سے نکلنے والے اردو کے سب سے بڑے اخبار میں چار قسطوں پر نسوانی مسائل پر ایک جامع مضمون لکھا جو نہ صرف بہت مقبول ہوا بلکہ اس کو سراہنے کے لئے درجنوں اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کے بھی فون آئے) اب وہ وقت آگیا تھا کہ ہم اس سلسلے میں ٹھوس معلومات حاصل کریں۔

اس شعبہ کی صدر رضیہ لطیف گاندھی تھیں۔یہ میرپورخاص سے تھیں اس لئے انکے دل میں میرے لئے نرم گوشہ تھا۔(انکے والد لطیف گاندھی پبلک پراسیکیوٹر تھے اور انکا ذکر شمس الرحمٰن فاروقی کے مشہور ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں میں بھی آیا ہے) میڈم رضیہ نے زیادہ تر تعلیم انگلینڈ میں پائی تھی۔وہ انتہائی سخت استاد تھیں اور لڑکوں کی ان سے جان نکلتی تھی۔انکی ڈانٹ کا میں خاص شکار تھا شاید اسکی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے مجھ سے بہت اونچی توقعات لگائی ہوئی تھیں۔

اس پوسٹنگ کی دوسری اہم بات یہ تھی کہ ہمیں پندرہ دن کے لئے حیدرآباد کے سول ہسپتال میں رہنا تھا اور اس مضمون کا تقاضہ تھا کہ ہم چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر رہیں کیونکہ بچے کی پیدائش کسی بھی وقت ہوسکتی ہے۔اس کے لئے ہمیں اسی وارڈ کے ساتھ ایک بڑے ہال میں رہائش اختیار کرنی تھی۔یہاں آٹھ بستر نہایت بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ہمیں یہیں رہنا،سونا اور کھانا پینا تھا۔

سب سے اچھی بات یہ تھی کہ یہ جگہ عین شہر کے بیچ تھی اور میں، جو رونق کا دلدادہ ہوں، اس سے بہت خوش ہوا کیونکہ جام شورو انتہائی بیہڑ جنگل میں تھا اور سوائے ہمارے ہاسٹل اور کالج وہسپتال کی کچھ عمارتوں کے یہاں سخت بد رونقی تھی۔اس کے علاوہ نیچے کھانے پینے اور دوسری اشیاء کی درجنوں دکانیں تھیں جن میں رات گئے بڑی چہل پہل تھی اور ان دکانوں پر رات دیر گئے ریکارڈنگ ہوتی رہتی تھی۔زیادہ تر تو اس دور کے پاکستانی نغمے بجتے تھے مگر ایک اور خوشگوار یاد یہاں کی رہائش کی یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں ایک ہندوستانی فلم ''جب جب پھول کھلے'' کا یہ گانا ''پردیسیوں سے نہ انکھیاں ملانا'' بڑا مشہور تھا اور اسکی آواز رات کو بار بار ہوا کی لہروں پر تیرتی آتی اور میرے دل میں عجب سے جذبات جگاتی تھی۔اب بھی جب کبھی میں یہ گانا سنتا ہوں تو وہی دور میری نظروں میں گھوم جاتا ہے۔

زچاؤں کی صحت

ہرلڑکے کو چودہ زچگیاں کروانی تھیں اور برصغیر میں جس تیزی سے بچے پیدا ہوتے ہیں اس کی وجہ سے یہ کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا ہمارے وارڈ میں عام طور سے ایک دن میں سات آٹھ زچگیاں ہوتی تھیں۔ مگر اس پوسٹنگ کے دوران مجھے تکلیف اور دکھ کے ساتھ اس بات سے بھی آگاہی ہوئی کہ ہمارے یہاں کس قدر غربت ہے اور سرکاری ہسپتال میں غریب محلوں سے آنے والی عورتوں کی صحت اور غذائی کیفیت کس قدر قابل رحم ہے۔ زیادہ تر زچائیں بہت کم عمر لڑکیاں تھیں جو نہایت دبلی اور سوکھی تھیں انکے زرد زرد گال اور کمزوری سے تیرتی آنکھیں ان کے حال کی غمازی کرتی تھیں۔ بس انکی سب سے بڑی پہچان ایک مٹکا بھرا پیٹ ہوتا تھا۔ یوں تو سب ہی میں خون کی زبردست کمی ہوتی تھی مگر ایک لڑکی جو مشکل سے سولہ سال کی تھی اور یہ اسکا پہلا بچہ تھا، کے ٹیسٹ کرنے کے لئے جب میں نے اسکا خون نکالا تو وہ بالکل گلابی پتلا پانی لگ رہا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید سوئی رگ کے اندر نہیں ہے۔ میں نے دوسری رگوں میں سوئی ڈالی تو بھی یہی حال تھا۔ جب ٹیسٹ کا نتیجہ آیا تو اسکا ہیموگلوبن صرف تین تھا۔ میں نے اپنی پینتالیس سالہ ڈاکٹری میں آج تک اس درجے کی خون کی کمی نہیں دیکھی۔ ڈاکٹری کی کتابوں کے لحاظ سے ہیموگلوبن کے اس لیول پر انسانی زندگی ممکن نہیں۔ میں اس لڑکی کو نہیں بھولتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسکا شوہر مٹی گارے کا کام کرتا ہے اور زیادہ تر وہ پانی میں روٹی بھگو کر کھالیتی ہے۔ غذائیت کی کمی اور حمل کے دوران صحیح قسم کی دیکھ بھال کی کمی کی وجہ سے زچگی میں پیچیدگیاں بھی زیادہ ہوتی تھیں۔ یہ سب ہم نوآموز لڑکوں کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا۔ افسوس کہ تیسری دنیا کے تقریباً سارے ہی ممالک میں زچہ اور بچہ کی صحت کے حوالے سے یہی صورتحال ہے۔

وارڈ کی نرسیں اور حسنہ

مگر ان تمام حالات کے باوجود یہ ڈیوٹی اپنے ساتھ بہت سے خوشگوار لمحے بھی لئے تھی اور ان میں اس وارڈ کی نرسوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ رات کی ڈیوٹی میں ہمارے ساتھ چار نرسیں ہوتی تھیں یہ سب نوجوان تھیں اور ہمارا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ کبھی ایک کوئی خاص ڈش بنا کر لا رہی ہے تو کبھی دوسری۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ روائت مشہور تھی کہ اگر ان نرسوں کو شوہروں کی تلاش ہے تو میڈیکل اسٹوڈنٹس سے راہ رسم بڑھانے کا اس سے اچھا موقعہ نہیں ملے گا۔ حقیقت میں ہر سال کچھ لڑکے نرسوں سے شادیاں کرتے تھے۔ میرپور خاص کے ڈاکٹر صفدر حسین جو میرے بڑے بھائی کے دوست تھے، نے بھی ایک نرس سے شادی کی تھی۔ اس کے علاوہ اتنی لمبی رات کٹے بھی تو کیسے کٹے؟ تو کبھی بار بار کافی بن رہی ہے تو کبھی کہانیاں کہی جارہی ہیں۔ انہی لڑکیوں میں ایک لڑکی حسنہ تھی۔ یہ بہت گہری سانولی مگر غضب کی نمکین اور تیکھے نقوش کی حامل تھی۔ اس کے علاوہ بہت پراعتماد تھی اور اسکو اپنے رنگ کی وجہ سے کسی قسم کا احساس کمتری نہ تھا۔ وہ نہایت چلبلی، شوخ وشنگ اور چرب زبان تھی۔ دراصل اس نے تمام لڑکوں کو اپنی انگلی پر لپیٹا ہوا تھا۔ مگر وہ صرف مجھ میں دلچسپی لیتی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں بھی اس کے سحر میں گرفتار تھا اگر کسی رات اسکی چھٹی ہوتی تھی تو وہ رات میرے لئے ایک عذاب ہوجاتی تھی اور کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ میرا دوست رشید مجھ سے کہتا تھا کہ بھئی تم ذرا خیال رکھو ایسا لگ رہا ہے کہ تم تو اس کے سلسلے میں ہاتھوں سے نکلے جارہے ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے بھی وہ بیحد اچھی لگتی تھی اور میں نے اس بات پر غور بھی کیا تھا کہ اسکو زندگی میں شریک سفر بنایا جاسکتا ہے۔ مگر اس اثناء میں ہماری پوسٹنگ ختم ہوگئی اور میں واپس جام شورو آگیا ادھر جب میں اس سے ایک آدھ بار ملنے گیا تو شاید وہ چنگاری بجھ چکی تھی کہ نہ ہی مجھے اس سے بات کر کے ویسا لطف آیا نہ اس کی توجہ میں پہلی جیسی گرمجوشی تھی۔ ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد وہ ایک دفعہ کراچی میں میرے ہسپتال میں مجھ سے ملنے آئی بھی تھی مگر صرف ایک دوست کی طرح۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی ٹریننگ ختم کر کے واپس سیالکوٹ جارہی ہے۔ پھر وہ اور لوگوں اور گذرے وقت کی طرح ماضی کی دھند میں گم ہوگئی۔ خدا جانے اب وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی۔

کالج کا میگزین

گزشتہ سال کا میگزین میں نے تیسرے سال میں نکالا تھا جو کئی سال کے تعطل کے بعد نکلا تھا اس سال میں یونین کا جنرل سیکریٹری تھا اور میرا قریبی دوست ضیاء الحق میگزین سیکرٹری تھا۔ یعنی میگزین کی اشاعت وترتیب پر اب بھی بالواسطہ میرا ہی اجارہ تھا۔ ضیاء ایک بہت ہی شوخ، خوش مزاج، خوش شکل اور ''یاروں کا یار'' قسم کا لڑکا تھا۔ اسنے ایک اچھی ٹیم ترتیب دی جس میں بنیادی طور پر ہمارا ہی گروپ شامل تھا۔ اس دفعہ ہم نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ پہلی دفعہ لیاقت کے میگزین میں اردو اور سندھی کے سیکشن بھی شامل کئے جائینگے۔ اردو کے لئے عبدالباری اور رشید غوری کو اور سندھی کے لئے پیر نور احمد اور روشن آرا تالپور کو چنا گیا۔ میرے میگزین کی وجہ سے ہماری ٹیم کو چھپائی، اشتہاروں کے حصول اور دوسری چیزوں سے خوب آگاہی ہوگئی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ جیسا ضیاء نے میگزین نکالا میرا خیال ہے کہ اپنی چھپائی، کاغذ، رنگین ٹائٹل، ضخامت اور معیار کے لحاظ سے کم از کم سندھ اور کراچی کی حد تک ایسا میگزین پہلے یا اسکے بعد شاید ہی کبھی نکلا ہو۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ ہمارا میگزین ڈاؤ میڈیکل کالج کے میگزین سے تو کئی گنا بہتر تھا۔ اس کے اردو سیکشن میں میرا افسانہ ''کنول گٹا'' شامل تھا اس زمانے میں، میں عصمت چغتائی سے بہت متاثر تھا اس لئے اسکا انداز تحریر عصمت کے افسانوں سے ملتا جلتا تھا۔ افسوس کہ یہ میگزین بھی اب میرے پاس نہیں۔

میرا پیارا میرپور خاص

اس تمام عرصے میں ہر ہفتے پابندی سے میرپور خاص بھی جانا ہوتا رہا مگر اب شاید وہ دور آگیا تھا کہ میرپور خاص میں ایسی تبدیلیاں آنا شروع ہوگئی تھیں جن سے اسکی وہ خوبصورتی اور ہریالی جس کے لئے وہ مشہور تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے چھینی جارہی تھی۔ ریلوے نے چھوٹی لائین توڑ کر بڑی لائین

ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا جسکی وجہ سے ہمارے محلے میں سخت توڑ پھوڑ کی گئی تھی۔ ہمارے گھر کا وہ حصہ جو جافری (ایک قسم کا ہوادار ٹیریس) کہلاتا تھا توڑ دیا گیا تھا اور اب اس گھر کی شکل ایک دُم کٹی چھپکلی کی طرح ہوگئی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ محلے کے اور بھی بہت سے گھروں کا یہی حال ہوا تھا۔ پھر ہمارے گھر کے سامنے قطار میں لگے سرس کے درخت جن پر موسم بہار میں خوشبودار حسین پھول کھلتے تھے انہیں بھی کاٹ دیا گیا تھا۔ گھروں کے سامنے بنا ہوا ایک لمبا کھلا میدان جس میں ہم ہاکی کھیلتے تھے اس کو پتھروں، روڑوں اور ریت سے بھر دیا گیا تھا اور اس پر ریل کی نئی پٹری ڈالی جارہی تھی۔ ریل کی پٹری گھروں سے اس قدر قریب تھی کے گاڑی کا انجن اور ڈبے کمروں کی کھڑکیوں سے چند ہاتھ کے فاصلے پر ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ نہ جانے کیوں ہمارے محلے کے پیچھے ہسپتال روڈ پر قطار سے جو عظیم الشان نیم کے درخت تھے میونسپل کارپوریشن نے انہیں بھی کاٹ ڈالا تھا۔ میرا دل یہ سب دیکھ کر روتا تھا مگر پھر مجھے خیال آتا تھا کہ چند ماہ بعد میں گریجویٹ ہو کر کراچی چلا جاؤنگا اور یہاں سے میرا رابطہ ٹوٹ جائیگا تو بقول شاعر:

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا
اسکی بلا سے بوم رہے یہا ہما رہے

میرپورخاص کے لڑکوں کا گروپ فوٹو

لیاقت میڈیکل کالج میں میرپورخاص کے تقریباً پینتالیس لڑکے اور لڑکیاں تھے۔ اگرچہ ہم اس وقت چوتھے سال میں تھے مگر آخری سال ہمیشہ بہت مصروف ہوتا ہے اس لئے ہماری کلاس کے میرپوری لڑکوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسی سال میرپورخاص کے تمام طلبہ ایک چھوٹی سی سوشل انجمن بنائیں۔ ہر سال اسکا ایک ڈنر ہو اور ایک یادگار تصویر کھنچوائی جائے۔ اسکا مقصد یہ بھی ہو کہ نئے آنے والے لڑکوں کی مدد اور رہنمائی کی جائے۔ میڈم رضیہ کو اسکی صدارت کی دعوت دی گئی جو انہوں نے خوشی سے قبول کی۔

رانی باغ کے پاس ایک بہت ہی شاندار ریسٹورنٹ RITZ تھا اس کے برآمدے میں بڑے بڑے گملوں میں پام کے پودے لگے تھے اور اسکے ستونوں پر بوگن ولا کی بیلیں چڑھیں تھیں۔ ہم نے ایک شام وہاں ڈنر اور فوٹو کا انتظام کیا۔ سارے ہی لڑکے اور لڑکیاں جن میں ایک بڑی تعداد ہمارے ہندو بھائیوں کی بھی تھی، کیونکہ میرپورخاص ضلع تھرپارکر کا صدر مقام تھا اور یہاں بڑی تعداد میں ہندو رہتے تھے، شامل تھی۔ یہ شام بڑی جذباتی تھی کیونکہ فائنل کے لڑکے اب ہم سے جدا ہو رہے تھے۔ میڈم رضیہ نے بڑی پیاری تقریر کی۔ ایک فوٹو کھنچوائی گئی جسکا ٹائٹل میرے ہم جماعت پرشوتم نے ''LEST WE MAY FORGET EACH OTHER'' چنا تھا۔ بدقسمتی سے یہ تصویر بھی میرے پاس نہیں ۔۔۔ مگر یہاں میں اپنے پرانے ہم جماعت لڑکوں کے لئے یہ ضرور لکھونگا کہ ''نہیں، میرے ہم جمات ساتھیو، میں کسی کو نہیں بھولا ہوں''

''یہ وزیرانِ کرام''

کوئی ممنونِ فرنگی کوئی ڈالر کا غلام
دھڑکنیں محکوم ان کی لب پہ آزادی کا نام
ان کو کیا معلوم کس عالم میں رہتے ہیں عوام
یہ وزیرانِ کرام

ان کو فرصت ہے بہت اونچے امیروں کے لیے
ان کے ٹیلیفون قائم ہیں سفیروں کے لیے
وقت ان کے پاس کب ہے ہم فقیروں کے لیے
چھو نہیں سکتے اُنہیں ہم ان کا اونچا ہے مقام
یہ وزیرانِ کرام

صبح چائے ہے یہاں تو شام کھانا ہے وہاں
کیوں نہ ہوں مغرور چلتی ہے میاں ان کی دکاں
جب یہ چاہیں میڈیا پر جھاڑ سکتے ہیں بیاں
ہم ہیں پیدل، کار پر یہ، کس طرح ہوں ہمکلام
یہ وزیرانِ کرام

قوم کی خاطر اسمبلی میں یہ مرجاتے بھی ہیں
قوتِ بازو سے اپنی بات منواتے بھی ہیں
گالیاں دیتے بھی ہیں اور گالیاں کھاتے بھی ہیں
یہ وطن کی آبرو ہیں کیجیے ان کو سلام
یہ وزیرانِ کرام

ان کی محبوبہ وزارت داشتائیں کرسیاں
جان جاتی ہے تو جائے پر نہ جائیں کرسیاں
دیکھئے یہ کب تلک یوں ہی چلائیں کرسیاں
عارضی ان کی حکومت عارضی ان کا قیام
یہ وزیرانِ کرام

حبیب جالب (●)

''شہرِ بسمل''

یک شجر زادے کی موت پر

ایوب خاور
(لاہور)

اسے خود میں نے اپنے ہاتھ سے
مٹی میں بویا اور سینچا تھا
جوانی میں قدم رکھا
تو اپنے ساتھ کے سارے شجر زادوں میں سب سے خوب صورت تھا
ابھی پچھلے برس کی بات ہے
پارک کے چاروں طرف ایستادہ
اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر
وہ ہَوا کے بازوؤں میں بازو ڈالے
تیز بارش میں نہاتا
والٹز ڈینسنگ (Walts Dancing) کر رہا تھا
اور اب اس وقت
میرے گھر کے بالکل سامنے
سڑ رہی ہے اس کی لاش

بہت سے شاخچے، سوکھے ہوئے
اور چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں، چیخی ہوئی
سبز، پیلے، زرد اور کچھ کچھ سنہری رنگ پتے
خار و خس
اور دھول، مٹی اور کچرا
جو بھی موسم کے مطابق وہ ہمیشہ زیبِ تن کرتا تھا
اب وہ اُس کے سر میں
گردن اور سینے کے کھرنڈوں اور نہایت بربریت
اور بہیمانہ صفت انداز سے کاٹے گئے شانوں پہ مرہم رکھ رہے ہیں
ایک دہشت سے بھری بے رونقی
پارک کے اندر بھی
باہر بھی
سلگتی دھوپ میں چُرمُرسی ہو کر ہر طرف پھیلی ہوئی ہے
اور ہوا
جانے کہاں، کس باؤلی کی خشک گہرائی میں گر کر مر گئی ہے
بے ضرورت زندگی کی ساری آسایش بھی
آلایش بھی
دونوں مل کر
اَن سلے لٹھے کی ایک میلی سی چادر کے تلے سر جوڑ کر
اپنے زانوں پیٹتی اور بین کرتی جا رہی ہیں
شجر زادے کے پیروں کی بڑی چھوٹی بہت سی انگلیاں
اب بھی زمیں کے سینۂ زرخیز میں پیوست ہیں گھٹنوں گھٹنوں اب بھی وہ
اپنی جگہ پر ایستادہ ہے مگر اُوپر کا دھڑ خود اُس کے اپنے قدموں میں اوندھا پڑا
ہے
شجر زادہ
کمر سے کچھ ذرا نیچے سے ٹوٹا تھا

''چہارسُو''

ہَوا نے کچھ عجب دہشت بھرے خودکش بھنور باندھے تھے اُس کے گرد
اور پھر بربریت سے اٹی پاگل ہوا
اپنے ناخن
اس شجرزادے کی کھال اور ہڈیوں میں گاڑ کر بھنورائی تھی
اور شجرزادہ
اُسے یوں لگ رہا تھا
اس کی آنکھوں سے اندھیرا بہہ رہا ہے
اور لکڑی کے کنویں میں
موت
جیسے اُس کو اپنی بائیک پر لادے ہوئے گردش میں ہے
اچانک موت کی گردش کنویں کے دائرے کو اک طرف سے توڑ کر
باہر کو نکلی
اور اُسی لمحے
شجرزادے کے کہلوں کی کھڑکتی ہڈیاں
اپنے شگافوں سے نکل کے کھال کی کھنچتی طنابوں سے الجھ کر رہ گئیں
شجرزادے کا دھڑ
سائے سمیت آہستہ آہستہ زمیں پر گر کے آخر بجھ گیا
شہر کے سارے دریچے، کھڑکیاں
اور دروازے مقفل تھے
گلی کوچوں میں اُڑتی خاک میں شامل
سرابوں اور خوابوں کے خس وخاشاک کو
پاگل ہوا
اپنی وحشی گردشوں کی شال کے لپکوں میں بھرتی
چیختی، چنگھاڑتی
مرکزی مسجد کے میناروں سے، اس کے گنبدوں پر سے پھسلتی
گھوم کر مسجد کے زینوں سے اترتی
صحن کے مرمر پہ
اندر کی صفوں
محراب ومنبر
اور در و دیوار سے چپکے ہوئے
اور پھیتی پھیتی ہونے والی سرخ رُو پیشانیوں کی
ہڈیوں اور کھال میں اُڑ سے ہوئے سجدوں کے اوپر ریت کی چادر
بچھاتی، پھول والوں کی گلی میں مڑ گئی
ایک لمبی چپ
کئی دن پارک کے اطراف خیمہ زن رہی
زندگی اور اس کی آب وتاب
اس گلی میں کب پلٹ کر آئی تھی
یاد کرنے سے بھی یاد آتی نہیں
ہاں مگر اتنا سبھی کو یاد ہے
دوسرے ہی دن
شجرزادے کے شانے اور بازو
گردن اور سینے کی محرابوں کے خم
ہاتھ
اُن کی انگلیاں اور انگلیوں کے سارے ناخن
آریوں، کلہاڑیوں سے کاٹ کر
رات کی گہری اماوس سے نچڑتی اوس میں
ریڑھیوں پر لاد کر بھاگے تھے کچھ معلوم لوگ
مگر اس شہرِ بسمل کی کسی کتوالی میں
اس سانحے کی ایف آئی آر اب تک نہیں کاٹی گئی

○

فکرِ نسلِ نو

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(کینیڈا)

توہاً کرہاً سمجھوتہ ہی کرنا پڑا
ماسوا، اور کوئی بھی چارہ نہ تھا
منحرف پیمان و وفا، رسوم و قیود
نسلِ نو کا وتیرہ ہے باغیانہ سا
بے باکانہ، بے ربط، ہے جینے کی ضد
بے سلیقہ، سپاٹ، دنوں دن گذرا
ذہن و دل آوارہ و کٹی پتنگ
دائرۂ فکر، ماورائے فردا
پابندیٔ اوقات و حالات، لغو!
دن کو رات، اور رات کو دن کیا
رات گئے کمپیوٹر پر کریں چیٹنگ[1]
اور دن بھر سیل فون کا سلسلہ
فرض شناسی، کفالت و نظم و نسق
نسلِ نو کی لغت میں نہیں اِن کی جا
قصّہ کوتاہ! دُور رسی کے نہیں قائل
لمحۂ موجود، اوّل، آخر، ملجا
نشۂ ''لِو۔ان۔ریلیشن[2]'' میں سرگرداں
خانہ آبادی! لغو، معاذ اللہ

- ۲ -

''ہم ایسے ہی ہیں، تم جو چاہو، وہ سمجھو''
تم کیا جانو! لطفِ سرسبز و تازہ
''تم بلّو ہو، سحر و مسا، تم نے تو''
''نادیدہ، دار و رسن پہ خود کو کھینچا''
جیون کا اِک اِک پل تم گھُٹ گھُٹ کر جیئے
جلتی بجھتی دیکھی، ارمانوں کی چِتا
اشک باری میں کٹی تمہاری زیست
پیرویٔ اِسلاف سے کیا پایا!
تضیعِ اوقات، تمہاری زندگی
زندانی کیا جانے، جینا ہے کیا!
ہم کہ اپنی مرضی، اپنے ڈھنگ سے جئیں
ہمیں نہ ہو آپ کی صورت پچھتاوا
تشنہ، کیوں ہو، نسلِ نو پہ، نکتہ چیں
اک دن کیا تو نے اپنے لیے جیا؟

○

[1] Chating: کمپیوٹر پر باتیں کرنا
[2] Live-in.Relation: بغیر شادی کے ایک ساتھ رہنا

ویران صحرا

(انوار فیروز صاحب مرحوم کی غیر مطبوعہ نظم)

انوار فیروز

(●)

مرے دل میں خیالوں کا
حسین، شاداب گلشن ہے
اور اس گلشن میں اے جاناں
تمہاری یاد کے
رنگین و دلکش پھول کھلتے ہیں
گلابی، سرخ، اودے
نیلے اور پیلے سے
کہ جن کی خوشبوؤں سے
میں بہت سرشار ہوتا ہوں
مگر جب آنکھ کھُلتی ہے
تو یہ سب کچھ نہیں ہوتا
فقط کنکر ہی ہوتے ہیں
حسین شاداب گلشن کی بجائے
ایک صحرا ہے
بھٹکتا پھر رہا ہوں میں
اسی ویران صحرا میں

○

آہ پروفیسر محسن احسان!

یونس صابر

(پشاور)

میرے شہر کا محسن وہ احسان بھی وہ
اک دانشور اور نفیس انسان بھی وہ
شیکسپیئر کے دیس میں جا آباد ہوا
حسبِ حال وہ شاد کبھی ناشاد ہوا
اپنے وطن میں جب وہ آتا جاتا تھا
سر آنکھوں پہ اُسے بٹھایا جاتا تھا
اب تو اُسے ڈھلتی صحت بھی رُلاتی تھی
یاد پشوری سجنوں کی تڑپاتی تھی
آنکھ مچولی مرگ و زیست سے بھی کھیلا
پامردی سے بائی پاس بھی وہ جھیلا
کیا کرتا وہ جان کی بازی ہار گیا
مگر غزل کے خدّ و خال سنوار گیا
سیّد امجد جی نے سوہنے محسن کی
اپنے کالم میں حالتِ دلگیر لکھی
ستیہ پال آنند بھلا کیوں چُپ رہتا
خود دُکھیا تھا کب تک تازہ غم سہتا
بعد فراز کے اتنی جلد پشاور کا
محسن ایک بڑا فرزند بھی گذر گیا
اُس نے کہا محسن کا پُرسہ کس کو دُوں
شائد کبھی حیات آباد ہی آ پہنچوں
ہمہ جہت شخصیّت اردو دنیا کی
ہم سے بچھڑنے والے محسن جی کی تھی

○

وہی چہرہ

غالب عرفان
(کراچی)

ہر شام شفق رنگ نمایاں وہی چہرہ!
دیتا ہے نئی صبح کا امکاں وہی چہرہ

ہوتی ہے تمنا اُسی اطراف سفر کی
بن جاتا ہے جب شہرِ نگاراں وہی چہرہ

رنگوں کا نیا عکس لئے خوشبو میں ڈوبا
ہے مظہرِ تفہیم گلستاں وہی چہرہ

آنکھوں میں تھکن ہے نہ شکن کوئی جبیں پر
آئینے میں پھر کیوں ہے ہراساں وہی چہرہ

منظر میں ہے موجود مگر آنکھ سے اوجھل
حالات کی ہر بھیڑ میں پنہاں وہی چہرہ

دیتی ہے کبھی دعوتِ قرأت وہی صورت
بنتا ہے کبھی عشق کا عنواں وہی چہرہ

شب کو لگے بادل میں چھپے چاند کی مانند
اور دن ڈھلے ہے شام کا عرفاں وہی چہرہ

○

''گریفیٹی آرٹ''

(دنیا بھر سے معروف گریفیٹی آرٹسٹ لندن آئے اور اس پانچ سو برس پرانے شہر میں
جہاں گریفیٹی شجرِ ممنوعہ تھا اپنے فن کا مظاہرہ کر کے مُردہ علاقوں میں جان ڈال دی!)

جاوید زیدی (امریکہ)

یہ بوسیدہ در و دیوار
جو خاموش تماشائی تھے
خستہ تن، تشنہ دہن
روغن و رنگ کے شیدائی تھے
آس میں تھے کہ کوئی پیاس بجھانے آئے
شہرِ برباد کو آباد کرانے آئے
سو غَول کے غَول بلائے گئے فنکاروں کے
بھُوکے آوارہ آرٹ کے متوالوں کے
قابلِ دید تھا جذبہ ان کا
یہ عزادارانِ غم
آرٹ کے عنوان بدلنے نکلے
اپنے بیمار کی پہچان بدلنے نکلے
نقشِ حیرت سے یہ
فکرِ انسان بدلنے نکلے
زمکہ موئے قلم سے
روتی دنیا کو ہنسایا پھر یوں
مُردہ لندن کو جگایا پھر یوں
منظر و موسمِ دل
پیمانہ و رنگِ محفل
بدلنے سے لگے
بھُولے ہوئے کھنڈرات
مچلنے سے لگے
زندگی کے نئے
قافلے چلنے سے لگے!

○

چلے آؤ

ڈاکٹر جمال نقوی
(امریکہ)

چلے آؤ، پکڑ لو ہاتھ
اب مل کر کہیں بیٹھیں
تمہارے پیار کی خاطر
چلو یہ جھوٹ بھی کہہ دیں
کہ ہمکو ساری دنیا سے حسیں
قربت تمہاری ہے
چرالایا ہے جو گھر سے
وہ عزت تم پہ ہاری ہے
تمہیں جو زندگی دے
جھوٹ وہ ہم کو گوارہ ہے
چلو یونہی سہی
گر اس طرح اپنا گزر راہ ہے

○

آگ معبد سے نکل آئی ہے

فہیم شناس کاظمی
(کراچی)

آگ
معبد سے
خداوند کے زنداں سے، سرِ شام نکل آئی ہے
اب صنم ہو کہ علم اور حرم
کوئی نہیں بچ سکتا
شاخ در شاخ چلے
شہر در شہر بڑھے
سبز پیڑوں کو، کھلونوں کو
پرندوں کو جلاتی ہوئی آگ
لہر در لہر بڑھے
ہو وہ بغداد کہ تہران کہ روم
بچ نہیں سکتا مرے کوزہ گر!
یہ ترا عجزِ ہنر
اور دامن بھی سلامت نہ رہے
کوئی افسانہ بھی باقی نہ رہے
آگ شوریدہ و سفاک۔۔۔ بہت ہی سرکش
دیوتاؤں سے چُرائی ہوئی آگ
اپنے معبد سے نکل آئی ہے
رقص کرتی ہوئی
اور سانپ سی لہراتی ہوئی
شمس تبریز و قلندر بھی نہیں
آگ سے کون لڑے، کون کہے
راکھ ہونے کے لیے کچھ بھی نہیں

○

اِقرار

حامد لطیف
(ممبئی، بھارت)

آج میں نے،
پھر ایک بار،
اپنی آرزوؤں کا
گھونٹ کر گلا اُن کو
موت کی سزا دیدی
ہاں کوئی عدالت اب،
ایک بار پھر اپنا
فیصلہ سُنائے گی!
اور یہ سزا میری
اس سے بڑھ کے کیا ہوگی؟
ایک بار پھر مجھ کو
موت کی سزا ہوگی!

○

بُھوک

جہانگیر اشرف
(برمنگھم)

بُھوک جب بڑھتی ہے
کُہرام مچاتی ہے
جسموں کے بازار سجاتی ہے
ماؤں کے ہاتھوں
بچّے نیلام کراتی ہے

بُھوک بڑی ظالم ہے
جب جُوبَن پہ آتی ہے
ہر اُلٹا سیدھا کام کراتی ہے
چُور کسی کو ڈکیت بناتی ہے

بُھوک پہ جب بس نہیں چلتا ہے
تو بھوکا اپنے ہاتھوں آپ ہی مرتا ہے

بُھوک کب چُھپتی ہے، دکھائی دیتی ہے
وضاحتیں نہیں سنتی، دُہائی دیتی ہے

تخت نشینوں کی سماعتوں پر قُفل ہیں
اُنکو آہ و بکا سنائی نہیں دیتی
مال و زر پر نگائیں ہیں
اُنکو حالتِ خلق دکھائی نہیں دیتی

جب بُھوک کی آندھیاں چلتی ہیں
پھر کب کسی سے رُکتی ہیں
قانون کی دیواریں گرتی ہیں
محلات کی بنیادیں ہلتی ہیں

○

ابلیس بھی شرمائے ہے

شگفتہ نازلی
(لاہور)

آج کا انسان۔۔۔
اب دھرتی پہ کچھ ایسا کرے۔۔۔
دیکھ دیکھ اُس کو تو اب۔۔۔
ابلیس بھی شرمائے ہے۔۔۔!
اُس نے جو چاہا تھا کہ وہ خود کرے۔۔
راندۂ درگاہ ہو کے کہہ سکے۔۔۔
کتنے ہیں جو تیری جانب ہیں جھکے۔۔۔
اور کتنے خود بخود راہ پہ میری۔۔۔
گمراہی کے واسطے لیکن نہ کچھ زحمت ہوئی۔۔۔
کیونکہ جب شیطانی چوغہ پہن کے انساں چلا۔۔۔
سب درندے بے بسی سے اُس کا منہ دیکھا کئے۔۔۔
اپنی سفّاکی، مظالم اور وحشت کے سمیت۔۔۔
ہر قدم ابلیس کو وہ چھوڑتا پیچھے گیا۔۔۔
اُس نے شاید جو کبھی سوچا نہ تھا۔۔۔
خاک کا پتلا اُسے بھی کر گیا۔۔۔
اور خدائے مہرباں۔۔۔!
جانے وہ کیا سوچا کیا۔۔۔!!

○

ہمارے خواب۔۔۔!!

زاہدہ عابد حنا
(لاہور)

ہمارے خواب لے جاؤ۔۔۔
سجا لینا انہیں آئینہ خانے میں
یہ شیشے سے بھی نازک خواب ہیں،
ان کو ضرورت ہے کسی آئینہ خانے کی
کہ شہرِ آرزو میں تو
سبھی کچھ اب ہے پتھر کا۔۔۔
مگر یہ خواب،
جو پتھر نہ بن پائے۔۔۔
ہزاروں سانحے گزرے
دکھوں کی وحشتوں نے ہم کو پتھر کا بنا ڈالا
ہر اک خواہش کو ہم نے مار ڈالا۔۔۔اپنے اندر ہی
تو جانِ جاناں!!
مصافِ دہر میں ہاری ہوئی سوچیں
گزرتے وقت کے پاؤں تلے کچلے ہوئے جذبے،
یہ پتھرائی ہوئی آنکھیں،
سبھی کچھ رائگاں ٹھہرا
مگر یہ خواب
جو شیشے سے نازک ہیں
یہ احساں ہم پہ کر دینا
کہ ان پتھرائی آنکھوں سے
یہ سارے خواب لے جاؤ
اور اپنے آئینہ خانے میں ان کو بھی سجا لینا
تو آؤ!اور سارے خواب لے جاؤ
ہمارے خواب لے جاؤ۔۔۔

○

حدیثِ آرزومندی

سرورانبالوی
(راولپنڈی)

آج سے تقریباً پانچ چھ سال پیشتر میں رات کو جوش ملیح آبادی کی خودنوشت ''یادوں کی بارات'' پڑھ رہا تھا کہ ایک واقعہ نظر سے گزرا لکھتے ہیں:

''ایک روز کا ذکر ہے کہ کوئی دو گھنٹے پیشتر میں اپنا سبق یاد کرنے کے بعد دیوانِ حافظ کے مطالعہ میں غرق تھا۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی، تارے جھلملا رہے تھے کہ سڑک پر میرے مکان کے نیچے بھیرویں میں ڈھلی ایک تان لرزتی آئی:

سحر بابا دمی گفتم حدیثِ آرزومندی
خطاب آمد کہ واثق شو بالطافِ خداوندی

اور یہ بھی عجیب اتفاقیہ بات تھی کہ میں اُس وقت یہی غزل پڑھ رہا تھا۔ صبح کا سہانا وقت، نسیم سحری کے ہلکے ہلکے جھونکے دُھندلکے میں طلسمی شان اور اُن پر یہ درد بھری تان میرے تمام بدن میں راگنی دوڑنے لگی، ابھی میرا بدن گنگنا رہا تھا کہ اُسی لوچ کے ساتھ دوسری تان سُنی:

دُعائے صبح وآہِ شب کلیدِ گنجِ مقصود است
بایں راہ وروش می رو کہ بادل دار پیوندی

اب مجھ سے رہا نہ گیا ایک ایک چھلانگ میں دو دو تین تین چھلانگیں مارتا سڑک پر آ گیا اور دیکھا کہ ایک گورے چٹے سفید ڈاڑھی کے دراز قامت بزرگ میرے مکان کے نیچے والی قبر کی طرف منہ کیے دھیمے سُروں میں گا رہے ہیں:

بایں راہ وروش می رو کہ بادل دار پیوندی

نہ جانے میرے دل پر کیا بیت گئی کہ میں ہچکیاں لے کر رونے لگا ان بزرگ نے حیرت کے ساتھ بڑھ کر دیکھا تو مجھے موجود پایا اور زیرِ لب کہا اللہ اللہ یہ عمر اور اس قدر درد مندی میاں صاحبزادے تم کون ہو؟ میں نے کہا طالبِ علم ہوں وہ میرے آگے آ گئے اور کہا ''صاحبزادے ذرا اِدھر سڑک کی روشنی میں تو آ جاؤ میں روشنی میں کے کھمبے کے نیچے آ گیا۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا اور بار بار دیکھا اور اس طرح دیکھا جیسے کوئی چیز آنکی جا رہی ہو اور پھر کانپتی آواز میں دوبارہ پوچھا صاحبزادے تم کون ہو؟ میں نے پھر وہی کہا طالبِ علم ہوں۔ انہوں نے یہ سُن کر آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھائیں اور بڑی آہستگی سے کہا صاحبزادے طالبِ علم نہیں ہو مطلوبِ علم ہو اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور:

درخراباتِ مغاں نُور خُدا می بینم
ویں عجب بیں کہ چہ نورے زکجا می بینم''

جب میں نے یہ واقعہ پڑھا تو میرے دل کی عجیب کیفیت ہوئی اور میں نے اُسی وقت الماری سے دیوانِ حافظ نکالا اور پوری غزل پڑھی عجیب سُرور آیا اور یہ شعر زبانی یاد ہو گیا۔

گزشتہ سال دسمبر کے مہینے میں جنرل محمود الحسن سے ان کے کلینک میں شعر و ادب پر گفتگو ہو رہی تھی انہوں نے کہا کہ سُرور صاحب میں نے اپنی ''خودنوشت'' قلمبند کی ہے اور چھپوانے کا ارادہ ہے کوئی اچھا سا نام تجویز کیجیے میں نے فوراً کہا کتاب کا نام ''حدیثِ آرزومندی'' کیسا رہے گا؟ انہوں نے کہا بہت خوب اور یہی نام رکھ لیا۔

آیئے اب اس کتاب پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ جنرل محمود الحسن جولائی ۱۹۲۵ء میں ایمن آباد (گوجرانوالہ) میں پیدا ہوئے ان کے آباواجداد قدیم سے وہیں رہتے تھے۔ ان کا تعلق شیخ برادری سے ہے دادا کا نام شیخ فضل الٰہی تھا جو اردو اور فارسی کے جید عالم تھے۔ رُودکی سے لے کر شیخ سعدی تک تمام فارسی شعراء کے ہزاروں شعر ان کو ازبر تھے اور وہ علم دوست حضرات کی محفل میں گھنٹوں فارسی شعرا کا کلام سناتے اور اُن کے مطالب بیان کرتے تھے۔

اُن کی لکھائی اتنی خوبصورت تھی کہ لوگ دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔ اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے موٹے موٹے رجسٹر اب بھی جنرل صاحب کے پاس موجود ہیں جن کا یہ اکثر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کے دادا نے اس سلسلہ میں ان کی تربیت بھی کی یہی وجہ ہے کہ ان کی لکھائی بھی (اردو اور انگریزی) بڑی خوشخط ہے ان کے والد بڑے ذہین تھے اور کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ ان کی تعلیم میٹرک تک تھی یہ خود لکھتے ہیں کہ اُن کی مالی حالت ہمیشہ کمزور رہی کلرک کی تنخواہ ہی کتنی ہوتی ہے اس کے باوجود وہ نہایت صابر و شاکر تھے۔ مہینہ کے آخر میں کئی مرتبہ کھانے کے لیے بھی مشکل پڑ جاتی تھی۔ یہ والد کے ہمراہ کافی عرصہ جالندھر اور فیروز پور میں بھی رہے انہیں شعر و شاعری سے بچپن سے ہی لگاؤ تھا لیکن چونکہ کسی استاد شاعر سے کبھی رابطہ نہیں رہا اس لیے اشعار لکھ کر سکول کے ساتھیوں کو سنا دیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں اپنی سرگذشت میں یوں لکھا ہے۔

''نویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے میں اچھا خاص شاعر بن چکا تھا۔ فیروز پور میں ایک بہت معروف شاعر علامہ عیش پوری تھے وہاں جب کوئی مشاعرہ ہوتا میں سامعین میں شامل ہو جاتا۔ علامہ عیش بہت سخت انسان تھے اگر کسی شاعر کے شعر میں ذرا سی بھی خرابی ہوتی تو بآواز بلند جھاڑ دیتے بلکہ بعض دفعہ تو یہاں تک کہہ دیتے کہ میاں کوئی اور کام کرو شاعری تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ ان کے ہوتے تو میرے لیے کسی مشاعرہ میں کلام سنانا ناممکن تھا لیکن ایک دن مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ علیحدگی میں اُنہیں اشعار سنا کر اُن کی رائے

حاصل کروں ہر دفعہ میں ڈر جاتا کہ خدا جانے وہ کیا ارشاد فرمائیں اگر انہوں نے کہہ دیا کہ میاں شاعری کا خیال ترک کر دو تو بہت دل شکنی ہوگی اور شاعری چھوڑنا پڑے گی۔ ایک دن میں نے ارادہ کر لیا کہ علامہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ اتوار کا دن تھا اور میں نے پروگرام بنایا ہوا تھا۔ صبح سے ہی ٹانگیں کانپنا شروع ہو گئیں اور زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ بہر حال کلمہ پڑھا اور اُن کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُنہوں نے مجھے دیکھ کر کہا ''لونڈے کیا بات ہے'' میں نے عاجزی سے کہا کہ علامہ صاحب مجھے آپ سے اپنے متعلق رائے لینی ہے۔ میری عمر اُس وقت چودہ سال تھی ڈرتے ڈرتے بات آگے بڑھائی اور کہا حضور میں شعر کہتا ہوں۔ آپ مشہور و معروف شاعر ہیں اپنے کچھ اشعار لایا ہوں دیکھ لیں اور رائے دیں کہ میں یہ شُغل جاری رکھوں یا چھوڑ دوں۔ اُنہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا کہ جو اشعار لائے ہو وہ آپ کے اپنے ہیں یا کسی سے تصحیح کرائی ہے۔ میں نے کہا جناب میں نے کسی کو نہیں دکھائے۔ علامہ نے میری ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر کہا لاؤ میں دیکھ لیتا ہوں۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے ایک نظم اور ایک غزل جیب سے نکالی علامہ صاحب نے دونوں کاغذ تھام لئے اور فرمایا کہ آپ کی لکھائی تو خوبصورت ہے کلام بھی دیکھ لیتا ہوں۔ اس میں ایک نظم تھی جو میں نے ایک پرندہ کو قفس میں دیکھ کر لکھی تھی۔ اُس کا عنوان ہے ''فریادِ اسیرِ قفس'' اور اشعار تھے:

کُنجِ قفس میں ہُوں میں اور بچے آشیاں میں
لگ جائے آگ یارب اس دورِ آسماں میں
بہتا ہے اشک بن کر اب خُون میرے دل کا
دردِ نہاں چھپا ہے گو یا مری فُغاں میں
شعلے بھڑک رہے ہیں وہ قلبِ مضطرب سے
آہوں سے پڑ گئے ہیں چھالے مری زباں میں
بے آب جیسے مچھلی کوئی تڑپ رہی ہو
بے تاب اُس طرح ہے دل جسمِ ناتواں میں
جی چاہتا ہے اُڑ کر پہنچوں میں پھر چمن میں
اور مست ہو کے گاؤں ہر تختۂ سخن میں

جوں جوں علامہ نے اس نظم کو پڑھا ان کے چہرے پر خوشگوار اثرات نمودار ہوئے مسکرا کر کہنے لگے اگر تم سچ بول رہے ہو کہ یہ نظم تمہاری ہی سعی کا نتیجہ ہے تو تم ضرور شاعری کرو۔ پھر علامہ نے غزل بھی پڑھی اشکبار کچھ اس طرح تھے:

رات دن اشکبار ہیں آنکھیں — کیا کوئی آبشار ہیں آنکھیں
دل کی صورت بھی دیکھ لو اِن میں — دل کی آئینہ دار ہیں آنکھیں
دیکھنے میں حسین لگتی ہیں — ورنہ گردوغبار ہیں آنکھیں
وہ ہیں آنکھوں کے سامنے پھر بھی — جانے کیوں بیقرار ہیں آنکھیں
چشمِ بینا نہیں ہے ویسے تو — ہر جگہ بے شمار ہیں آنکھیں

ان کو پڑھ کر علامہ نے میری طرف دیکھا اور مُسکرا کر کہا تم تو بچپن میں ہی اچھے شعر کہہ لیتے ہو مشق جاری رکھو کچھ نہ پوچھو کہ میرا دل کس طرح خوشی سے اُچھل رہا تھا میں نے علامہ صاحب کا شکریہ ادا کیا اور جھک کر سلام کرنے کے بعد گھر کی سمت روانہ ہوا۔

انہوں نے اپنی غربت کو ہرگز نہیں چھپایا اور برملا اُس کا ذکر کیا۔ میڈیکل کالج میں پڑھائی کے دور کا ذکر ایک جگہ یوں کرتے ہیں کہ ''ایک دفعہ سردی نے بہت تنگ کیا اپنی والدہ سے کہا کہ گرم کوٹ خرید دیں۔ اُن کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں کہنے لگیں یہ کمبل جو رات کو اوڑھتے ہو اسے کالا رنگ دلوا کر اس کا کوٹ بنوا لو۔ لہٰذا اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک کلاس فیلو کہنے لگا کہ یار اتنی سردی ہے کوئی اچھا سا کوٹ خرید لو۔ میں نے کہا کہ یار یہ بھی تو گرم کوٹ ہے جو میں نے پہن رکھا ہے۔ اُس نے ہنس کر کہا کہ اس کا گرم گرم تو جھڑ چکا ہے صرف کوٹ ہی رہ گیا ہے۔ باقی کپڑوں کا بھی یہی حال تھا۔ غم کو کبھی قریب بھٹکنے نہیں دیا جھوٹی ہنسی سے کام چلتا رہا۔

جنرل محمود الحسن نے خود نوشت کو واقعات کی کھتونی نہیں بتایا بلکہ نہایت اختصار سے کام لیتے ہوئے زندگی کے تمام نشیب و فراز کو نہایت چابکدستی سے من و عن بیان کر دیا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی اہم اور ضروری واقعہ کو نظر انداز بھی نہیں کیا۔

انہوں نے نہایت محنت اور لگن سے اپنی مدت ملازمت پوری کی اور ان کے مریض انہیں اب تک یاد کرتے ہیں۔ دورانِ ملازمت انہوں نے بہت سے سویلین مریضوں کے اپریشن بھی کئے۔ انہیں میں ایک مرتبہ معروف شاعر عبدالحمید عدم نے بھی ان سے اپنا اپریشن کرایا وہ ان کے اخلاق اور گفتگو سے بہت متاثر ہوئے اور جب صحت یاب ہو کر رخصت ہونے لگے تو انہوں (عبدالحمید عدم) نے شکریہ کے ساتھ ان کو ایک نظم لکھ کر دی جو حسبِ ذیل ہے:

مردانِ راہ

چیر کر اضطراب کے ٹیلے — آبِ شیریں صفات دیتے ہیں
اُف یہ کوثر مزاج سرجن جو — نشتروں سے حیات دیتے ہیں

چُوس لیتے ہیں روح کی کلفت — دل کے کانٹے نکال دیتے ہیں
جسم کے روگ منقطع کر کے — جس میں روح ڈال دیتے ہیں

ان کے وجدان کا ہر اندازہ — اس لیے کامگار ہوتا ہے
اِن کے حُسنِ عمل کے سانچے میں — خود خُدا محوِ کار ہوتا ہے

غرض زیرِ تبصرہ خود نوشت حدیثِ آرزومندی ہمارے سوانحی ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ امید ہے اسے ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی۔

رشید لکھنوی اور نظام دکن محبوب علی پاشا

رباعی گوئی کا دلچسپ مظاہرہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا)

سید مصطفیٰ میرزا رشید لکھنوی متوفی ۱۹۱۸ء پیارے صاحب رشید کے نام سے معروف اور ممتاز شاعر میر انیسؔ کے حقیقی نواسے تھے۔ اگرچہ ان کی شہرت مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے ہوئی لیکن وہ عمدہ رباعی اور غزل گو شاعر بھی تھے جن کی صدارت میں کئی نامور شاعروں نے مشاعرے پڑھے جن میں علامہ اقبال بھی شامل ہیں۔ راقم نے رشید لکھنوی کا زندگی نامہ اپنی تازہ تصنیف ''رباعیات رشید میں احوال پیری'' کو رباعیات کی تشریح اور تجزیئے کے ساتھ کیا ہے جس کی تکرار کی یہاں ضرورت نہیں۔

نظام سادس میر محبوب علی خان متوفی ۱۹۱۲ء اچھے شاعر تھے اور آصف تخلص کرتے تھے وہ کئی بڑے شاعروں کے شاگرد بھی رہے جن میں داغؔ دہلوی، عبدالقادر گرامیؔ، جلیلؔ اور رشید لکھنوی قابل ذکر ہیں۔ محبوب علی پاشا سخن گو ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے سخن شناس اور سخن پرور حکمران تھے۔ حیدرآباد دکن کی محرم کی مجالس میں عموماً شرکت کرتے اور ان کے سلام عموماً خوش لحن مرثیہ خوان پڑھ کر دادِ تحسین حاصل کرتے تھے۔

سید آغا اشہرؔ لکھنوی اپنی کتاب ''حضرت رشیدؔ'' مطبوعہ ۱۹۲۲ء میں کہتے ہیں کہ ''مرزا دبیرؔ کے فرزند مرزا محمد جعفر اوجؔ نواب فیاض علی خان کی ڈیوڑھی میں مرثیہ پڑھتے تھے۔ غالباً ۱۳۳۳ھ میں حضور نظام میر محبوب علی پاشا مجلس میں تشریف لائے اور جناب اوجؔ کو سنا۔ مجلس کے اختتام پر دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انیسؔ کے نواسے پیارے صاحب رشیدؔ بہرام الدولہ کے پاس مجالس مرثیہ پڑھتے ہیں چنانچہ دوسرے سال حضور نظام بہرام الدولہ کی ڈیوڑھی شادی خانہ گئے اور پہلی بار رشیدؔ کو سنا۔ شادی خانہ میں حضور نظام کے لیے مسند تکیہ نہیں بچھایا گیا کیوں کہ نظام نے نواب فیاض کی ڈیوڑھی میں مسند تکیہ ہٹا دیا تھا اور وہ اسی سادے فرش پر بیٹھے رہے جس پر عزادار بیٹھے تھے۔

اشہرؔ کہتے ہیں: ''حضور نظام مبر سے کچھ فاصلہ پر دوزانو تشریف فرما ہوئے۔ زیادہ قابل مدح یہ امر ہے کہ باوجود ایسی شدید گرمی کے کہ پسینہ میں تر بتر ہو گئے تھے۔ اپنے پنکھے کو رکوا دیا جبکہ دوسرے شرکاء مجلس کو برابر پنکھا جھلا گیا۔''

رشیدؔ لکھنوی آداب شاہی بجالا کر ممبر پر تشریف لائے اور پہلے یہ رباعیاں پڑھی۔

ماشاء اللہ ہے بہت خوب آباد
خوش وضع آباد۔ ہے خوش اسلوب آباد
حضرت کے قدم سے پائی ہے یہ صورت
حیدر آباد اب ہے محبوب آباد

کیا کام جو چمن و ختن آباد رہے
شہزادے جئیں یہ چمن آباد رہے
اعلیٰ حضرت کو خضرؑ کی عمر ملے
تا حشر یہ ملکِ دکن آباد رہے

محبوب علی پاشا کے ساتھ ان کے ولی عہد میر عثمان علی خان اور دیگر شہزادگان موجود تھے چنانچہ دوسری رباعی میں اس طرف اشارہ کیا۔

طالع جو بلندی پہ ہمارے آئے
مہتاب کے ساتھ ماہ پارے آئے
ہیں جلوہ فگن شاہ بھی شہزادے بھی
خورشید کے ہمراہ ستارے آئے

ان رباعیوں کے بعد سلام پڑھا پھر مرثیہ شروع کیا۔ حضور نظام پر رشیدؔ کے کلام کا جادو اثر کر رہا تھا نظام آواز بلند کے ساتھ داد تحسین دے رہے تھے اور گلزار لکھنؤ کا بلبل چہک رہا تھا۔ رشیدؔ جھک جھک کر آداب بجالا رہے تھے۔ یہاں اس بات کا ذکر خارج از محل نہیں کہ محبوب علی پاشا شاعری میں سلیس شگفتہ شعر اور سادگی کو ترجیح دیتے تھے اور رشید لکھنوی کی شاعری داغؔ کی شاعری کی طرح روزمرہ کی عمدہ مثال تھی۔ جب بھی امور مملکت سے فرصت ہوتی نظام رشیدؔ لکھنوی کو سننے کے لیے شادی خانہ میں آتے چنانچہ ۱۳۲۸ھ میں حضور نظام نے چودہ مجالس میں شرکت کی۔ نظام نے اپنی بہت ساری رباعیاں اور سلام رشیدؔ لکھنوی کو دے کر کہا کہ آپ مرثیہ پڑھنے سے پہلے میری ایک دو رباعیاں اور ایک سلام پڑھیے چنانچہ رشیدؔ نے نظام کے حکم کے مطابق عمل کر کے ہر روز نظام کی رباعی اور سلام پڑھنے سے پہلے اپنی بھی رباعی پڑھی جس میں نظام کی رباعی کا جواب، تشکر اور کلام نظام کی تعریف تھی۔

پہلے روز رشیدؔ نے اپنی رباعی سے مجلس کا آغاز کیا۔

رفعت کے پیام مجھ کو رفعت نے دیئے
پیغام نام مجھ کو عزت نے دیئے
کیوں نہ ہو رشیدؔ اپنی توقیر پہ ناز
پڑھنے کو سلام مجھ کو حضرت نے دیئے

پھر نظام کی رباعی پڑھی۔

مشکل ہے سخن میں ہو لطافت پیدا
مشکل ہے معانی میں ہو جدّت پیدا

جب خون جگر کھاتے ہیں شاعر آصفؔ
تب ہوتی ہے اشعار میں رنگت پیدا

دوسرے روز نظام کے سامنے اپنی رباعی پڑھ کر نظام کی رباعی کی تلاوت کی۔

اعلیٰ حضرت کو داد کیا دی جائے
یہ نظم اچھی نظر سے دیکھی جائے
قرآن حق کا ۔ یہ ظلِّ حق کا ہے کلام
بعد اس کے تلاوت اس کی بھی کی جائے

آصفؔ:

مہ رو ہے کوئی اور کوئی گل رو ہے
لالہ ہے کہیں اور کہیں شب بو ہے
سو رنگ کے ہیں گل مگر آصفؔ ہم تو
چنتے ہیں وہ گل جس میں وفا کی بو ہے

رشیدؔ لکھنوی نے پھر نظام سادس کا سلام پڑھا جو آج بھی بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ مجالس میں پڑھا جاتا ہے۔ یہ سلام پندہ اشعار پر مشتمل ہے ہم صرف نمونہ کے طور پر چند اشعار پیش کرتے ہیں۔

فدا ہوں اس پر سلامی ہے جس کا نام حسینؑ
مرا معیں مرا آقا مرا امام حسینؑ
صبا کو بھیج کر روضے پر کر رہا ہوں دعا
کریں قبول الٰہی مرا سلام حسینؑ
میں اپنے دل کو بہت پاک صاف رکھتا
کہ شاید اس میں کسی دن کریں قیام حسینؑ
جو کوئی پوچھتا نام آپ کا تو فرماتے
شکستہ دل، وطن آوارہ، تشنہ کام حسینؑ

نواب محبوب علی پاشا رشیدؔ لکھنوی کے کلام سے خوب واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بڑھاپے کے مضمون پر رشیدؔ کی طرح کسی اردو یا فارسی کے شاعر نے اتنی عمدہ رباعیات نہیں لکھیں۔ راقم نے رشیدؔ لکھنوی نے تقریباً (۱۶۰) رباعیات کو جو تقریباً تمام پیری کے مضامین سے سجی ہوئی ہیں تشریح اور تجزیے کے ساتھ پیش کیا ہے۔

رشیدؔ نے نظام کی رباعی مجلس میں پہلے پڑھی پھر دوسری رباعی میں اس کا جواب دیا۔

آصفؔ:

مداحِ امامؑ دوجہاں ہیں یہ رشیدؔ
لاریب کہ اعجاز بیاں ہیں یہ رشیدؔ
پیری میں نیا رنگ سخن کا دیکھا
میں کیا کہوں واللہ جواں ہیں یہ رشیدؔ

رشیدؔ:

پیری میں جواں بن کے دیکھوں گا میں
اک جامہ نیا پہن کے دیکھوں گا میں
حضرت نے جواں کہا سنا تو نے فلک
ہر بار اب تجھ کو تن کے دیکھوں گا میں

اگرچہ رشیدؔ لکھنوی بڈھے اور ضعیف ہو چکے تھے۔ لیکن جب ممبر پر رونق افروز ہو کر مرثیہ پڑھتے تو کچھ اور ہی بات ہوتی ایسا محسوس ہوتا ایک جوان شخص جادو بیانی کر رہا ہے۔ چنانچہ اس مطلب کو نظام نے اپنی رباعی میں ظاہر کیا جس کا رشیدؔ نے عمدہ جواب بھی دیا۔

آصفؔ:

گو پیر ہیں پر طبع کی جودت دیکھو
ہر شعر میں ہر بات میں جدّت دیکھو
کہتے ہیں یہ آصفؔ سے مضامین رشیدؔ
پیری میں جوانی کی طبیعت دیکھو

رشیدؔ:

حضرت کی یہ اعجاز بیانی دیکھی
پیری کی نہ ذرّہ بھی نشانی دیکھی
آداب بجالاتے ہی تھا رنگ کچھ اور
جھک کر جو اُٹھا میں تو جوانی دیکھی

مرثیوں میں بہار کے مضامین اور ساقی نامہ رشیدؔ کی دین ہے۔ چنانچہ کسی مرثیے میں بہار یہ مضامین سے متاثر ہو کر نظام نے رباعی لکھی جس کا شکریہ اور جواب رشیدؔ نے دیا۔ مجلس کے شرکاء اس رباعی بازی سے لطف اندوز ہوتے رہے اور دو عمدہ رباعی کے شاعر ایک دوسرے کے ہنر کا اعتراف کرتے رہے۔

آصفؔ:

کیا خوب سخن تم نے سنایا ہے رشیدؔ
مضمون کا اک باغ لگایا ہے رشیدؔ
پیری میں یہ زور طبع ماشاء اللہ
کیا رنگ جوانی کا دکھایا ہے رشیدؔ

رشیدؔ:

قابو میں کبھی لا نہ سکے گی مجھ کو
ڈھونڈھے گی مگر پا نہ سکے گی مجھ کو
اعلیٰ حضرت نے سرفرازی بخشی
پیری اب کیا جھکا سکے گی مجھ کو

ان رباعیوں کے ساتھ نظام آصفؔ کا جو سلام رشیدؔ نے ممبر سے سنایا

وہ اکیس(۲۱) اشعار پر مشتمل ہے جس کے چار اشعار یہاں پیش کرتے ہیں۔

سلامی دیکھا اشکوں کے گوہر ایسے ہوتے ہیں
لئے ہیں شہؐ نے دان میں مقدر ایسے ہوتے ہیں
مضامین غم سرور ذرا دل تھام کر سنیے
رگِ جاں کھول دیتے ہیں یہ نشتر ایسے ہوتے ہیں
سنا شبیرؑ کا نام اور اک بجلی گری دل پر
جو دل میں درد رکھے ہیں وہ مضطر ایسے ہوتے ہیں
زمیں سے عرش پر پہنچادیا شبیرؑ نے حرؑ کو
خدا کے خاص بندے بندہ پرور ایسے ہوتے ہیں

رشیدؔ لکھنوی نے نظام سے خلعت طلب کی چنانچہ خزانہ شاہی سے خلعت اور معقول رقم دی گئی۔ رشیدؔ نے کہا تھا:

ہر اک اضطراب اِدھر آتا ہے
گرمی میں ماہتاب ادھر آتا ہے
سلطان دکن سے مانگتا ہے خلعت
جاڑے میں آفتاب اِدھر آتا ہے

آخری مجلس میں نظام نے ایک خاص رباعی جو رخصتی پر تھی رشیدؔ کو دی جس کا فی البدیہہ رشیدؔ نے جواب دیا اور اس طرح یہ دلچسپ رباعی گوئی کا مظاہرہ تاریخ کے سینے میں چھپا رہا جس کو ہم نے اس تحریر کے ذریعہ ظاہر کیا۔

آصفؔ:

عشق شہِ دیں کا یہ اثر پاتا ہوں
ہر روز میں جاتا ہوں اور آتا ہوں
منظور الٰہی ہے تو پھر آؤں گا
یا حافظ و ناصر کہے جاتا ہوں

رشیدؔ:

پیری سے ضعف گو بہت پاتا ہوں
پھر فصلِ عزا آئے کہ پھر آتا ہوں
حافظ ہے وہ حضرت کو اسی سے لوں گا
میں جس کی حفاظت میں دیئے جاتا ہوں

اس دو رباعیوں میں قافیہ اور ردیف ایک ہی ہے لیکن رشیدؔ کی رباعی فی البدیہہ ہونے کے ساتھ ساتھ مکمل جواب بھی ہے۔

رباعی:

اقبال و حشم طرّۂ دستار رہیں
اعدا ان کے ذلیل و خوار رہیں
ہمراہ رسولؐ ہوں یہ روز محشر
ہو عمر سوا، اور وہ مددگار رہیں

رباعی:

بالفضل جو ہے زمانہ کی جان رہے
شہزادے جئیں عیش کا سامان رہے
یارب آصفؔ کو توسلامت رکھنا
جب تک دنیا رہے یہ سلطان رہے

یہ تمام رباعیات ان کی قادرالکلامی کی سند ہیں۔

این سعادت بازورِ بازو نیست

○

نوکری

مجھے پھر سے مل گئی نوکری یہ بڑی خوشی کا مقام ہے
مری جان تو ہے خوش اس قدر مجھے چومتی سرِ عام ہے

پڑا شور کان مبارکاں ہے یہی ہر اِک کی زبان پر
وہی دوست، دوست ہوئے ہیں پھر وہی صاحب اور سلام ہے

مِرا روز، روز ہے عید کا، مِری رات ، رات برات کی
ہوئی مست پھر سے یہ زندگی، وہی صبح پھر وہی شام ہے

ہمیں جانتے بھی ، کترتے بھی، جو نکلتے جاتے تھے دیکھ کر
وہی فون کرتے ہیں رات دن انہیں ہم سے پھر کوئی کام ہے

وہ ہیں اپنے کام میں منہمک کہ وہ صفوتؔ ایسے بدل گئے
نہ شرابِ کوثری یاد ہے نہ ہی ذکرِ ساغر وجام ہے

○

صفوت علی صفوت

(نیویارک)

وقت سے پرے

پروین شیر
(کینیڈا)

یہ ۱۶؍جون ۱۹۷۶ء کی صبح ہے پروین Soweto میں Moema & Vilakazi اسٹریٹ پر ایک گوشے میں کھڑی ہوئی ہے۔ صبح کی نرم دھوپ نے شہر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا ہے۔ شہر جاگ اٹھا ہے۔ نیند میں ڈوبی ہوئی بند پلکیں وا ہوگئی ہیں۔ وہ دیکھ رہی ہے۔ دس ہزار اسکول کے بچوں نے بغاوت کر دی ہے کیونکہ ۱۹۵۰ء میں اپارٹ ہائیڈ گورنمنٹ نے کالوں کے اسکولوں میں صرف افریقان زبان میں تعلیم دینے کا قانون بنا دیا تھا تاکہ یہ کامیابی حاصل کرنے سے محروم ہی رہیں۔ اس لیے انگلش میں صرف گوروں کو تعلیم دی جا رہی ہے۔ افریقان میں تعلیم حاصل کرنے کے خلاف طالب علموں نے بغاوت کی ٹھان لی ہے۔ آج صبح وہ بچے کلاس میں جانے کی جگہ سڑکوں پر مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ہاتھوں میں Palacards تھامے ہوئے۔ جس پر درج ہے ''Amandla Awehtu'' (لوگوں کو اُن کا حق دو) اور'' Nkosi Sikelel Afrika'' (افریقہ پر اللہ مہربان ہو) وہ دیکھ رہی ہے۔۔۔ معصوم طالب علموں کو جو بغیر کوئی ہتھیار اُٹھائے پُر امن طریقے سے بغاوت پر آمادہ ہیں۔ اپنا حق بغیر کسی تشدّد Violence کے مانگ رہے ہیں۔ وہ انہیں گاتے ہوئے بھی سن رہی ہے۔۔۔'' Morena Bloka Sechaba Saheso'' وہ بے بس کھڑی ہوئی دیکھ رہی ہے۔ پولیس ہتھیاروں کے ساتھ اُن بچوں کی طرف دوڑ رہی ہے۔ بچوں نے خوف زدہ ہو کر پتھراؤ شروع کر دیا ہے۔ پولیس نے آنسو گیس سے فضا کو غبار آلود کر دیا ہے۔ دھماکے۔۔۔ آگ۔۔۔ بھاگتے ہوئے خوف زدہ بچے۔۔۔ پروین رنج و غم سے کانپ رہی ہے یہ سب کچھ دیکھ کر۔ مجبور بچوں کو جہاں بھی راستہ مل رہا ہے وہ بھاگ رہے ہیں۔ کچھ بچے زمین پر زخمی پڑے ہوئے ہیں۔ وہ دوڑ کر انہیں بانہوں میں اٹھا لینا چاہتی ہے لیکن اُس کے پاؤں منجمد ہو گئے ہیں۔ ایک لڑکی Antoinette Sithole (اینٹونیٹ سیتھول) پولیس سے خوف زدہ ہو کر جھاڑیوں میں چھپ کر دوڑ رہی ہے۔ اُس کا چھوٹا بھائی بارہ سال کا Hector Pieterson (ہیکٹر پی ایٹرسن) بھی بھاگ رہا ہے لیکن بہت خطرناک راستے پر جس طرف پولیس ہے۔ ہیکٹر کی سانسیں پھول رہی ہیں۔ وہ ہانپ رہا ہے گھبرایا ہوا ہے۔ اس کی بہن دور جھاڑیوں سے اُسے دیکھ رہی ہے۔ بے چین ہو کر ہاتھ ہلا کر اپنے چھوٹے معصوم بھائی کو آواز دے رہی ہے کہہ رہی ہے ''اس راستے پر نہ جاؤ۔۔۔ وہاں خطرہ ہے'' لیکن ہیکٹر اپنی بہن کی آواز نہیں سن پا رہا ہے کیونکہ ہر طرف چیخ و پکار ہے، شور ہے اور پھر۔۔۔ دھماکے کی پرزور آواز۔۔۔ بارہ سال کے ہیکٹر کا نازک سینہ پولیس کی گولیوں سے چھلنی ہو گیا ہے۔۔۔!

وہ زخمی ہو کر گیا ہے۔ پروین بے بس کھڑی ہوئی ہے اور اُس کی آنکھیں بھیگتی جا رہی ہیں۔ اٹھارہ سال کے ایک لڑکے Mekhubo (مخوبو) نے بڑھ کر ہیکٹر کو گود میں اٹھا لیا ہے۔ ہیکٹر کی بہن گولی کی آواز سے گھبرا کر جھاڑیوں سے باہر نکل آئی ہے اور دیکھ رہی ہے کہ اس کا بھائی کسی کی بانہوں میں بے ہوش ہے، زخمی ہے، منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ ایک ہی پاؤں میں جوتا ہے۔ مخوبو زخمی، خون سے لت پت ہیکٹر کو اٹھائے ہوئے دوڑ رہا ہے۔ اینٹونیٹ کسی گاڑی کی تلاش میں ہے تاکہ اسپتال جا سکے۔ لیکن۔۔۔ ہیکٹر تو دم توڑ چکا ہے۔۔۔ بے رحم پولیس نے اس کی جان لے لی ہے۔ ہیکٹر کی بہن اپنے مردہ بھائی کے ساتھ ساتھ ایک کار کی طرف دوڑ رہی ہے۔ مدد کے لیے چیخ رہی ہے۔ روتی جا رہی ہے۔ پروین بھی رو رہی ہے انہیں دیکھ کر۔۔۔ انسانیت کی پستی دیکھ کر۔۔۔ بربریت دیکھ کر۔۔۔ اور پھر یکایک۔۔۔ کینن کی آواز نے پروین کو جگا دیا تھا۔ ماضی کی طرف وا دروازے بند ہو گئے تھے۔ کینن کہہ رہا تھا ''اب واپس جانا ہے'' وہ چونک اٹھی تھی۔ کہاں تھی وہ؟ وہ تو ہیکٹر میموریل کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ تصورات کی بانہوں میں تھی۔ سنگ مرمر پر بنی ہوئی زخمی ہیکٹر کو بانہوں میں اٹھائے مخوبو، اینٹونیٹ اور ہیکٹر کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ ۱۶؍جون ۱۹۷۶ء کی صبح دیکھ رہی تھی۔ کینن کی آواز اُسے وہاں سے واپس لے آئی تھی جہاں جا کر اُس نے وہ سب دیکھ لیا تھا، محسوس کر لیا تھا، دل کو دکھا لیا تھا، پلکیں نم کر لی تھیں۔ وہ اپنے ساتھی سیاحوں سے چھپ کر اپنی بھیگی پلکیں خشک کرنے لگی تھی۔ دل کے جیل خانے میں محسوسات کے طائر کے پھڑ پھڑانے کی آوازیں سن رہی تھی۔ یہ آوازیں تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اتنی تیز جیسے سماعت کو پوری طرح زخمی کر دینا چاہتی ہوں۔ آخر وہ محسوسات اس نظم کی صورت میں باہر نکل آئے تھے۔ وہ چونک اُٹھی تھی۔ کہاں تھی وہ؟ یہ تو ۳؍مارچ ۲۰۱۱ء کی صبح تھی۔

قوت

چمچماتی، دور تک جاتی ہوئی پختہ سڑک اور
اس کے وزنی پاؤں کے نیچے دبی
روئیدگی کی بے بسی
بے حد گھٹن، تاریکیاں، رستے معطل
رک نہیں سکتے مگر یہ حوصلے اب
درد آ گیں قوتوں کے دھار نے چیرا ہے پتھر!
ہر طرف پھیلیں دراڑیں
پتھروں کی ہر شگاف رگ سے

رستا جارہا ہے بھربھری مٹی کا تازہ خون اب
زخموں کی یہ ہریالیاں
یوں پھوٹ کر ابھری ہیں آخر۔۔۔!!

شام ہورہی تھی۔۔۔ہلکی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔سیّاحوں کو لیے ہوئے وین واپسی ہوٹل کی طرف جارہی تھی۔کیپن بول رہا تھا اپارٹ ہائیڈ پوری طرح بے نقاب تب ہوا تھا جب بارہ سالہ ہیکٹر کی جان پولیس نے لے لی تھی۔۱۶رجون ۱۹۷۶ء کے شعلوں نے دنیا کو اس طرف متوجہ کیا تھا۔۱۶رجون ساؤتھ افریقہ کا یادگار دن ہے اور Public Holiday کا دن ہے۔اڑسٹھ سالہ ہیکٹر کی ماں جس کا نام ڈروتھی مولیفی Drothy Molefi ہے ہر۱۶رجون کو اپنے بیٹے کی یاد میں خاص اہتمام کرتی ہے۔اپنے خاندان کے ساتھ جب ۱۹۴۸ء میں اپارٹ ہائیڈ شروع ہوا تو نسلی تشدد کی انتہا نہ تھی۔مختلف نسلوں اور رنگوں کو الگ کر دیا گیا تھا کہ وہ آپس میں دوستی قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔شادیاں بھی نہیں ہوسکتی تھیں سب کے علاقے الگ کر دیے گئے تھے۔اسکول، اسپتال، قبرستان، اسٹیشن، ریستوران، باتھ روم، پارک اور پبلک ٹرانسپورٹ سب الگ تھے۔کالوں کے پاس ہمیشہ پاس بک ہوتی تھی جو درحقیقت گوروں کے علاقوں میں داخل ہونے کا اجازت نامہ (پاس) تھا، وہ بھی صرف کام کرنے کے لیے۔ پورے ملک سے نسل کی بنیاد پر لوگوں کو ایک علاقے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ساٹھ ہزار کالے لوگوں کو قانوناً ان کے گھروں سے نکال کر سوئیٹو بھیج دیا گیا تھا۔کیپ ٹاؤن کا علاقہ ڈسٹرکٹ چھ مسمار کر دیا گیا تھا اور یہاں کے رہنے والوں کو کہیں اور جانا پڑا تھا۔کالی نسل کا علاقہ ٹوٹا پھوٹا، بدحال چھوڑ دیا گیا تھا۔وہاں بہت برے اسپتال تھے، بجلی نہیں تھی، بچوں کو تعلیم بہت کم دی جاتی تھی کہ بڑے ہوکر وہ گوری نسل کے گھروں میں خدمت گار بنیں اور پھر ۱۹۸۰ء کے آخر تک اپارٹ ہائیڈ کمزور ہونے لگا کیونکہ سوئیٹو کی بغاوت اور ہیکٹر کی موت کے بعد دنیا بھر میں بدنام ہوگیا تھا۔آخر ۱۹۹۰ء میں یہ عذاب ختم ہوا۔یہ گورنمنٹ مٹ گئی۔نیلسن منڈیلا ستائیس برس بعد قید بامشقت سے رہا ہوا اور ۱۹۹۴ء میں پہلا کالی نسل کا پریذیڈنٹ بنا۔آدھی رات تھی جب نیا پرچم قوسِ قزح کا لہرایا تھا۔جب ہر رنگ و نسل کے لوگ مل گئے تھے ساتھ ساتھ۔۔۔کیپن پرجوش آواز میں اپنے ملک کی داستان سنا رہا تھا۔سب پوری دلچسپی کے ساتھ سن رہے تھے وہ درد بھری کہانی جس کا انجام تو اچھا تھا۔اس کی باتیں جاری تھیں۔ہوٹل قریب آرہا تھا۔

(محترمہ پروین شیر کی نظم ونثر اور مصوری سے آراستہ زیرِ طبع کتاب سے منتخبہ)

○

اوراق کی ادبی خدمات

یہ تحقیقی وتنقیدی مقالہ آغاز سے اختتام تک کم وبیش میرے چھ سال کی مسلسل محنت سے پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ ہر چند ماہنامہ ''اوراق'' پر پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام کروایا جارہا ہے مگر میرے خیال میں مختلف موضوعات اور تحریکات کے تناظر کے حوالے سے اوراق پر اس قسم کا کام اب تک پہلے نہیں ہوا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ میری اس کاوش کو عنائت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ میرا یہ تحقیقی کام کسی بڑے علمی وادبی خلا کو پُر کرے گا لیکن قارئین ادب اسے ''اوراق'' کے صفحات میں بکھرے ہوئے ادبی مواد کو یکجا کرنے کی میری سرگرم سعی قرار دے سکتے ہیں۔

تحقیق کے مشکل مراحل میں مجھے جن حضرات کا تعاون حاصل رہا اُن میں مدیر اوراق محترم ڈاکٹر وزیر آغا نے خاص طور پر فراہمی مواد میں میری بڑی مدد کی۔ ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر سجاد نقوی (اوراق کے معاون مدیران) اور ڈاکٹر انور محمود خالد (نگران) مقالہ کی تکمیل تک میرے رفیق ورہنما رہے۔

ڈاکٹر محمود احمد اسیرؔ
مکان نمبر 31-S-3 بلاک 17، سرگودھا
موبائل: 0322-7149735

پیشگی معذرت کے ساتھ

ایس۔ایم۔معین قریشی
(کراچی)

شاعری کی مختلف زاویوں سے تعریف کی گئی۔ نقادانِ فن نے اس کے رنگ، آہنگ، صوتی و جمالیاتی پہلوؤں سے گزرتے ہوئے معنویت و عدم معنویت، جدیدیت و مابعد جدیدیت، ساختیات و پس ساختیات جیسے ادق موضوعات اس کے بطن سے برآمد کیے۔ بہ ایں ہمہ، جیسا کہ حالؔی نے ''مقدمہ شعروشاعری'' میں لکھا ہے، شعر کی کوئی تعریف ایسی نہیں جسے جامع و مانع قرار دیا جاسکے۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ شعر کی ماہیت انسانی فہم وادراک سے ماورا ہے۔ ہمیں اس ضمن میں امریکی ادیب اور شاعر ایڈگر ایلن پو (EDGAR ALLAN POE) کے اختصار اور جامعیت نے بہت متاثر کیا۔ بقول اس کے "Poetry is the rhythmic creation of beauty in words" (شاعری الفاظ میں مترنم حسن کی تخلیق ہے)۔ ہمارے ایک خوش کلام مزاح گو مسؔتر دہلوی نے شعر کے بارے میں یہی کچھ کہا تھا۔

ہو جو ایک مجموعہ حسنِ بیان ، حسنِ خیال
خوبصورت شعر کی مسؔتر یہی تعریف ہے

لوازمات شاعری میں تخیل ، مشاہدہ ،اسلوب، انتخابِ الفاظ ، برجستگی اور معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ رمزیت بھی ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر شعر ایک بے کیف قافیہ پیمائی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مثال کے طور پر فنی اعتبار سے یہ بھی ''اشعار'' ہیں۔

اکہتر، بہتر، تہتر، چوہتر
پچھتر، چھیتر، ستتر، اٹھتر
اکاسی، بیاسی ،تراسی، چوراسی
پچاسی ،چھیاسی، ستاسی، اٹھاسی
پہلے تُو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے گُل بھینس کے انڈے سے نکال

موخرالذکر فرضی شعر کو غالؔب سے منسوب کرکے ایک صاحب نے خود مرزا کی موجودگی میں اُن کی مشکل پسندی پر چوٹ کی تھی۔ شعر میں رمزیت کے حوالے سے محسؔن بھوپالی کا یہ قول برمحل ہے۔

بات بین السطور ہوتی ہے
شعر میں حاشیے نہیں ہوتے

''بین السطور'' بات کرتے کرتے بعض شعرا اپنے کلام میں ایسے نظریات پیش کر دیتے ہیں جو الفاظ کی چستی اور بندش کے باعث فوری طور پر تو قاری/سامع کو متاثر کرتے ہیں لیکن ذرا غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ ان کا پیش کردہ نظریہ انسانی شعور، تجربے اور وجدان کے دائرے سے باہر ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ عملاً ممکن ہی نہیں۔ اسے مبالغہ بھی نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ مبالغہ کسی خیال کو بڑھا چڑھا کر تو پیش کرتا ہے، عدم کو وجود میں نہیں لاسکتا۔ اس سلسلے میں حالؔی کا یہ صائب مشورہ شاعروں کے لیے مشعلِ راہ کا درجہ رکھتا ہے ''شعر میں جہاں تک ممکن ہو حقیقت اور راستی کا سررشتہ ہاتھ سے جانا نہیں چاہیے۔'' آج کچھ ایسے اشعار کا ذکر کیا جارہا ہے جن میں مافوق الفطرت، ناقابلِ عمل یا دُوراز کار نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے تخلیق کار تمام شعرا جانے پہچانے ہیں لیکن ہم نے ناموں سے اس لیے گریز کیا ہے کہ کچھ تو اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور جو بقیدِ حیات ہیں ان کے بارے میں اندیشہ ہے کہ ع انیؔس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو۔ ویسے بھی کسی شاعر کے ایک آدھ شعر میں کہیں کوئی سقم رہ جائے تو اِس سے اُس کی مسلمہ حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بے عیب تو صرف خدا کی ذات ہے۔ لہٰذا پیشگی معذرت کے ساتھ چند اشعار درج ذیل ہیں جو باذوق قارئین کے لیے یقیناً باعث دلچسپی ہوں گے۔ پہلے تین مثالیں فلم کی دنیا سے پھر کچھ معروضات ''علم'' کے تعلق سے پیش کی جائیں گی۔

قیامِ پاکستان سے قبل بننے والی فلم ''زینت'' کی ایک مشہور قوالی لوگوں کو آج بھی یاد ہوگی۔ اس میں نمایاں آواز نورجہاں کی تھی اور یہ غالباً پہلی زنانہ (فلمی) قوالی تھی۔ اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کیے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا
ہم دل کو پکڑ کر بیٹھ گئے ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا

شعر میں بے زبانی اور بے کسی کا نقشہ کھینچا گیا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شاعر اپنے دل کو ''پکڑ کر'' بیٹھ گیا تو کلیجہ تھامنے کے لیے اضافی ہاتھ اُس کے پاس کہاں سے آئے؟ اسی دور کا نورجہاں کا گایا ہوا فلم ''خاندان'' کا یہ نغمہ بھی بہت مشہور ہوا۔

تُو کون سی بدلی میں مرے چاند ہے آجا
تارے ہیں مرے زخمِ جگر ان میں سماجا

چاند کہہ کر عموماً بیٹے کو مخاطب کیا جاتا ہے لیکن شاعر نے ''ادبی اجتہاد'' سے کام لیتے ہوئے یہ لفظ محبوب کے لیے استعمال کیا ہے۔ چلیے مان لیتے ہیں کہ مغنیہ کو اپنا محبوب، بیٹے کی طرح عزیز تھا لیکن قابلِ غور نکتہ اس کا چاند سے یہ احمقانہ مطالبہ ہے کہ وہ آئے اور تاروں میں سما جائے۔ اب ایک چاند بچارہ کس کس تارے میں اور کس طرح سمائے گا شاعر کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اسی

طرح 1949ء کی ایک ہندوستانی فلم (''بڑی بہن'') کا یہ دوگانہ بہت مقبول ہوا جسے لتا اور ثریا نے گایا تھا۔

جو دل میں خوشی بن کر آئے وہ درد بسا کر چلے گئے
جو شمع جلانے آئے تھے وہ شمع بجھا کر چلے گئے

شاعر نے جلنے اور بجھنے کے تضاداتی عمل سے شعر میں ڈرامائیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی صاحب شمع ''جلانے'' کے لیے آئے تھے تو شمع لازماً بجھی ہوئی ہوگی۔ اگر شمع پہلے سے بجھی ہوئی تھی تو وہ کیا چیز بجھا کر چلے گئے؟ اسی نوعیت کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

شام ہوتے ہی چراغوں کو بجھا دیتا ہوں
دل ہی کافی ہے تری یاد میں جلنے کے لیے

شاعر صاحب تقسیمِ کار کے قائل نظر آتے ہیں۔ دن میں اپنے محبوب کی یاد میں چراغوں کو جلاتے ہیں لیکن جوں ہی شام آتی ہے وہ ان جلنے والوں کو آرام دے کر اپنے دل کو اس کام پر مامور کر دیتے ہیں۔ اگر وہ اس کے برعکس عمل کرتے تو ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ ہو جاتا اور ان کا گھر بھی روشن رہتا۔ موجودہ ترتیب میں دن کے وقت تیل کا ضیاع بظاہر کوئی دانش مندانہ اقدام نہیں لگتا۔

ہمارے ایک نامور شاعر (جو اَب اس دنیا میں نہیں) کا ایک مشہور شعر ہے۔

گنگناتی ہوئی آتی ہیں فضا سے بوندیں
کوئی بدلی تری پازیب سے ٹکرائی ہے

بظاہر شعر نازک خیالی کا مرقع ہے لیکن اس میں پیش کردہ بدلی اور پازیب کے اتصال کا تصور عام حالات میں بعید از قیاس ہے۔ پازیب زمین پر ہوتی ہے اور بدلی آسمان پر۔ ان دونوں کا ٹکراؤ کیسے ہو گیا؟ یہ صرف اُس وقت ممکن ہے کہ جس کے پیروں میں پازیب ہے وہ یا تو کوئی بہت اونچی چھلانگ لگائے یا پھر بھری برسات میں پیراشوٹ سے نیچے کُود ے۔ ایک تیسری صورت یہ ہے کہ شاعر نے بارش کے دوران اپنے محبوب کو پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا دیا ہے لیکن محض ایک شعر کہنے کی خاطر اُس غریب سے اتنی مشقت کرانا کچھ مناسب نہیں لگتا۔

دورِ حاضر کے ایک انتہائی قد آور اور ہر دل عزیز شاعر کی ایک غزل (جسے مہدی حسن نے اپنی سحر انگیز آواز میں گا کر امر کر دیا ہے) کا یہ شعر دیکھیے۔

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

ہم نے تو ہمیشہ یہی سنا اور پڑھا کہ عاقبت صرف انسانوں کی ہوتی ہے اور وہی حساب کتاب کے مراحل سے گزریں گے لیکن اس شعر نے ہمارے ناقص علم میں یہ بیش بہا اضافہ کیا کہ شبِ ہجراں کی بھی عاقبت ہوتی ہے۔ یہ ایک خاص برانڈ کی عاقبت ہے جو عاشق کے آنسوؤں سے سنور جاتی ہے حالانکہ مظلوم کی آہ اور آنسو سے تو ظالم کی عاقبت بگڑ جاتی ہے۔

ایک معروف اور محترم کالم نویس شاعر کا شعر ہے۔

ظلم بچے جَن رہا ہے کوچہ و بازار میں
عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہیے

شعر میں ظلم کی دیدہ دلیری اور عدل کی بے بضاعتی کا بیان ہے جو ایک حقیقت ہے۔ شاعر کے جذبات قابلِ قدر ہیں لیکن عدل کو ''بانجھ'' اور ظلم کو ''کثیر العیال'' قرار دیتے وقت شاعر سے الفاظ کے انتخاب میں چُوک ہو گئی اور اس نے ظلم سے بچے جنوا دیے اگرچہ ''ظلم'' مذکر ہے۔ ایک مرحوم استاد کا شعر ہے۔

خیر ہو تیری نا خدا، ناؤ جو ڈوبنے لگی
اس سے تُو خود اتر گیا، مجھ کو سوار کر دیا

اول تو ڈوبتی ہوئی کشتی سے اترا نہیں جاتا، کُودا جاتا ہے۔ دوم، جس وقت ناخدا کشتی چھوڑ رہا تھا تو شاعر کہاں تھا؟ کیا بھنور میں کشتی کے قریب بنی ہوئی کسی سڑک پر کھڑا تھا جو ناخدا نے اسے آرام سے ڈوبتی ہوئی کشتی میں ''سوار'' کرا دیا کہ چڑھ جا بیٹا سولی پہ رام بھلی کرے گا؟ ہمارے دور کے ایک قادر الکلام (مرحوم) شاعر کا شعر ہے۔

گندم نے ہمیں خلدِ بریں کا نہیں رکھا
لیکن غمِ گندم نے کہیں کا نہیں رکھا

شعر کا تانا بانا اس مفروضے کے گرد بُنا گیا ہے کہ جنت میں حضرت آدمؑ نے جو ممنوعہ شے کھائی تھی وہ گندم تھا۔ حضرت آدمؑ کی آزمائش کا یہ واقعہ قرآن حکیم میں کئی جگہ آیا ہے لیکن کسی بھی قرآنی آیت یا حدیثِ مبارکہ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ جس درخت کے پاس جانے سے حضرت آدمؑ کو روکا گیا تھا وہ کس چیز کا تھا۔ اس ضمن میں کی جانے والی قیاس آرائیوں کی کوئی اصل نہیں۔ بہر حال یہ طے ہے کہ حضرت آدمؑ نے گندم نہیں کھایا تھا اس لیے کہ گندم درخت پر نہیں اُگتا بلکہ کھیت میں پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ایک پُر گو شاعر کا شعر ہے۔

ایک وہ شخص جو پتھر پہ اُگائے گندم
ایک یہ شخص جو گندم میں ملائے پتھر

شاعر نے ملاوٹ کے موضوع پر جو تقابلی موقف اختیار کیا ہے اس سے تو اختلاف ممکن نہیں لیکن پتھر پر گندم اُگوا کر اس نے کسان کی اس تمام محنت شاقہ پر پانی پھیر دیا جو وہ اپنی زمین کو قابلِ کاشت بنانے پر صرف کرتا ہے۔ پتھر پر تو صرف کائی ہی ''اُگ'' سکتی ہے۔ ایک خوش گلو شاعرہ کا شعر ہے۔

جو جواں ہو کے بہائیں گے لہو بھائی کا
ایسے بچوں کو نہ جینے کی دعا دی جائے

بچوں کو جو دُعائیں دی جاتی ہیں ان میں طویل العمری کی دعا بھی شامل ہوتی ہے۔ اب کس کے پاس علمِ خضرؑ ہے کہ وہ کسی بچے کے بارے میں

پہلے سے جان لے کہ وہ بڑا ہو کر خون خرابا کرے گا لہٰذا اسے جینے کی دعا نہ دی جائے؟

روشن خیال اور انسانیت کے غم خوار لوگوں میں ایک شعر بہت مقبول ہے۔

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

سیدھے سادے الفاظ میں، شاعر نے نماز نہ پڑھنے کے لیے ایک عذر لنگ تراشا ہے۔ اسے اتنی سی بات بھی نہیں معلوم کہ اگر مسجد واقعی بہت دور ہے تو روتے ہوئے بچے کو تلاش کرنے کے بجائے وہ گھر میں نماز پڑھ سکتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے وطن کی محبت میں ''سرشار'' ایک شاعر نے اپنی ایک نظم میں مختلف بہانوں سے عورتوں کو حجاب اور دوپٹے سے اجتناب برتنے کا بھاشن دیا تھا۔ نظم کے تین اشعار پیشِ خدمت ہیں:

حجابِ فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حسن کو پردہ بنا لیتی تو اچھا تھا
تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تُو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

پرچم کے لیے خاتون سے اس کے دوپٹے کی قربانی طلب کرتے وقت شاعرِ بلانوش کو ذرا خیال نہ آیا کہ وہ اپنی ایک ''بوتل'' کی قیمت میں چار پرچم خرید سکتا تھا۔ جہاں تک بہانے باز تارک الصلواۃ شاعر کا تعلق ہے ممتاز مزاح گو خالد عرفان نے اُسے خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ ان کی دل چسپ تہدیدی غزل کے چند اشعار آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔

گھر سے مسجد ہے اگر دور تو پھر یوں کر لو
کسی رکشہ، کسی ٹم ٹم کی سواری لے لو
تم ارادہ تو کرو، راستے گھٹ سکتے ہیں
فاصلے بیچ میں جتنے ہیں سمٹ سکتے ہیں
یہ بھی گر کر نہ سکو، گھر کے کسی گوشے میں
سجدہ ء شکر بجا لاؤ، تلاوت کر لو
یہ جو بچوں کو ہنسانے کی تمنا ہے تمہیں
اس فسانے کو بھی اک رو ز حقیقت کر لو

ہندوستان کے ایک شاعر ڈاکٹر فطرت انصاری (مرحوم) نے بھی ''گھر سے مسجد...'' والے شاعر کی خوب سرزنش کی تھی لیکن اُن کا انداز مذمتی تھا۔ چند مصرعے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

گھر سے مسجد کو بہت دور بتانے والے
تیری کوتاہ خیالی پہ ہنسی آتی ہے
تیرے اخلاق کی بنیاد ہے کم فہمی پر
تو نے سمجھا ہی نہیں عشق کی دنیا کیا ہے
کسی روتے ہوئے بچے کا سہارا لے کر
فرض کی راہ میں دیوار بنا لی تو نے

ایک نامور شاعر کا مندرجہ ذیل شعر تقریباً ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

ترکِ تعلقات پہ رویا نہ تُو نہ میں
لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تُو نہ میں

کسی سے تعلق ٹوٹنے پر شاعر اپنے بارے میں تو کہہ سکتا ہے کہ میں چین سے نہیں سویا، دوسرے کے بارے میں اسے کیسے پتا چلا کہ وہ بھی چین سے نہ سو سکا؟ اگر یہ بات اسے ''باوثوق ذرائع'' سے معلوم ہوئی تھی تو شعر میں اس کی صراحت ضروری تھی لیکن شاید قافیہ تنگ ہو رہا تھا۔

بعض اشعار اپنی نوعیت میں اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ عام قاری تک ان کے معانی کا ابلاغ نہیں ہو پاتا۔ ایسے اشعار پر ''المفہوم فی البطن الشاعر'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ دو مثالیں حاضر ہیں۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ نا حق خون پروانے کا ہوگا

شاعر مگس (شہد کی مکھی) کا داخلہ باغ میں اس لیے بند کر رہا ہے کہ وہ جائے گی تو پھولوں کا رَس چوسے گی، اس کے ذریعے موم کا چھتہ بنائے گی، چھتے کو شہد سے بھرے گی، شہد نکل جانے کے بعد خالی چھتے کے موم سے شمع بنے گی وہ جلے گی تو اس کے گرد طواف کر کے پروانے ناحق فوت ہو جائیں گے۔ لہٰذا باغ میں شہد کی مکھی کا داخلہ ممنوع قرار دے کر ایک معصوم جان کو بچایا جا سکتا ہے۔

اب یہ شعر دیکھیے۔

دعویٰ کروں گا حشر میں موسیٰ پہ خون کا
کیوں اُس نے آب دی مرے قاتل کی تیغ کو

شاعر صاحب اس لیے حضرت موسیٰؑ پر روزِ محشر خون کا دعویٰ کرنے کا اعلان فرما رہے ہیں کہ نہ وہ کوہ طور پر جاتے، نہ اللہ تعالےٰ کا جلوہ دیکھنے کا اصرار کرتے، نہ اللہ ہزار پردوں کے پیچھے سے اپنے جلوے کی ایک جھلک دکھاتا، نہ اس کی تپش اور جلال سے کوہ طور جل کر سرمے کا پہاڑ بنتا، نہ ان کا محبوب اپنی آنکھوں میں اُس سرمے کی کٹار سجاتا اور نہ اُس کٹار کی ضربِ شدید سے جناب شاعر شہادت کے مرتبے پر فائز ہوتے۔ ہماری رائے میں ایسے اشعار کے ساتھ ''پرچہ ترکیب استعمال'' بھی منسلک ہونا چاہیے۔ شعر کے ضمن میں یہ اصول پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ ع مزا کہنے کا جب ہے، ایک کہے اور دوسرا سمجھے۔

ایک صدی کا قصہ

سچن دیو برمن

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

ہندی فلموں کے سنگیت کا بادشاہ ایس ڈی برمن جس کا اصلی نام سچن دیو برمن تھا اور جسے فلم انڈسٹری برمن دا کے نام سے جانتی تھی، 1 اکتوبر 1906 کو تریپورہ کے راجہ ایشان چندرا دیو برمن کے گھر پیدا ہوا۔ سچن دیو کا جنم مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے ضلع کومیلا میں ہوا جو برٹش راج کے زیر تسلط تھا۔ اُنکے والد کا نام نباد وپنچند را دیو برمن تھا۔ اُنکی والدہ کا نام راجکماری نرملا دیوی تھا جو کہ تریپورہ کے شاہی گھرانے سے تھی۔ سچن دیو برمن کے آٹھ بھائی بہن تھے۔ سچن دیو کا نمبر پانچواں تھا۔ سچن دیو نے اپنی پڑھائی کومیلا میں ہی پوری کی۔ اُسنے اپنی گریجویشن کومیلا وکٹوریہ کالج سے پوری کی۔ بی اے کرنے کے بعد اُسنے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔

سنگیت اُسے ورثے میں ملا تھا۔ اُسکا باپ شوقیہ بڑی اچھی ستار بجاتا تھا۔ ساتھ ہی وہ ''دروپڑھ'' گائیکی میں ماہر تھا۔ اسلئے باپ کی دیکھا دیکھی سنگیت کی طرف اُسکا رجحان بچپن سے ہی رہا۔ ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اُسنے سنگیت کی باقاعدہ ٹریننگ لی۔ 1925 سے لے کے 1930 تک اُسنے اپنے زمانے کے مشہور سنگیت کار کے سی ڈے سے میوزک کی تربیت حاصل کی۔ 1932 میں اُسنے بشمدیو چٹوپادھیائے کی شاگردی کی جو کہ سچن دیو سے صرف تین سال بڑا تھا۔ علاوہ ازیں اُسنے سارنگی نواز کھیفا بادل خان اور اُستاد اللہ دین خان سے بھی تربیت لی۔ ان سب لوگوں کو وہ اپنے شاہی گھرانے اگرتلا میں ہی بلایا کرتا تھا۔ قاضی نذر الاسلام بھی اکثر شاہی محل میں آجایا کرتے تھے اور کئی کئی ہفتے شاہی مہمان نوازی کا لطف لیتے تھے۔

1932 میں اُسنے کلکتہ ریڈیو اسٹیشن سے بطور گلوکار اپنے سنگیت کا سفر شروع کیا۔ اُسکے گانے بنگال اور تریپورہ کے لوک سنگیت پر مبنی ہوتے تھے۔ رابندر اسنگیت اور نذرل گیتی کا اُس پر زبردست اثر تھا۔ اُسکے گانے بنگال میں کافی مقبول ہونے لگے۔ اُسکی مقبولیت دیکھ کر ہندوستان ریکارڈس کمپنی نے اُسکا ایک البم ریلیز کیا جس میں ایک طرف اُسکے سیمی کلاسیکل اور دوسری طرف لوک سنگیت پر مشتمل گانے تھے جسے بنگال کے سنگیت پریمیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اگلے چند سالوں میں اُسنے 131 بنگالی گانے ریکارڈ کئے۔ یہ سارے گانے بیحد مقبول ہوئے۔ ایک دہائی کے اندر اُسنے گلوکاری میں وہ مقام حاصل کیا کہ وہ بنگال کا نمبر ایک گلوکار مانا جانے لگا۔ اُسنے اُس زمانے کے مشہور سنگیت کار ہیمانگسو دتہ، آر۔ سی۔ بورل، نذر الاسلام اور سلیش داس گپتا کے گانے گائے۔ تریپورہ کا یہ راجکمار اپنی ریاست سے دور بنگالیوں کے دلوں پر راج کرنے لگا تھا۔

1934 میں آلہ باد یونیورسٹی کی طرف سے منعقد کی گئی محفل سنگیت میں اُسنے ٹھمری گا کر سامعین کو مسحور کر کے رکھ دیا۔ ان سنگیت شائقین میں جواہر لال نہرو کی بہن وجے لکشمی پنڈت اور سنگیت کے مہارتھی کرانہ گھرانے کے عبدل کریم خان بھی مہمان خصوصی کے طور مدعو کئے گئے تھے۔ اسی سال کلکتہ میں بنگال میوزک کانفرنس کا انعقاد ہوا جسکا رسم افتتاح رابندر ناتھ ٹیگور نے کیا۔ یہاں پر بھی اُسنے ٹھمری گائی اور سامعین کو مدہوش کیا۔ اُسے سونے کے میڈل سے نوازا گیا۔

1937 میں اُسنے کلکتہ کے بیلی گنج میں اپنا مکان تعمیر کیا۔ ایک دن اُسکی ملاقات رابندر ناتھ ٹیگور کے شانتی نیکیتن میں پڑھائی کر رہی ایک سٹوڈنٹ میرا داس گپتا سے ہوئی جو کہ جسٹس رائے بہادر کمل ناتھ گپتا کی پوتی تھی۔ وہ اُس سے سنگیت سیکھنا چاہتی تھی۔ برمن دا نے اُسے اپنی شاگردی میں لیا۔ دھیرے دھیرے وہ ایک دوسرے کے بیحد قریب آنے لگے۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ ایک دن اُنہوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ خبر جب سچن دیو کے پریوار تک پہونچی تو شاہی محل میں جیسے بھونچال آ گیا۔ پریوار کا ہر فرد اُسکے خلاف کمر بستہ ہو گیا۔ شاہی پریوار کی پرم پرا تھی کہ اُنکی شادی شاہی گھرانوں میں ہو۔ سچن دیو نے اس روایت کو چیلنج کیا تھا۔ اُسے اپنا فیصلہ بدلنے کے لئے کافی دباؤ ڈالا گیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ تو بس ٹھان کے بیٹھا تھا کہ وہ شادی کرے گا تو صرف اپنی میرا سے۔ جب اُسنے اپنی ہٹ نہ چھوڑی تو پریوار نے اُسکے ساتھ سارے رشتے ناتے توڑ ڈالے اور اُسے جائیداد سے بے دخل کر دیا گیا۔ اپنے پیار کے عوض وہ سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھا۔ 10 فروری 1938 کو پریوار کی مخالفت کے باوجود سچن دیو برمن نے کلکتہ میں میرا سے شادی کر ڈالی۔۔ وہ اپنے پریوار سے الگ اپنی بیوی کے ساتھ کلکتہ میں رہنے لگا۔

1937 میں اُسنے بطور میوزک ڈائرکٹر جس فلم میں پہلی بار سنگیت دیا وہ ایک بنگالی فلم تھی جس کا نام ''راجگی'' تھا۔ 1940 میں اُسکی دوسری بنگالی فلم ''راجکمار رنر بھاشن'' ریلیز ہوئی جو ہٹ ہوئی۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد اُسنے پلٹ کے نہیں دیکھا۔ وہ ایک کے بعد ایک فلم کا سنگیت دیتا چلا گیا۔ 1941 میں اُسنے ''جیون سنگنی'' اور ''پریتشودھ'' کا سنگیت دیا۔ یہ دونوں فلمیں بیحد کامیاب رہیں۔ 1944 تک اُسنے سترہ بنگالی فلموں کا سنگیت ترتیب دیا۔ یہ ساری فلمیں کامیاب رہیں۔ بنگال میں ایک دہائی تک اُسکی طوطی بولتی رہی۔ بمبئی کے کئی فلم پروڈیوسرس نے ایس ڈی برمن کو بمبئی آنے کی دعوت

دی مگر وہ کلکتہ چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔ بالآخر 1944 میں اُسے فلمستان کے روح رواں اور اشوک کمار کے بہنوئی ششادھر مکھر جی نے بمبئی بلالیا۔ ششا دھر مکھر جی خود بنگالی نژاد تھے اور بنگالی سنگیت کے بیحد دلدادہ تھے۔ وہ اُنکو انکار نہ کر سکے اور اُنکے بلاوے پر سچن دیو نے کلکتہ چھوڑ کے بمبئی کا رخ کیا۔ یہاں پر اُسے دو فلمیں پیش کی گئیں۔ ان دونوں فلموں کے ہیرو اشوک کمار تھے۔ پہلی فلم تھی ''شکاری'' اور دوسری فلم تھی ''آٹھ دن''۔ یہ دونوں فلمیں ہٹ ثابت ہوئیں مگر برمن دا کو ان فلموں کی کامیابی سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اُنہیں اسی کمپنی کی طرف سے ایک اور فلم آفر کی گئی جس کا نام ''دو بھائی'' تھا۔ 1947 میں ریلیز ہوئی اس فلم کے ایک گیت سے اسقدر کامیابی ملی کہ وہ راتوں رات شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ یہ گانا تھا فلم ''دو بھائی'' کا گیتا رائے کا گایا ہوا ''میرا سندر سپنا بیت گیا''۔ اس فلم میں اُسنے بنگالی میں بھجن گانے والی ایک نوآموز گلو کارہ گیتا رائے کو پیش کیا جس کی مدبھری آواز نے سنگیت پریمیوں کو دیوانہ بنا ڈالا۔ اس فلم کے بعد 1949 میں فلمستان کی فلم ''شبنم'' کی سنگیت کو بیحد سراہا گیا۔ اس فلم کا شمشاد بیگم کا گایا ہوا گیت ''یہ دنیا روپ کی چور''

ہر زبان پر چڑھ گیا تھا۔ یہ فلم باکس آفس پر بیحد کامیاب رہی مگر سچن دیو برمن کے حصے میں صرف مایوسی ہی آئی۔ کسی بھی پرڈیوسر نے اُسے سائن نہیں کیا۔

اتنی کامیابی پانے کے بعد سچن دیو برمن کو ایک سال تک کوئی کام نہ ملا۔ یہ وہ دور تھا جب ماسٹر غلام حیدر، انل بسواس، سی رامچندر، کھیم چندر پرکاش، جیسے جید سنگیت کار فلمی دنیا پر راج کر رہے۔ نوشاد علی بھی اپنے پاوں جما چکا تھا۔ اُسکے بعد فلم انڈسٹری کی گروپ بندی۔ اصل میں بمبئی کی فلم نگری کئی گروپوں میں بٹی ہوئی تھی۔ راج کپور کے گروپ میں شنکر جے کشن تھا۔ گورو دت کے گروپ میں او پی نیر تھا۔ اسی طرح سی رامچندر کا اپنا گروپ تھا۔ دلیپ کمار کے خیمے میں نوشاد تھا۔ ایس ڈی برمن کا اپنا کوئی گروپ نہ تھا۔ فلمستان والے سی رامچندر کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ سچن دیو بمبئی کے ماحول سے اسقدر دل برداشتہ ہوا کہ اُسنے اشوک کمار کی فلم ''مشعل'' اُدھوری چھوڑ کر بمبئی چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اشوک کمار اُسکے اس فیصلے سے کافی برہم ہوئے۔ وہ ٹکٹ لے کر کلکتہ جانے والی ٹرین میں سوار ہونے کے لئے تیار تھے کہ فلمستان والے اُسے ٹرین سے اُٹھا کر اشوک کمار کے پاس لے آئے۔ اشوک کمار نے اُس سے تہدیدی انداز میں کہا کہ وہ جب تک اُنکی فلم ''مشعل'' پوری نہیں کرتے وہ بمبئی چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اُنہیں یہ فلم ہر حال میں پوری کرنی ہوگی۔ اسکے بعد وہ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ برمن دا نے ''مشعل'' کا سنگیت پورا کیا۔ فلم جب ریلیز ہوئی تو باکس آفس پر بیحد کامیاب رہی۔ اس فلم میں برمن دا نے ایک نئے گلوکار کو پیش کیا جس کا نام مناڈے تھا۔ اس فلم کا گایا ہوا گانا ''اوپر گگن وشال'' اُس زمانے کا بیحد مقبول گانا تھا۔ اُسکے بعد اُسنے ایک اور فلم کی جس کا نام ''ودیا'' تھا۔ اتنی ساری ہٹ فلمیں دینے کے باوجود اُسے کوئی کام نہیں دے رہا تھا۔

قسمت کی دیوی بہت جلد اُس پر مہربان ہوگئی۔ دیو آنند نے اپنی فلم کمپنی کھولی تھی جس کا نام ''نوکیتن فلمز'' رکھا گیا تھا۔ وہ اس بینر کے تلے اپنی پہلی فلم ''افسر'' بنا رہے تھے جس میں دیو آنند کے علاوہ اُس وقت کی گولڈن گرل ثریا کام کر رہی تھی۔ دیو آنند نے سونے کا دل پایا تھا۔ ایس ڈی برمن کی حالت اُس سے چھپی نہیں تھی۔ فلمستان میں اُسکا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا کیونکہ وہ بھی فلمستان کی ہی کھوج تھا اور وہ دادا منی اشوک کمار کو اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا۔ وہ اکثر سچن دیو برمن سے مل لیا کرتا تھا۔ دونوں میں بہت جلد دوستی ہوگئی۔ جب دیو آنند نے اپنی فلم کمپنی کھولی تو وہ برمن دا کو نہیں بھولا۔ اُسنے ایس ڈی برمن کو اپنے گروپ میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُسنے فلم ''افسر'' کے سنگیت کا ذمہ ایس۔ ڈی برمن کو سونپا۔ اس فلم کا سنگیت خوب چلا۔ یہاں سے ایس ڈی برمن کا سنہرا دور شروع ہوا۔ 1951 اُنکی دوسری فلم ''بازی'' کا سنگیت بھی سچن دیو برمن نے ہی دیا۔ یہ فلم بھی بیحد کامیاب رہی۔ ایس ڈی برمن کا سنگیت سر چڑھ کے بولنے لگا۔ اسی فلم میں اُس نے اپنی کھوج گیتا دت کو ایک نئے روپ میں پیش کیا۔ jazz اسٹائل پر بنے ''بازی'' کے گانے زبان زد عام ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ساحر صاحب نے برمن دا کو ایک غزل لکھ کر دی۔ جب گانے کی ریکارڈنگ ہوئی تو ساحر صاحب ریکارڈنگ سن کر کافی برہم ہوئے۔ اُنہوں نے برمن دا سے کہا کہ اُنہوں نے اُنکی اچھی خاصی غزل کا کباڑا کر کے رکھ دیا۔ جب اس گیت کی فلمبندی کی گئی تو ساحر صاحب کو ٹرائل پر بلایا گیا۔ گانا دیکھ کر ساحر صاحب دنگ رہ گئے۔ برمن دا نے اس غزل کو پچویشن کے حساب سے جس طرح کمپوز کیا تھا وہ ایک ماہر سنگیت کار ہی کر سکتا تھا۔ ساحر صاحب برمن دادا کی خداداد صلاحیتوں کے قائل ہو کر رہ گئے۔ یہ گانا تھا ''تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنادے'' یہ گانا گیتا بالی پر پکچرائز کیا گیا تھا جو کہ اس فلم میں ایک چلبلی لڑکی کا کردار ادا کر رہی تھی۔

ایس ڈی برمن اور دیو آنند کا مرتے دم تک ساتھ رہا۔ دیو آنند کی ہوم پروڈکشن کی ساری فلمیں ایس ڈی برمن کے سنگیت سے آراستہ ہوئیں۔ جن میں ''ٹیکسی ڈرائیور'' ''نو دو گیارہ'' ''کالا بازار'' ''کالا پانی'' اور 1956 کی ''فنٹوش'' قابل زکر ہیں۔ ''فنٹوش'' کا کشور کمار کا گایا ہوا گانا ''دکھی من میرے سن میرا کہنا، جہاں نہیں چینا وہاں نہیں رہنا'' کشور کمار کے یادگار گانوں میں سے ایک ہے۔ قابل زکر بات یہ ہے کہ یہ برمن دا ہی تھے جنہوں نے پہلے دھن اور پھر گانے کا فارمولہ ایجاد کیا جو آج تک رائج ہے۔ کچھ گیت کار اس طریق کار سے پریشان تھے البتہ وقت کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے بھی اس روش کو اپنا لیا۔

دیو آنند ایس ڈی برمن کے سنگیت کے اس قدر دیوانے تھے کہ وہ باہر کی فلموں

میں بھی برمن دا کے نام کی سفارش کرتے تھے۔ ''پینگ گیسٹ'' ''منیم جی'' یا ''سولہواں سال'' ہواس کا سنگیت اتنا مدھر اور دل کو لبھانے والا ہے کہ ان کے گانے سن کر سننے والا کسی اور دنیا میں کھو جاتا ہے۔

دیو آنند کے بعد ایس ڈی برمن کی زندگی میں ایک اور درخشاں ستارہ وارد ہوا۔ یہ تھا گورودت۔ گورودت فلم ''پیاسا'' بنانے والا تھا۔ گورودت برمن دا کا مداح تھا۔ اُس نے سوچا کہ اگر ساحر لدھیانوی کے گیتوں کیساتھ کوئی انصاف کر پائے گا تو وہ ایس ڈی برمن ہے۔ برمن دا اردو شاعری سے نابلد تھے۔ وہ مجروح کو مضروع کر کے بلاتے تھے اسکے باوجود اُسنے فلم ''پیاسا'' کے گانوں کو جو لے دی اُسنے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ساحر کی غزلوں سے اس حد تک عاجز آ گئے کہ اُس نے گورودت کو کئی شعر بدلنے کی صلاح دی۔ گورودت نے جو جواب دیا وہ سن کر برمن دا بھونچکے رہ گئے۔ گورودت نے برمن دا سے کہا کہ میں فلم کا سنگیت کار بدل سکتا ہوں مگر میں ساحر کا ایک بھی شعر نہیں بدل سکتا۔ برمن دا کے لئے یہ ایک چیلینج تھا۔ اُنہوں نے ساحر لدھیانوی کی نظموں اور غزلوں کو جس طرح سنگیت سے سنوارا اُسنے ان گیتوں کو جاوداں کر دیا۔ افسوس کہ یہ فلم ساحر اور برمن دا کی آخری فلم ثابت ہوئی۔ ہوا یوں کہ ''پیاسا'' کے گانوں کی مقبولیت کو دیکھ کر ساحر نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ''پیاسا'' کے گانوں کی مقبولیت کی وجہ اُسکی شاعری ہے نہ کہ موسیقی۔ برمن دا کو ساحر کی یہ بات چبھ گئی۔ اُسنے ساحر کو چیلینج کیا کہ وہ اپنا ایک گانا سنگیت کے بناہٹ کر کے دکھائیں۔ اس کے بعد اُنہوں نے ایک ساتھ پھر کبھی کام نہیں کیا۔ یہ بات قابل زکر ہے کہ ساحر کو پہلا بریک دینے والا برمن دا ہی تھا۔ اُنہوں نے ساحر لدھیانوی کو 1951 میں ریلیز ہوئی فلم ''نوجواں'' میں پہلا بریک دیا تھا۔ اس فلم کا مشہور گانا ''ٹھنڈی ہوائیں'' ساحر کے ہی زور قلم کا نتیجہ تھا۔

''پیاسا'' کے بعد برمن دا نے گورودت کے ساتھ فلم ''کاغذ کے پھول'' کی۔ برمن دا نے جب گورودت سے اس فلم کی کہانی سنی تو دادا نے گورو دت کو صلاح دی کہ وہ ابھی یہ فلم نہ بنائیں مگر گورودت نے کسی کی ایک نہ سنی۔ وہ تو ٹھان کے بیٹھا تھا کہ وہ یہ فلم کسی بھی قیمت پر بنائیں گے۔ یہ فلم باکس آفس پر اوندھے منہ گری مگر اس کا سنگیت بیحد مقبول رہا۔ خاص طور سے گیتا دت کا گایا ''وقت نے کیا کیا حسیں ستم، ہم رہے نہ ہم، تم رہے نہ تم'' اور رفیع صاحب کا گانا ''دیکھی زمانے کی یاری بچھڑے سبھی باری باری''۔ یہ گانے کیفی اعظمی نے لکھے تھے جو کہ برمن دا کے سنگیت کا مداح تھا۔ برمن دا میلوڈی کا بادشاہ تھا۔ اُن کا ہر گانا دل کو چھوتا تھا۔ اسکا اعتراف سبھی شاعر اور موسیقار کیا کرتے تھے۔

بمل رائے بھی ایس ڈی برمن کے سنگیت کا دیوانہ تھا۔ اُنہوں نے برمن دا کو اپنی پہلی ہندی فلم ''دیوداس'' کی موسیقی دینے کے لئے سائن کیا۔ ''دیوداس'' کے گانے بنگال کی مٹی کی خوشبو لئے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے بنگال کے لوک سنگیت کو جس خوبی سے پیش کیا، بہت کم موسیقار ایسا کرنے میں کامیاب رہے۔ ''دیوداس'' کا ایک ایک گانا نگینے کی طرح جڑا ہوا تھا۔ اُسکے بعد برمن دا نے، بمل رائے کے ساتھ ''سجاتا'' اور ''بندنی'' کی۔ اُنہوں نے دونوں فلموں میں ایسا سنگیت دیا کہ اس سنگیت کی وجہ سے فلم میں چار چاند لگ گئے۔

ساحر کی ہی طرح لتا منگیشکر سے بھی اُن کا من مٹاؤ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ دور تھا جب کہ منگیشکر بہنوں کا ایس دبدبہ تھا کہ کوئی اُنکے خلاف منہ کھولنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اُنکا حرف اول حرف آخر ہوتا تھا۔ کیا مجال کہ کوئی حکم عدولی کرے۔ بیشتر موسیقار اُنکی تک میں تک ملایا کرتے تھے جب کہ سچن دیو برمن جی حضوری کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اُسکی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا تھا۔ کئی سالوں تک اُسنے لتا سے گانے نہیں گوائے۔ اُسنے اُسکی چھوٹی بہن آشا بھونسلے کو ترجیح دی۔ بعد میں آشا اُسکی بہو بن گئی۔ اُنکے اکلوتے بیٹے راہول دیو برمن نے اپنے سے زیادہ عمر کی عورت سے شادی کی جو پہلے سے شادی شدہ تھی۔

برمن دا نے کشور کمار سے ایسے گانے گوائے جو کہ لافانی بن کر رہ گئے ہیں۔ کشور کمار پیشہ ور گویا نہیں تھا۔ یہ سچن دیو برمن ہے جس نے اُسے تراش کر پیش کیا کشور کمار کی ہوم پروڈکشن ''چلتی کا نام گاڑی'' کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔ اس کا ایک ایک گانا اتنا عمدہ اور لاجواب تھا کہ فلمی شائقین یہ گانے سننے کے لئے بار بار تھیٹر میں گھس جایا کرتے تھے۔

برمن دا نے ہر گلوکار کو ایکٹر اور گانے کے حساب سے پیش کیا۔ دیو آنند کے لئے وہ کشور کمار کی آواز کا استعمال کرتے تھے۔ کالا پانی اور کالا بازار میں اُنہوں نے محمد رفیع کی آواز کا استعمال کیا۔ اسی طرح سجاتا میں اُنہوں نے سنیل دت کے لئے طلعت محمود کی آواز کا سہارا لیا جب کہ بمل رائے کی یہ ضد تھی کہ سنیل دت کے لئے محمد رفیع کی آواز استعمال کی جائے۔ برمن دا نے گانا ریکارڑ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ صحیح تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب برمن دا گانے کی دھن بناتے تھے تو سب سے پہلے وہ اپنے رسوئیا کو وہ گانے کی دھن سناتے تھے۔ جب وہ دھن پسند کرتا تھا تب وہ جا کر پرڈیوسر کو دھن سنایا کرتے تھے۔ وہ پان کھانے کے بڑے شوقین تھے۔ وہ جان دے سکتے تھے مگر پان نہیں دیتے تھے۔ پان اُن کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھے۔ برمن دا نے بنگالی لوک سنگیت کو آرکسٹرا کے ساتھ پرو کر جاوداں کر دیا۔ برمن دا کا کوئی بھی گانا ایسا نہیں جو دل کو نہ چھوتا ہو۔ جتنے ہٹ گانے برمن دا نے دئے اُتنے گانے کسی اور موسیقار نے نہیں دئے۔

برمن دا نے تقریباً سو ہندی فلموں کو اپنے سنگیت سے آراستہ کیا۔ اُنکی پہلی فلم 1945 میں بنی ''شکاری'' تھی اور اُنکی آخری فلم 1977 میں ریلیز ہوئی فلم ''تیاگ'' تھی برمن دا کی یادگار فلمیں یوں ہیں۔ 1947 کی ''دو بھائی'' 1949 کی ''شبنم'' جسکے ستارے دلیپ کمار اور کامنی کوشل تھے۔ 1950

کی ''افسر'' جس کے مکھیہ اداکارثریا اور دیو آنند تھے۔ 1951 کی ''بہار''''بزدل''''ایک نظر''''نوجوان''اور''سزا''۔یہ چاروں فلمیں اپنے مدھ بھرے سنگیت کی وجہ سے آج بھی پسند کی جاتی ہیں۔1952 کی''جال'' کی 1953 کی''بازی''1954 کی''ٹیکسی ڈرائیور''1955 کی''منیم جی''''دیو داس''اور''گھر نمبر44''1956 کی''فنٹوش''1957 کی''پینگ گیسٹ''''نو دوگیارہ''اور''پیاسا''1958 کی''چلتی کا نام گاڑی''''کالا پانی''''لاجونتی''اور''سولہواں سال''1959 کی''کاغذ کے پھول''اور''سجاتا''1960 کی''بمبئی کا بابو''''منزل'' اور'' کالا بازار''1962 کی''بات ایک رات کی''1963 کی ''بندنی''اور''تیرے گھر کے سامنے''1964 کی''ضدی'' 1965 کی ''گائیڈ''1967 کی''جیول تھیف''1969 کی''آرادھنا''1973 کی ''ابھیمان''1974 کی''سگینہ''اور''پریم نگر''1975 کی''ملی''اور''چپکے چپکے''

31 اکتوبر 1975 کو برمن دا نے اس دارِفانی کا الوداع کہا۔

وہ گلے کے موذی کینسر میں مبتلا تھے اور بہت دنوں تک صاحب فراش رہے۔دیو آنند نے مرتے دم تک برمن دا کا ساتھ نہیں چھوڑا۔وہ جب اسپتال میں زیر علاج تھے تو دیو آنند اُن کی مزاج پرسی کرنے ہاسپٹل گئے۔برمن دا نے دیو کا ہاتھ تھام کر کہا کہ وہ کسی اور میوزک ڈائرکٹر کو لے کر باقی کے گانے ریکارڑ کرلے۔اُن دنوں دیو آنند فلم''گائیڈ'' بنا رہے تھے۔دیو آنند نے اُنکے ہاتھوں کا بوسہ لیتے ہوئے کہا کہ وہ کسی اور سنگیت کار کے ساتھ کام نہیں کر پائیں گے۔وہ اُنکا آخری لمحے تک انتظار کرتے رہیں گے اور اگر خدانخواستہ وہ کام پورا نہ کر پائے تو وہ بنا گیتوں کے فلم ریلیز کر دیں گے۔برمن دا جونہی اسپتال سے نکل آئے تو سب سے پہلے اُنہوں نے ''گائیڈ'' کے گانے ریکارڑ کئے۔اُسکے بعد وہ پھر سے اسپتال میں داخل ہوگئے۔اُن کے چلے جانے کے بعد دیو آنند نے اُنکے بیٹے راہول دیو برمن کے ساتھ کام کیا۔

برمن دا جب طرز بناتے تھے تو وہ گانے کی روح میں اُتر جاتے تھے۔ساحر صاحب کا لکھا پہلا گانا''ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں''سن کے ایسا لگتا ہے جیسے ہوا کی ٹھنڈی لہریں واقعی لہراتے ہوئے آرہی ہیں۔اسی طرح ''دیو داس'' کی غزل جسے اُنہوں نے مجرے میں تبدیل کیا۔''جسے تو قبول کرلے وہ ادا کہاں سے لاؤں''دیکھئے کس سادگی سے اُنہوں نے یہ گانا پیش کیا۔اسی طرح''سولہواں سال'' کا ہیمنت کمار کا گایا ہوا گانا''ہے اپنا دل تو آوارہ۔نہ جانے کس پہ آئے گا۔''مزے کی بات یہ ہے کہ اس گانے میں ماؤتھ آرگن بجانے والے اُنکے صاحبزادے تھے جو نیکر پہن کر اسٹوڈیو آیا کرتا تھا۔برمن دا کے گانے سیدھے دل میں اُتر جاتے تھے اور سننے والے کو کیف و سرور کی الگ ہی دنیا میں لے جاتے تھے۔برمن دا بھلے ہی ہمارے ساتھ نہ ہوں مگر اُنکا سنگیت رہتی دنیا تک اسی طرح گونجتا رہے گا۔

نشانِ قبر

پھر سنگِ میل راہ کا ہر خار ہوگیا
جب بھی غبار غازۂ رخسار ہوگیا

میں جب کبھی بھی آئینہ بردار ہوگیا
زلفیں سنورانے کو وہ تیار ہو گیا

اس تیز روزمانے میں حیرت زدہ ہوں میں
کیا دیکھ کر وہ نقش بہ دیوار ہو گیا

ہر ہر قدم پہ الجھنیں، رسوائیاں، گھٹن
راہِ وفا پہ چلنا بھی دُشوار ہوگیا

جب سے میں اپنے غم کو نگہباں نہیں رہا
ہر شخص جیسے میرا ہی غم خوار ہوگیا

دیوار درمیان کی گرنے کو تھی مگر
ہمسایہ پھر سے راہ کی دیوار ہوگیا

نام ونشاں زمانے سے مٹنے کے ساتھ ساتھ
اخترؔ نشانِ قبر بھی ہموار ہوگیا

○

اختر شاہجہاں پوری کے شعری مجموعہ''برگِ نَو'' سے منتخبہ

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

پیارے بھائی گلزار جاوید! آداب۔

چہارسو کا تازہ شمارہ موصول ہو کر فردوسِ نظر ہوا۔ چشمِ مَن روشن، دلِ مَن شاد لیکن اِدھر عالم یہ ہے کہ

کبھی میں اس کو کبھی اپنے قد کو دیکھتا ہوں

گلزار بھائی! یہ سب آپ کی بے پناہ اور بے لوث محبت ہی کا کرشمہ ہے جو آپ نے خاکسار کو اس قابل سمجھا اپنی ہی ایک غزل کا شعر ذہن میں آ رہا ہے:

مجھ خاک نشیں پر ہے تری چشمِ عنایت
یہ حُسن تو جہّ ہے ترا حُسن کرم ہے

آپ کی مسلسل عنایات کے لیے شکریہ ادا کروں تو یقیناً آپ کو ناگوار گزرے گا۔ ویسے بھی میں اس کا ذکر کر کے ان کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہتا۔ آپ کی ذات سے مجھے جو عقیدت ہے اُسے آپ بخوبی جانتے ہیں۔ بہت سے احباب کی ''میلز'' اور ٹیلیفون کالز آ رہی ہیں حالانکہ اس مبارک باد کے اصلی حقدار تو آپ ہیں۔ وِکرم جی، بہل تشنہ صاحب، ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کے علاوہ پاکستان سے رومانہ رومی اور محمود شام صاحب کا ٹیلی فون بھی آیا تھا۔

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا؟

بہرحال چہارسو کے ذریعہ سے میں اُن تمام احباب اور کرم فرماؤں کے تئیں دلی طور پر اظہار تشکر کرنا اپنا مقدس فریضہ سمجھتا ہوں جنہوں نے از راہِ مروّت اس شمارے کے لیے اپنے گراں قدر ارشادات سے مجھے نوازا ہے۔ عزیزی فاری شا اور عزیزہ عطیہ سکندر علی کے تئیں میں خصوصی طور پر سپاس گذار ہوں۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ)

چھوٹے بھائی گلزار جاوید، سلامِ خلوص۔

آپ کا اور ہم سب کا جریدہ 'چہارسو' شمارہ جولائی کاغذی پیرہن میں آ پہنچا۔۔۔ جناب فخرِ زماں کی جو تصویر شعیب حیدر زیدی نے ٹائٹل پر جمائی ہے وہ بول نہیں رہی، بلکہ باتاں کر رہی ہے۔ ''جیوے ساڈے پنج دریاتے جیوے فخرِ زماں''۔ ''صبح کے قریب'' میں ناصر بغدادی (کراچی) نے گہری ہری پتیوں کے درمیان ہوئے بے حد سرخ پھولوں سے اپنا دامن جھلساتے ہوئے گزرنے والے لمحوں۔۔۔ سبز روشنیوں کو نگل جانے والی، سرخ روشنیوں میں گھری ہوئی، گڑیا سی، دکھیا سی لڑکی کی محبت، اس محبت کو خدشات میں مبتلا کرنے والا ماضی۔۔۔ اور اس ماضی کو دردناک ہی نہیں ہولناک بناتی ہوئی اس کی اپنی ''ماں'' کی کہانی کو اشارت اور ایمائیت کی دھند میں لپیٹ کر نذرِ قارئین کیا ہے۔۔۔ ہے کوئی اور طریقہ اس دہشت زدگی کو کاغذ پر اتارنے کا۔

سرور انبالوی (راولپنڈی) آصف ثاقب (بوئی ہزارہ) نسیم سحر (راولپنڈی) رومانہ رومی (کراچی) کی غزلیں پڑھیں، اچھی لگیں۔ حسن منظر (کراچی) ''اک آزاد روح کو خراجِ تحسین'' کے تحت کمال کی نظم لے آئے ہیں۔ جو بہ یک وقت ذہن و دل کو اپنی گرفت میں لے رہی ہے۔ ''ڈاکٹر یوگندر بہل تشنہ'' ''احساسِ شکستگی'' کو تصوف کے آئینے میں منعکس کرنے میں خاصے کامیاب ہوئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ (گلزار جاوید) نے ایکانکی ڈرامے کی صنف کو زندہ رکھنے کا عزمِ صمیم کر رکھا ہے۔ ''بغل بچے'' ہر طرح سے ٹکنکی طور پر کامیاب اور انتہائی دلچسپ ہے۔ ۹ مناظر کے اس ڈرامے میں عصری زندگی کی طنزیہ عکاسی کو کہیں بھی بوجھل بنائے بغیر تیسرے منظر میں مرکزی کردار کے اکلوتے گرم سوٹ کو داخل کر کے پڑھنے والوں یا دیکھنے والوں کو پوری طرح ہمہ تن 'متوجہ' کر کے نویں منظر میں ان کو حیران کرنے اور قہقہہ لگانے اور تا دیر بلکہ گاہے گاہے مدتِ دراز تک مسکرانے کا موقع مہیا کیا ہے۔

ادب پڑھنے نہ پڑھنے کے مسئلے کے پیشِ نظر میں رس رابطے پر ایک نظر ضرور ڈال لیتا ہوں۔ بہت کم کرداروں کے افسانے ''شکریہ میرے مہربان'' (شمارہ مئی جون ۲۰۱۳ء) میں، میں نے بالائی جسم اور زیریں جسم کو دو علیحدہ کرداروں کے طور پر پیش کیا ہے۔ اگر اس کا ذکر مل جاتا تو میں طمانیت کے ساتویں آسمان تک پہنچتا۔ تاہم شکر گزار ہوں کہ حسن منظر (کراچی) امرناتھ دھمیجہ (لدھیانہ) انوار فیروز (راولپنڈی) نجیب عمر (کراچی) یوگندر بہل تشنہ (یو ایس اے) پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی) احسان بن مجید (اٹک) ڈاکٹر رینو بہل (چندی گڑھ) اور نوید سروش (میر پور خاص) نے میرے افسانے کو پڑھنے کے لئے اپنا قیمتی وقت عنایت فرمایا۔ سب کے لیے دلی دعائیں۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

برادر گلزار صاحب، تسلیمات۔

چہارسو کا تازہ شمارہ بنام مہندر پرتاب چاند نظر نواز ہوا۔ آپ کس طرح دریا کو کوزے میں بند کرتے ہیں اور کتنی مشقت سے صاحب قرطاس اعزاز کے لئے انتہائی معیاری مواد جمع کر کے نہ صرف ادب کے تشنہ قاریوں کی تشفی کرتے ہیں بلکہ اردو ادب کی ARCHIVES میں ایک گرانقدر اضافہ کرتے ہیں۔ مستقبل میں یہ تمام شمارے اردو کے محققین کے لئے ایک بیش قیمت حوالہ جاتی مواد فراہم کرینگے۔ چاند صاحب کے ادبی قد و قامت یا انکے فن

پر مجھ جیسا کم حیثیت اور ادب میں نوارد کسی رائے کے اظہار کی گستاخی یا بے ادبی نہیں کرسکتا۔اسی شمارے میں ان پر نہ صرف مقتدر اور صاحب حیثیت افراد کی آرا شامل ہیں بلکہ ان پر چند انتہائی دقیق مضامین بھی ہیں۔یوں تو یہ تمام مضامین اعلی اور معیاری ہیں مگر مجھے ڈاکٹر شباب للت کا ''عشق کی تقدیر'' اور ڈاکٹر خلیق انجم کا ''چاند کے آفاق نقد'' بہت پسند آئے۔

چاند صاحب سے کچھ واقفیت کا اعزاز مجھے بھی حاصل ہے۔سالوں پہلے انکا پاکستان کا سفرنامہ نظر سے گذرا تھا جب وہ تقسیم کے بعد پہلے پہل اپنی جنم بھومی کروڑلعل عیسن ،لیہ گئے تھے۔انہوں نے جس محبت اور جن جذبات میں ڈوب کر یہ سفرنامہ لکھا تھا اس سے میں بیحد متاثر ہوا تھا۔انکی تحریر سے ایک ایسی شخصیت کی تصویر ابھر کر آئی تھی جو سرتاپا صرف اور صرف محبت ہے ۔اس کے کچھ ہی عرصے بعد جب وہ امریکا تشریف لائے تو انہوں نے کمال محبت سے تقریباً ڈھائی ہزار میل دور سے اس ناچیز کو یاد کیا۔تب سے ہم گاہے گاہے رابطے میں رہتے ہیں جو انکے لئے نہیں میرے لئے باعث اعزاز ہے۔اللہ انکو اس سے بھی زیادہ عزت اور اعزازات سے نوازے اور ایک طویل اور صحت مند زندگی عطا کرے کہ ایسے لوگ انسانیت کا سنگھار ہیں۔

اس شمارے کی دوسری چیز جو دل کو چھو لیتی ہے وہ نیلوفر عباسی صاحبہ کا اپنے شوہر قمر علی عباسی کو خراج عقیدت ہے۔میں اسے لکھنے تو نوحہ جا رہا تھا مگر یہ نوحہ نہیں انکے تشکرانہ جذبات ہیں جو وہ ایک طویل اور خوشگوار ساتھ کے حوالے سے اپنے شوہر کی یاد میں قارئین سے شیئر کرنا چاہتی ہیں۔اتنی خوبصورت زبان، جذبات کا اتنا موثر اظہار اور شوہر سے محبت کی ایسی سچی تصویر، نیلوفر صاحبہ کو تو اردو کی باقاعدہ ادیبہ ہونا چاہئے تھا۔انکا رفیق زندگی بچھڑ گیا اسکا غم اس تحریر سے عیاں ہے مگر یہی دستور زمانہ ہے۔میری دعا ہے کہ اللہ انکو صبر عطا کرے۔

اس دفعہ حصہ شاعری گزشتہ شمارے سے بہتر ہے اور کئی غزلوں اور نظموں نے متاثر کیا جن میں محمود الحسن، خیال آفاقی، یوگیندر بہل اور نسیم سحر شامل ہیں۔چہارسو میں نذیر فتحپوری صاحب کی موجودگی بھی اچھی لگی وہ خود ایک مشہور مدیر، شاعر اور نثر نگار ہیں۔

افسانوں میں حسن منظر صاحب کا ''بادشاہ کا قد'' بہت خوب ہے۔ وہ منجھے ہوئے کہانی نویس ہیں اور انکو زبان اور بیان پر مکمل عبور حاصل ہے۔نند کشور وکرم کا ''وقت کا طوفان'' ایک عام سا افسانہ ہے۔انہوں نے بدلتی قدروں کا تذکرہ یوں تو خوب کیا ہے مگر اب یہ قدریں اور یہ سوچ کسی کے لئے بھی قابل قبول نہیں۔میری نظر میں پدرم سلطان بود کا زمانہ ختم ہوگیا۔کئی امریکی صدور ایسے ہی طبقے سے تعلق رکھتے تھے جنکا ذکر وکرم صاحب نے کیا ہے۔(موجودہ امریکی کانگریس کا اسپیکر بھی اپنی نوجوانی کے زمانے میں janitor یعنی صفائی کرنے والا تھا)اس لئے افسانہ کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکا۔مراق مرزا نے بھی اپنے افسانے ''پگھلتے لمحوں کی تصویر'' میں وہی پرانی بات چھیڑی ہے کہ حقیقت میں کوئی بھی کسی کا ساتھ نہیں دیتا اور بدلتے وقت کے ساتھ اولاد بھی اپنی نہیں رہتی۔انکے افسانے کا عنوان بہت اچھا تھا۔

اس شمارے میں اگر آپکے انشائیہ (کیا اسے انشائیہ کہا جاسکتا ہے؟) کا تذکرہ نہ کیا جائے تو نہ صرف آپکے ساتھ بلکہ تمام قارئین کے ساتھ بھی زیادتی ہوگی۔''تاجدار الم'' واہ کیا خوب عنوان ہے اور پھر واللہ آپ کی زبان کی تلخ وشیریں ادائیگی جس میں ہزاروں نشتروں کی کاٹ شامل ہے۔بس کیا کہا جاسکتا ہے، بدقسمتی سے یہ تو آج کے دور کی سیاسی اور عالمی حقیقت ہے جسے ہم سب مجبور اور پسماندہ اقوام کو برداشت کرنا ہی ہوگا۔اسکا علاج تو یہ تھا کہ ہم اسقدر ترقی کرتے کہ دنیا میں ہماری کوئی حیثیت ہوتی مگر حیف ایسا نہ ہوسکا۔من حیث القوم مسلم ممالک مروجہ سماجی اور معاشی پیمانوں پر دنیا میں سب سے نچلی سیڑھی پر ہیں۔تو اب رسوائی ہی ہمارا مقدر ہے۔

فیروز عالم (یو۔ایس۔اے)

گلزار جاوید صاحب، آداب وسلام۔

''چہارسو'' کا فخر زمان نمبر اپنی تمام تر علمی و ادبی انفرادیت کے ساتھ موصول ہوا۔اس سے قبل کے شمارے بھی ملتے رہے ہیں۔چہارسو کا ہر شمارہ میرے لیے اہم ہوتا ہے کہ میں اسے صرف رسالہ نہیں بلکہ سرحد پار سے آنے والا خلوص ومحبت سے بھرا ایک بیش قیمت ادبی تحفہ خیال کرتا ہوں۔اس کے مطالعے کے دوران ارضِ ادراک سے سرحد کی لکیریں مٹ جاتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے گویا ممبئی اور راولپنڈی کے درمیان کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔

آپ کا ڈرامہ ''بغل بچے'' بے حد پسند آیا۔دوران مطالعہ سبھی منظر پردۂ شعور پر گشت کرنے لگتے ہیں۔مکالمے بھی دلچسپ ہیں۔عقیل کے مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ دیگر کردار بھی عمدہ ہیں۔پہلے منظر میں جو پھٹیچر شاعر کا کردار آپ نے دکھایا ہے وہ نہایت دلچسپ ہے۔یہ ڈرامہ اگر سٹیج کے لیے Develop کیا جائے تو شاعر کے کردار کو بڑھایا جاسکتا ہے اور یہ کردار ہائی لائٹ ہوسکتا ہے۔زیرِ نظر شمارے کے دیگر سبھی مندرجات چہارسو کے شایانِ شان ہیں۔

ناصر بغدادی، آغا گل، سید سعید نقوی، فرخندہ شمیم، عظمٰی صدیقی اور نجیب عمر کے افسانے پسند خاطر ہیں۔مشکور حسین یاد، غالب عرفان، سرور انبالوی، حسن عسکری، رؤف خیر، سیفی سرونجی، شگفتہ نازلی، پروفیسر زہیر کنجاہی، رومانہ رومی، نوید سروش، تصور اقبال، پروین شیر اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے منظوم کلام کی خوشبو روح میں اتر جاتی ہے۔قرطاسِ اعزاز کے تحت محترم فخر زمان صاحب سے ملاقات اچھی رہی۔

مراق مرزا (ممبئی)

میرے گلزار، سلامتی کی دعائیں۔

برادرِ عزیز مہندر پرتاپ چاند سے منسوب ماہ ستمبر اکتوبر کا چہارسو

باصرہ نواز ہوا۔شمارہ کیا ہے علم وادب کا ایک ایسا صاف وشفاف دریا ہے جس میں چاند صاحب کی شبیہہ توانا تر ہو کر نمایاں ہو رہی ہے جس میں آپ کی محبت، محنت اور مہارت کی جھلک بھی صاف طور پر دیکھائی دے رہی ہے۔ براہِ راست بدستور اپنی راہ پر خوبصورت طور سے سفر انداز نظر آتا ہے۔محترم شباب للت اور دیگر احباب نے چاند صاحب کی شخصیت اور فن کو نہایت خوبصورت انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔چاند صاحب کی غزلیں اور نظمیں بہت خوب ہیں بطور خاص نذرِ کروڑ اور تمہاری ایک ہم شکل کو مائلِ بہ کرم دیکھ کر۔ بلاشبہ چاند صاحب کے افکار وخیالات اور کلام نے اس دستاویز کو اہم بنا دیا ہے۔

کئی افسانے بہت خوب ہیں ماسوائے چند ایک افسانوں کے جنہیں شاید میں اپنی کم فہمی کے باعث دلچسپ نہ سمجھ سکا البتہ ''پگھلتے لمحوں کی تصویر'' اور ''تاجدارِ اَلم'' بہت پسند آئے۔آپ نے جس قدر اختصار وایجاز کے ساتھ حضرت اوباما کو مخاطب کر کے تیسری دنیا بالخصوص پاکستان کے عوام پر گذرنے والی المناکی کو بیان کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔خدا کرے آپ کی یہ جرأت مندانہ کاوش بار آور ثابت ہو۔

شاعری کا غالب حصہ قاری کی توجہ خوب حاصل کر رہا ہے اور ہمیشہ کی مانند فیروز عالم صاحب بھی اپنی خودنواشت سوانح ''ہوا کے دوش پر'' دلچسپ انداز میں جاری رکھے ہوئے ہیں اس طرح قاری کا اشتیاق دوچند ہو جاتا ہے۔ دیپک کنول صاحب بھی اپنے انداز میں چہارسو کو رونق بخش رہے ہیں۔اس بار انہوں نے برصغیر کے نامور اداکار ''پران'' پر سیر حاصل مضمون تحریر کر کے اُس غم کو کم کرنے کی سعی کی ہے جو پران صاحب کی وفات کے باعث دلوں کو ملول کر رہا تھا۔اور نیلوفر عباسی صاحبہ نے جس طور اپنے عظیم شریک حیات کو یاد کیا ہے اُس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عظیم فنکار کے ساتھ ماضی کا صیغہ کبھی نہیں لگتا۔

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

ہمیشہ کے گل وگل زار، السلام علیکم۔

چہارسو نے چہار جانب شعر وسخن کے گل بوٹے سجا دیئے۔خوب خاطر جمعی سے پڑھا اور شاد کام ہوا۔قرینے سے پتہ چلتا ہے کہ میرا خط نذر چہارسو نہیں ہوا۔ میں نے خوب خاطر جمعی سے لکھا تھا اب کے میں سرتاپا غیر موجود ہوں۔آہوئے رم کردہ کا سا اضطراب دل میں لیے بیٹھا ہوں۔امید ہے یہ عریضہ بارِ خاطر نہ ہوگا۔کبھی کبھی شکایت حکایت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔کہتے ہیں شاعری فرضیات کا ذخیرہ نہیں۔یہ آنسوؤں اور آہوں کی درخشانی سے اوراق میں چاندنی اُتارنے کا نام ہے۔ پروفیسر زہیر کنجاہی قلم سے کنواں کھود کر مجھ پیاسے کی پیاس بجھاتے ہیں۔موصوف پرانے تخلیق کار ہیں۔شعری معصومیت کا پرچم اٹھائے نکلے ہوئے ہیں۔انہوں نے اپنے خط میں مجھے مذکور کیا ہے یہ اُن کی دوستانہ معصومیت ہے۔نوید سروش ہر بار مجھے ایک نہ ایک تنقیدی جملے سے سرفراز کرتے ہیں۔میر پور خاص دیکھا تو نہیں اس شہر کی مخلصانہ عنایات سے عزت مند ضرور ہوا ہوں۔چہارسو کی نغمہ باری اُن کا یہ ''نوید افروز'' شعر یاد رہے گا:

میری زیست کا محور ہیں وہ دوست مرے
رکھتے ہیں جو ہر مشکل میں دھیان بہت

قرطاسِ اعزاز مہندر پرتاپ چاند کے نام۔طمانیت افزا بھی ہے اور بقولے چمکیلی آنکھوں اور خوشنما چہرے کا صحیفہ بھی۔ پیاری پیاری صورتوں کے لیے آگ اور دریا سے گزر جانا دیوانے کا خواب نہیں۔ میں نے چاند کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھا بھلا پایا۔عظیم فن کار پران کے خصوص میں ''نوشت'' اس قماش کی جملہ تحریروں سے قدرے بہتر ہے۔اس میں پران (آنجہانی) کی عظمت بول رہی ہے، فنکارانہ عظمت۔۔۔اس باب میں پران کا درجہ پرتھوی راج، یعقوب، دلیپ کمار، دیوآنند، راج کپور، امیتابھ، موتی لال وغیرہ سے کسی طور کم نہیں۔ میں نے پران کی کئی فلمیں دیکھی ہیں۔مثال انتھونی کوئین سے دی جاسکتی ہے۔

آصف ثاقب (بوئی ہزارہ)

جناب گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

چہارسو، جلد۲۳، شمارہ ستمبر۔اکتوبر، ۲۰۱۳ موصول ہوا۔انٹرنیٹ پر اسے سرسری طور پر دیکھ چکی تھی لیکن رسالہ جب ہاتھ میں ہو تو کچھ اور بات ہوتی ہے۔پا کر بہت خوشی ہوتی ہے جس کے لیے آپ کی بے حد ممنون ہوں۔ ہر شمارے کے مطالعے کے بعد آپ کو لکھنا چاہتی ہوں۔ چہارسو سے جو روحانی غذا میسر ہوتی ہے اس کا اظہار کرنا چاہتی ہوں لیکن دل کی دل میں رہ جاتی ہے۔ مصروفیتوں کے جال میں قید۔

میں نے شاید پہلے بھی عرض کیا تھا کے آپ انسان ہیں یا جن؟ کس قدر باقاعدگی سے چہارسو شائع کرتے ہیں اور میعار کے ساتھ۔ یہ شمارہ بھی چاند کی کرنوں سے پُر نور ہے۔ادیبوں کو قرطاس اعزاز عطا کرنا، اس قدر پابندی کے ساتھ، قابل تحسین ہے۔اس سے ہم جیسے غریب الوطن کتنی معلومات سے ہمکنار ہوتے ہیں اور اہم، ادبی شخصیات سے متعارف ہوتے ہیں۔مہندر پرتاپ چاند صاحب سے آپ نے بھر پور ملاقات کا موقعہ فراہم کر دیا۔خوشی ہوئی۔اس میں۔۔براہ راست۔۔کا کارنامہ بھی ہے۔اس کے علاوہ کئی تخلیقات بے حد پُر اثر ہیں۔خاص کر افسانہ۔۔رنگوں کے پیچھے (رشید امجد)۔۔۔پگھلتے لمحوں کی تصویر (مراق مرزا) نے جھنجھوڑ دیا۔یہ دنیا اب تو سینکڑوں ۔۔ڈاکٹر مجیب ۔۔سے بھری پڑی ہے۔مغرب ہی نہیں، مشرق میں بھی اس تلخ حقیقت کے سانپ سرسراتے ہیں۔۔۔ڈھونڈو گے ہمیں۔۔۔(نیلوفر عباسی) پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔قمر علی عباسی صاحب سے ملاقات یاد آگئی۔دل بہت غمزدہ ہو گیا۔اللہ نیلوفر عباسی صاحبہ کو صبر واستقلال عطا کرے۔آمین۔شاعری کا حصہ بھی بہت پسند آیا۔۔۔تاجدار الم (گلزار جاوید) بھی خوب ہے۔ کیا طرز اظہار ہے ماشاءاللہ۔ ہر شمارے میں آپ کی عمدہ تخلیق حیران کرتی ہے۔

پروین شیر (کینیڈا)

بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس مرتبہ پھر اردو کے ایک نابغہ روزگار جناب مہندر پرتاپ چاند قرطاس اعزاز میں جلوہ گر ہیں اور جریدے کے مکمل پچاس صفحات پر اپنے علم وفن کی چاندنی بکھیر رہے ہیں۔ ضلع لیّہ میں طلوع ہونے والا چاند کسے پتہ تھا کہ بھارت جا کر اپنی ٹھنڈی روشنی اور وہ بھی اردو کی جگمگاتی روشن کرنوں سے زبان کو مالا مال کرے گا بلکہ ہنوز کرتا رہے گا یوں تو اُن کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے جو یقیناً اُن کو ہی زیب دیتا ہے لیکن صفحہ پانچ پر ''انسانیت مر نہیں سکتی'' پڑھ کر میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ تقسیم کے خوں ریز فسادات کے دوران ایک ایسا ناقابل یقین واقعہ بھی رونما ہو سکتا ہے جو رہتی دنیا تک انسانیت کی مثال بن کر تاریخ میں رخشندہ وتابندہ رہے گا۔ میں سردار گورمکھ سنگھ کو اگر وہ زندہ ہیں تو سلام اور اس جہاں سے جا چکے ہیں تو اُن کی روح کو سکون عطا کرنے کی دعا کرتا ہوں۔

''ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں'' میں جس طرح نیلوفر عباسی نے اپنے مرحوم شوہر کا ذکر اور جس محبت کے ساتھ اُن کے آخری لمحات کا نقشہ کھینچا ہے اُسے پڑھ کر دل بھر آتا ہے واقعی قمر علی عباسی مرحوم اردو کا ایک سرمایہ تھے اللہ اُنہیں غریقِ رحمت کرے، آمین! لیکن موصوفہ نے تحریر کی روانی میں علامہ کا شعر صفحہ ۱۰۷ پر کچھ اتنا غلط درج کر دیا ہے کہ عالمِ برزخ میں اقبالؔ کی روح تڑپ اٹھی ہوگی اصل شعر یوں ہے:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

افسانوں میں رشید امجد کا افسانہ ''رنگوں کے پیچھے'' بہت ہی مختصر اور بہت ہی عمدہ افسانہ تھا جس میں مصنف نے وقت کا فلسفہ سمجھایا ہے۔ دوسرا افسانہ ''وقت کا طوفان'' بھی کچھ کم وقعت کا نہیں تھا بہت پسند آیا۔ ہاں! آپ کا طنزیہ شاہکار تو میں بھول ہی گیا ''تاجدارِ اَلم'' یقیناً خط کے روپ میں ایسا تازیانہ ہے جو بروقت بھی ہے برمحل بھی۔ مبارکباد! لیکن حسن منظر کا ''بادشاہ کا قد'' بالکل پھسپھسا لگا۔ چہارسو کے پانچ صفحات یونہی ضائع ہو گئے۔ آپ نے غزل اور خط شاید فرمایا شکریہ! لیکن کمپوزر نے ''متاعِ چہارسو'' کے ذیلی عنوان ''نئی تاریخ'' کی فہرست میں شائع میرا نام اس وجہ سے نہیں دیا ہے کہ گزشتہ شمارے میں، میں نے ان کی انگریزی دانی پر تنقید کی تھی۔ بہرحال جو چاہے اُن کا ''قلم کرشمہ ساز کرے''

غالب عرفان (کراچی)

محترم گلزار صاحب، آداب۔

فخر زمان صاحب کے لیے قرطاس اعزاز والا شمارہ موصول ہوا۔ حسبِ روایت خوبصورت اور معلومات افزا مضامین پڑھنے کو میسر آئے۔ فخر زمان صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آئے۔ بہت اچھا لگا۔

رس رابطے کے ذریعے محترمہ شگفتہ نازلی صاحبہ اور محترم ڈاکٹر فیروز عالم نے جس طرح میرے شوہر قمر علی عباسی کے اس دارِ فانی سے کوچ کر جانے پر دکھ کا اظہار کیا میں اُن کی تہہ دل سے ممنون ہوں۔ میں بقیہ تمام قارئین کی بھی شکر گزار ہوں جو اپنے خطوط، تحریروں اور فون کے ذریعے میرے دکھ میں شریک ہوئے۔

گلزار صاحب آپ نے ستمبر اکتوبر کے شمارے میں عباسی صاحب کی یادوں پر مشتمل میرا مضمون ''ڈھونڈو گے ہمیں'' شائع کیا اس کے بالکل شروع میں قمر علی عباسی نے میری ڈائری کے پہلے صفحے پر ۲۰۱۳ء کے آغاز میں جو لکھا تھا آپ نے وہ پیراگراف بھی شامل کیا۔۔۔ عنایت۔ عباسی صاحب ہر سال ۳۱ر دسمبر کی شام مجھے نئے سال کی ڈائری پہلے صفحے پر دعاؤں، نیک تمناؤں اور آنے والے سال کے لیے مسرتوں بھرے لمحوں کی خواہش کے ساتھ دیتے تھے اور میں پورے سال ہر دن کی تفصیل تاریخ کے حساب سے لکھتی جاتی تھی۔۔۔ اُن صفحوں پر خوشیاں ہوتیں دن بھر میں ہونے والے دلچسپ واقعات ہوتے آنے والے دنوں کی پلاننگ ہوتی۔

ڈائری لکھنا میری کالج کے زمانے کی عادت تھی لیکن اب ۲۰۱۳ء میں یہ ڈائری آخری ڈائری ہے کیونکہ اب وہ شخص نہیں رہا جو ۳۱ر دسمبر کی شام بڑی محبتوں سے یہ تحفہ دیتا تھا۔۔۔ اب ڈائری میں لکھنے کو بھی کچھ نہیں رہا:

رہینِ درد ہوا وقفِ رنج و یاس ہوا
بچھڑ کے تجھ سے مرا دل بہت اُداس ہوا

نیلوفر عباسی (نیویارک)

محترم گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

اس دفعہ صاحبِ قرطاسِ اعزاز مہندر پرتاپ چاند صاحب چونکہ میرے علاقہ سے ہیں اس لیے اُن کی تحریریں اور تخلیقات زیادہ توجہ اور محبت سے پڑھیں، میرا گاؤں کلور کوٹ کے نزدیک ''ہرنولی'' ہے جو کہ پہلاں ریلوے سٹیشن کے قریب ہے۔ یہاں سے تلوک چند محروم اور رام لعل جیسے لکھاری پیدا ہوئے، جگن ناتھ آزاد بھی میانوالی آئے، پھر کروڑ لعل عیسن، ضلع لیہ سے گوپی چند نارنگ بھی ہیں۔ اُن کے والد ریلوے میں تھے اور نسیم لیّہ اُن کے کلاس فیلو تھے۔

ڈاکٹر شباب للت، علیم صبا نویدی اور پنڈی سے تعلق رکھنے والے نند کشور وکرم جیسے لوگ اردو کی آبرو ہیں۔ اردو کا اعتبار اور افتخار ہیں۔ ان کی صحت اور زندگی کے لیے دعا گو ہوں۔ اردو میٹھی، سچی، کھری اور آسان زبان ہے۔ قرطاس اعزاز سے لے کر رس رابطوں تک پرچہ خوبصورت ہے۔ آپ کا تحریر کردہ ''تاجدارِ اَلم'' کتنا سچ ہے اور کتنا اہم ہے۔ ادب برائے زندگی اور ادب برائے عمل آج کی ضرورت ہے۔ پنڈی اسلام آباد میں گزرے دن اور محفلیں یاد آتی ہیں۔ مسرور جالندھری، ظہیر زیدی، پروفیسر جمیل، بشیر ناظم اور انوار فیروز جیسے احباب ہمیشہ یاد آتے ہیں۔

کرامت بخاری (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

تازہ ''چہارسو'' موصول ہوا، آپ کی محبت ہے۔ اس شمارے میں قرطاس اعزاز جناب مہندر پرتاپ چاند کے نام ہے، آپ نے اُن کی ادبی خدمات کا حق ادا کر دیا۔ ''وفاؤں کا صلہ'' میں صاحبِ قرطاس اعزاز کے والد کے نام کے ساتھ مرحوم اور والدہ کے نام کے ساتھ مرحومہ لکھا گیا جو درست نہیں۔ مرحوم کا مطلب ہے رحمت کیا گیا، ہندو دھرم کے مطابق آنجہانی یا سورگی کہتے ہیں۔

''رنگوں کے پیچھے'' ڈاکٹر رشید امجد کے مخصوص اسلوب میں لکھا ہوا افسانہ ہے، آپ کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے ہمیشہ ''مرشد'' سے مدد لیتے ہیں جس سے افسانے کا مرکزی کردار سوال کر کے جواب حاصل کرتا، کسی نہ کسی کنارے لگ جاتا ہے، علامت ہمیشہ آپ کو مرغوب رہی ہے۔ یہ افسانہ بھی اسی انداز میں لکھا ہے۔ حسن منظر نے ''بادشاہ کا قد'' لکھا، موضوع اچھا ہے لیکن افسانہ اچھا نہیں بن سکا۔ آغاز میں ہی کہانی یوں ڈانواں ڈول ہوئی کہ قد چھوٹا ہونے کا احساس تو بجا لیکن آئینے میں قد ناپنے کی کوئی تک نہیں، افسانوی نثر بھی معیار سے دُور ہے۔ لگے ہاتھوں رخسانہ صولت نے بھی چہارسو کے لیے ''ننگی'' لکھا، علامتی اسلوب اختیار کرنے کی سعی کی گئی مگر مشکور نہ ہوئی۔ بیان نہ علامت، جملوں میں کہیں بھی ربط نہیں ہے اور نثری اغلاط بھی در آئی ہیں مثلاً مفلسی غربت اور افلاس کے کائی زدہ سمندر۔۔۔ تین مختلف الفاظ معنی ایک نوحہ گاتے ہوئے رقص کناں۔۔۔ گیت گائے جاتے ہیں اور اُن پر رقص کیا جاتا ہے جبکہ نوحہ رنج و حزن کی علامت ہے اور پڑھا جاتا ہے اس پر رقص نہیں ماتم کیا جاتا ہے۔

دیپک بُدکی معروف افسانہ نگار ہیں لیکن اس بار عام سے موضوع کی زد میں آ گئے۔ خالص افسانے کا ذوق رکھنے والے قاری شاید یہاں سے پھلانگ جائیں۔ اسلوب جیسا بھی ہے، کرداروں اور واقعات پر دیپک کی دسترس ہے۔ ''پگھلتے لمحوں کی تصویر'' مراق مرزا کی کاوش ہے۔ اس افسانے میں اگرچہ کوئی نئی بات نہیں تاہم مرزا کا اسلوب گوارا ہے، افسانہ آغاز میں قاری کو گرفت کرتا ہے۔ ''وقت کا طوفان'' جسے نند کشور وکرم نے لکھا، کا ذکر نہ کر کے میں گنہگار نہیں ہونا چاہتا۔ وہ زمانے گئے جب اولاد کی شادیوں میں والدین کی مرضی چلتی تھی، بھاگوان اولاد بزرگوں کے فیصلے پر احتراماً خاموش ہو جایا کرتی تھی۔ یہ افسانہ Generation Gap کا احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر زین السالکین سالک نے بڑے دکھی انداز میں ''پیوستہ رہ شجر سے'' تحریر کیا۔ محبتوں اور شفقتوں کا زمانہ یوں بیت گیا جیسے ایک خواب اور اب مادی دور ہے، دھن کے لالچ نے خونی رشتوں کی چمک کو ماند کر دیا ہے، نفسانفسی اور افراتفری کا زمانہ ہے۔ زہرہ سمن علی نے ''آسانی'' سے نوازا لیکن بطور افسانہ کوئی تاثر نہ دے سکا البتہ ایک جملہ ''بس ایسے شخص سے ملاقات ہی نہیں ہوئی جس کے ساتھ ساری عمر گزار دینے کو دل چاہے'' کہانی کو سمیٹ لینے کے لیے کافی تھا۔

افسانوں میں آخری تحریر ''تاجدارِ اَلم'' گلزار جاوید کے قلم سے سرزد ہوئی، بلاشبہ آپ کو اردو افسانے اور ڈرامے پر دسترس ہے لیکن اس عنوان پر تحفظات کا حق میں محفوظ رکھتا ہوں۔ ہم نبیؐ کے اُمتی جب بھی تاجدار کہتے ہیں تو ''حرم'' کا لفظ ہمارا دل اور زبان ولب خود بخود ادا کر دیتے ہیں۔ ہم شعوری طور پر تاجدار کے ساتھ کوئی اجنبی لفظ قبول نہیں کرتے، یہ مذہبی یا مسلکی تنگ نظری نہیں ہے البتہ گلزار جاوید کا باراک حسین اوباما کے نام خط ایک جرأت مندانہ اقدام ہے۔ ہمیں آزادی کی صبح دیکھے چھیاسٹھ برس بیت گئے لیکن ذہنوں کی زنجیریں بُوں کی تُوں ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ہمارے سینوں پر کئی پاؤں کا بوجھ ہے، پوری قوم خلفشار وانتشار کا شکار ہے۔ یہ خط یقیناً ادبی تاریخ کا حصہ ہوگا۔

احسان بن مجید (اٹک)

برادرِ مہربان جناب گلزار جاوید، آپ سلامت رہیں۔

۹ ستمبر کی شام میرے گھر کے ایڈریس پر (حسب درخواست) ''چہارسو'' موصول ہو گیا۔ آپ کا شکریہ۔ اب یہی ایڈریس مستقل آپ کے رجسٹر میں رہے۔ آفس میں پورے شمارے کا مطالعہ نہیں کر پاتا اور آتے جاتے کسی دوست کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ بات تو بُری نہیں، مگر حرکت یہ اچھی نہیں۔ مہندر پرتاپ چاند سے بھرپور تعارف ہوا۔ ڈاکٹر شباب للت اور کرشن پرویز کی بدولت اور دیگر ادبی جرائد میں چاند بھائی کو کچھ کچھ جانتا ہوں اور اُن کے شعری مقام کو بھی پہچانتا ہوں۔ مگر آپ نے گہری ملاقات کرا دی۔ ''انسانیت مر نہیں سکتی'' اور نیلوفر عباسی کی اپنے مرحوم شوہر کے بارے تحریر میں ''ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں'' محبت کی نئی منزلوں سے روشناس کیا۔ یہ ''چہارسو'' کا حسنِ انتخاب ہے۔

طفیل اختر (لاہور)

جناب گلزار جاوید، سلامِ مسنون۔

مجی مراق مرزا صاحب جو خوش قسمتی سے میرے ''علاقائی پڑوسی'' ہیں (ہم دونوں ممبئی کے معروف علاقہ ورسوا میں رہتے ہیں) اکثر و بیشتر مرزا صاحب اپنے پڑوسی ہونے کا فرض ادا کرتے رہتے ہیں۔ چہارسو سے تعارف کرانے کا سہرہ بھی انہیں کے سر ہے۔ سب سے پہلے ''رس رابطے'' کے سارے رسیلے خطوط ایک ہی سانس میں پڑھ ڈالے۔ آپ کے ڈرامے کا اندازِ تحریر بے حد پسند آیا۔ میری طرف سے دلی مبارکباد۔ اس بار غزلوں کے مقابلے میں نظموں کا پلہ بھاری ہے۔ جناب فخر زمان پر مضامین پڑھ کر ایسا لگا جیسے میں انہیں برسوں سے جانتا ہوں۔ دیپک کنول کا کچھ عظیم شخصیتوں کے بارے میں ہتک آمیز ذکر گراں گزرا۔ خاص طور سے پنڈت جواہر لال نہرو کے بارے میں یہ لکھنا کہ وہ ''لتا کا گانا سن کر اپنے آنسو روک نہ سکا'' کچھ عجیب سا لگا۔

حامد لطیف (بھارت)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

بعض اوقات ''قرطاس اعزاز'' میں سے صرف ''براہِ راست'' پڑھتا ہوں۔ اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا کہ ''قرطاسِ اعزاز'' میں سے براہ راست

اورشہرت کے بہانے مہندر پرتاپ چاند کے بارے مختلف حضرات کے خیالات ہی کا مطالعہ کیا۔ دوسرے حصّہ میں سب سے پہلے خورشید انور رضوی، نورین طلعت عروبہ اور ابراہیم عدیل کی نعتیں پڑھیں۔ پھر رس رابطے کی طرف چلا گیا۔ حصّہ رس رابطے محبت اور خلوص سے بھرپور ہے۔ افسانوں میں رشید امجد، رخسانہ صولت، حنیف باوا، شاہد جمیل اور گلزار جاوید کے افسانے اچھے لگے۔ آپ نے تو اس دفعہ خوب طنز بھری کہانی لکھی ہے۔ کہانی کے آخر کے چار مصرعے تو کہانی کا دل معلوم ہوتے ہیں:

یہ بازی زیست کی بازی ہے　　یہ بازی تم ہی ہارو گے
ہر پیٹھ ہماری ننگی ہے　　تم کتنے ڈنڈے مارو گے

غزلوں میں سرور انبالوی، غالب عرفان، انتظار باقی، نسیم سحر، مناظر عاشق ہرگانوی اور اسد اعوان کی غزلیں پسند آئیں۔ عبداللہ جاوید کی نظم ''ابھی کچھ وقت باقی ہے'' سب سے اچھی ہے۔

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

محترمی گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

''چہارسُو'' اپنی روایتی آب وتاب کے ساتھ مل گیا دل خوش ہوگیا۔ اس کا ہر شمارہ کسی نہ کسی علمی اور ادبی شخصیت کا بھرپور تعارف کروا دیتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی ایسا نام بھی ہوتا ہے جس سے میری طرح بہت سے لوگ واقف نہیں ہوتے۔ ادب کے ابلاغ کے لیے یہ آپ کا اہم Contribution ہے۔ جناب مہندر پرتاپ چاندؔ کی ادبی خدمات کا مجھے تو اب پتہ چلا۔ اپنی کم علمی اور جہالت پر شرمندہ ہوں۔

تازہ شمارے کے دونوں حصے، نظم ونثر جاندار ہیں۔ افسانوں کا انتخاب خوب تر ہے۔ خاص طور پر ''رنگوں کے پیچھے''، ''بادشاہ کا قد'' اور ''وقت کا طوفان'' تینوں میں تخیل کی جولانیاں نظر آتی ہیں۔ جدت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ''ایک صدی کا قصہ'' نے حسب معمول پرانی یادیں تازہ کردیں اور دل ودماغ چھلانگ لگا کر ماضی میں چلے گئے۔ ماضی جو ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔ امریکی صدر اوباما کے نام آپ کے خط نے چونکا دیا۔ اس طرح کہتے ہیں سخنور سہرا۔ خاص دلچسپی سے پڑھا۔ ہلکے پھلکے انداز میں آپ نے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ آداب والقاب کے پیچھے چھپے ہوئے تیروں نے بہت لطف دیا۔ دوبارہ پڑھوں گا۔

پروفیسر مسکین احمد منصور (حیدرآباد، سندھ)

جناب گلزار جاوید، آداب۔

آپ کا ارسال کردہ ''چہارسُو'' وصول پایا اور ہمیشہ کی طرح دلی مسرت کا باعث بنا۔ پرچہ ہذا میں پاکستانی نژاد مہندر پرتاپ چاند کا تعارف اور ان کے ادبی سفر کے حوالے سے جو مضامین شامل ہیں لائق تحسین اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ حصّہ ''درودِ پاک کی برکت'' میں پروفیسر زہیر کنجاہی اور نورین طلعت عروبہ کی نعتیں اچھی لگیں۔ غالب عرفان کا یہ شعر:

اپنے اندر کی سیر کر کے میں　　ذات کو کائنات لکھتا ہوں

اور نسیم سحر اور اشرف جاوید کی غزلیں اچھی لگیں۔ غزلوں کے دوسرے گوشے ''آسمان بولتا ہے'' میں غلام نبی اعوان کی غزل اچھی لگی۔ الغرض پرچہ بلند پایہ معیار کا حامل ہے۔

انتظار باقی (جھنگ)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا ستمبر اور اکتوبر کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ تمام احباب کی نعتیں پڑھ کر ایمان تازہ ہوگیا۔ جناب خورشید انور رضوی کی نعت کا یہ شعر:

حسنؓ حسینؓ فاطمہؓ پہ جان قربان
زمین پہ عرش کے تارے سجا دیئے تُو نے

جس کے مصرعہ اولیٰ میں ایک لفظ کی کمی محسوس ہوتی ہے اور مصرعہ ثانی زمین کی ''ن'' کے اعلان سے وزن سے باہر نظر آتا ہے۔ یہ غالباً کمپوزنگ کی غلطی کی وجہ سے ہوا۔ اس طرح غزلیات میں جناب غلام نبی اعوان کی غزل کا یہ مصرعہ:

''جھگڑ رہے ہوا سے کواڑ کمروں کے''

یہاں بھی ایک لفظ کی کمی نے خرابی پیدا کردی۔ قرطاس اعزاز میں جناب مہندر پرتاپ چاندؔ کا بھرپور تعارف اور کلام پسند آیا۔ افسانوں میں رشید امجد، حسن منظر اور رخسانہ صولت کے افسانے باکمال تھے۔ جناب حنیف باوا نے اپنے ہی پنجابی افسانے کا ترجمہ کمال مہارت سے کیا جو بہت اچھا لگا۔ آپ نے ''تاجدارِ اَلَم'' لکھ کر ایک سپر پاور کی جو خبر لی ہے وہ بھی اپنے اندر ایک منفرد ادبی شان لئے ہوئے ہے۔ رس رابطے چہارسو کے حسن میں اضافہ کا باعث ہے۔ انور سدید، رشید امجد، انتظار باقی، پروفیسر زہیر کنجاہی، نوید سروش، فیروز عالم اور احسان بن مجید کی آراء پسند آئیں۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، آداب وتسلیم۔

اس بار اردو ادب کے چاند مہندر پرتاپ چاندؔ کے لیے قرطاسِ اعزاز دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ ان کا کلام تو رسالوں میں برسوں سے دیکھتا آیا تھا لیکن اس قرطاس کے ذریعہ ایک تفصیلی آگاہی ہوسکی۔ اس نسل کے بعد سرحد پار سے ایسی خوشبو کیوں کر آئے گی۔ یہ سوچ کر قدرے ملول بھی ہوں۔ یہی حال مغرب میں آباد ''اردو کی بستیوں کا ہے کہ وہاں آئندہ نسل اردو سے بیگانہ ہے۔ اردو سے محبت کرنے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ۔ علامہ قیس جالندھری جیسے استاد اور چاند جیسے شاگرد اب عنقا ہیں ایسے سچے اور پُرخلوص انسانوں نے وہ سچا اور کھرا ادب تخلیق کیا تھا۔

قمر علی عباسی مرحوم کی یاد میں نیلوفر عباسی کا مضمون کافی تاثر انگیز ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے تھا۔ ایک بیوی سے زیادہ کون اپنے شریک حیات کو جانتا ہوگا۔ لیکن علامہ اقبال کے مشہور زمانہ شعر کا خرابہ دیکھ کر دکھ ہوا:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

جناب رشید امجد نے ''رنگوں کے پیچھے'' اور مراق مرزا نے ''پگھلتے لمحوں کی تصویر'' میں وقت کو کینوس بنا کر دو خوبصورت تحریریں پیش کیں۔ وقت کی حقیقت تو دیکھیں اور زمانہ کو پرکھیں تو مستقبل کی ہمیں خبر نہیں۔ حال لمحوں کے بعد ماضی کا حصہ تو اساس ماضی ہوا۔ اس دشت کی سیاحی ادیبوں، شاعروں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ دیپک کنول نے ممبئی نگری کے ایک ایسے قد آور فنکار ''پران'' کی یاد تازہ کی کہ دل سے بے ساختہ آہ نکلی اور دل کو قدرے تسلی بھی ہوئی کہ وہ بڑا فنکار بڑا انسان بھی تھا۔ چہرہ اداکار کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے اور چہرے پر آنکھیں پران نے اپنی آنکھوں سے جو کام لیا اور اداکاری کو جس طرح سنوارا اس کی مثال نہیں ملتی۔

نجیب عمر (کراچی)

''محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

اس بار ''مہندر پرتاپ چاند'' کے نام قرطاسِ اعزاز معنون کر کے آپ نے ہمیں ایک سنجیدہ تخلیق کار سے ملوایا ہے۔ ''براہِ راست'' میں سوالات کے جوابات چاند صاحب نے بڑے دھیمے لہجے میں تفصیل سے دیے ہیں اُن کی گفتگو سے ایک ایسے شخص کا خاکہ ابھرتا ہے جو اہل زمیں کے لیے دردمندی کے جذبات رکھتا ہے اور علم وادب کا دلدادہ ہے۔ اُن کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے مضامین سے اُن کی فکر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ عطیہ سکندر علی نے ''شہرت کے بہانے'' میں اہلِ علم ودانش کی آراء کو سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ رشید امجد صاحب نے اپنے ہونے کے یقین کو پختہ کیا ہے کہانی کو تکنیک کی پختگی کے ساتھ اختتام تک لائے ہیں۔ ڈاکٹر حسن منظر نے ''بادشاہ کا قد'' کے عنوان سے ذرا سا محمد حسین آزاد کے اسلوب میں خوب کہانی سنائی ہے۔ قد، طبیب، درباری، شہزادی اور بادشاہ کی کیفیت کو مختلف علامتوں میں تصور کر رہا ہوں اسے ہماری سیاسی بازی گروں کی زندگیوں اور اجتماعی قومی فیصلوں کے پس منظر میں دیکھ رہا ہوں۔ محترمہ رخسانہ صولت سلیمی کا منفرد افسانہ ''ننگی'' میں ظاہر و باطن کے کشمکش کو نذرِ قرطاس کیا۔ افسانے کی بنت سے محترمہ کا گہرا مطالعہ ظاہر ہو رہا ہے۔ حنیف باوا کی تخلیق وترجمہ ''دو پل بیٹھے'' میں دلی کیفیت کے ایک تاثر کو افسانے کا روپ دیا ہے اور وہاں لا کر بڑی خوبی سے چھوڑ دیا جہاں قاری پر ''تجسس'' حاوی تھا۔ شہناز خانم عابدی، نند کشور وکرم، مراق مرزا، شاہد جمیل کے افسانے بھی متاثر کرتے ہیں۔ گلزار جاوید صاحب آپ نے ''تاجدارِ اَلم'' میں پاکستانی مظلوم عوام کا نوحہ لکھا ہے یہ طنزیہ، تاریخ، سیاست، معاشیات اور سماجیات کے ایسے پہلوؤں کو روشن کرتا ہے جو زمین پر کسی بھی قوم کو عزت کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے بہت ضروری ہے یہ تحریر عام پڑھے لکھے پاکستانی کے دل کی آواز ہے۔

موجودہ شمارے میں نعتیں ذہن و دل کو منور کر رہی ہیں۔ نظموں کا حصہ موضوع اور کرافٹ کے اعتبار سے متنوع ومنفرد ہے۔ عبداللہ جاوید، ایوب خاور، جاوید زیدی، ظریف احسن، شگفتہ نازلی اور ڈاکٹر انیس الرحمٰن کو مبارک باد۔ سرور انبالوی، انتظار باقی، خیال آفاقی، مقبول منظر، اشرف جاوید، سید سعید نقوی اور غلام نبی اعوان کی غزلیں روایت کی پاسدار بھی ہیں اور جدید لہجے کی جھلک بھی۔ کرامت بخاری، تصور اقبال، شائستہ سحر، جاوید خان جاوید اور وشال کھلّر کی غزلوں کے اکثر اشعار ہماری آواز ہیں۔

نیلوفر عباسی کا اپنے محبوب شوہر قمر علی عباسی پر مضمون ''ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں'' میں محبت بھری رفاقت، اعتبار اور چاہت کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ بیماری سے اسپتال تک اور آئی سی یو سے موت تک کی روداد نہایت پُر اثر ہے۔ مضمون میں قمر علی عباسی کی سفر نامہ و کالم نگاری، اعلیٰ سرکاری ملازمتوں، کامیابیاں اور انعامات واسناد کا ذکر انتہائی سلیقے سے کیا ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

''رس رابطے'' کا مطالعہ ہمیشہ دلچسپ رہتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب کی محفل میں خاصی لمبی غیر حاضری کے بعد آمد خوشی کا باعث بنی۔ وہاں انھوں نے حیران کر دینے والا انکشاف کیا کہ ''اب تک ''چہارسو'' میں ۲۶۴ ممتاز ادیبوں کے گوشے چھپ چکے ہیں'' (ص۔۱۱۴)۔ میرا خیال ہے کہ اس حوالے سے ''چہارسو'' اردو دنیا کا ایک اہم، منفرد اور تاریخ ساز پرچہ بن چکا ہے جس کی دوسری مثال پیش کرنا مشکل ہے۔ گلزار جاوید زندہ باد۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے اپنی آپ بیتی ''ہوا کے دوش پر'' میں لیاقت میڈیکل کالج کے (دوسرے، تیسرے سال) حسین دنوں کو منور کیا ہے۔ پہلا پوسٹ مارٹم کالج میگزین کی اشاعت، پکنک پروگرام وغیرہ کی یادوں کو سادگی سے قلم بند کیا۔ اساتذہ خصوصاً پروفیسر صالح میمن کو عقیدت سے یاد کیا ہے۔

نوید سروش (میر پور خاص)

برادرم گلزار جاوید، سلامتی کی دعائیں۔

چہارسو کا تازہ شمارہ پڑھنے کے بعد بندہ یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ آپ ایک غوطہ خور کی طرح ادبی سمندر میں غوطہ لگا کر ایسے قیمتی گوہر تلاش کر لے آتے ہو جن کی خوبصورتی کی تعریف کیے بنا رہا نہیں جاتا ہے۔ خواہ وہ شباب للت ہوں یا پھر پنجابی کے فخرِ زمان یا موجودہ شمارے میں جناب مہندر پرتاپ چاند صاحب۔ تینوں گوشوں میں آپ نے ان ادبی ہیروں کی جو چمک چہارسو کے صفحوں پر بکھیری ہے وہ قابلِ غور ہی نہیں بلکہ ایک توجہ بھی ہے۔ تازہ شمارے میں جناب مہندر پرتاپ چاند صاحب سے بعنوان ''براہِ راست'' میں ادبی گفتگو پڑھ کر مسرت کے ساتھ نالج میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل سب نظر سے گزرتے ہیں۔ جناب مہندر پرتاپ چاند کا ادبی سفر کافی طویل ہے اور ان کی فارسی عربی کے علاوہ اردو زبان پر بھی گرفت مضبوط ہے۔ بذات خود ایک اچھے انسان ہیں جو خوبیاں ہوتی ہیں ان کے سنسکاروں اور خون میں شامل ہیں۔ مثلاً

سادگی، سنجیدگی، کھڑیا ہو یا متھا، جیسا چہرے کا رنگ اتنا ہی صاف اور شفاف کے علاوہ شاعری میں بھی اونچی اڑان، پرماتما اُن کی عمر دراز کرے اور اسی طرح ادب کی سیوا کرتے رہیں۔

افسانوں میں دو افسانے قابل غور ہی نہیں بلکہ قابل تعریف ہیں۔ محترم نند کشور وکرم صاحب نے اپنے افسانے ''وقت کی آواز'' میں ایسا آئینہ دکھایا ہے جس میں آج کے نوجوانوں کا چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ پچھلے زمانے میں بچوں کے رشتے گاؤں کے نائی وغیرہ لے کر آتے تھے پھر میرج بیورو والے آ گئے۔ اب بچے ماں باپ کو درکنار کر کے خود ہی جیون ساتھی ڈھونڈ لیتے ہیں لیکن گھوڑی پر چڑھنے پر ماں باپ کی سرپرستی ہونی ضروری ہے کیونکہ سماج میں سر اوپر اٹھا کر چلنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ دوسرا افسانہ مراق مرزا کا ''پگھلتے لمحوں کی تصویر'' میں بھی آج کے دور کے کئی گھروں کی کہانی ہے۔ ماں باپ کے تئیں بچوں کی جو حالت یہ ہے وہ جگ پہ ظاہر ہے۔ اگر تفصیل سے ذکر کیا جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

آپ کا خط صدر امریکہ کے نام ایک سندیش ہی نہیں بلکہ آنے والے وقت کی آگاہی ہے۔ کاش امریکہ جیسا امیر ملک اپنا پیسہ کسی اچھے کاز کے لیے صرف کرتا تو انسانیت کا بھلا ہوتا۔ ہتھیاروں اور بموں کا حشر ہم لوگ دوسری عالمگیر جنگ میں سہہ چکے ہیں۔ جاپان کی تباہی کے علاوہ ساری دنیا پر اس کا اثر پڑا تھا جس کے زخم آج بھی ہیروشیما اور ناگاساکی پر ہیں۔ نعتیں، غزلیں اور مضامین کے علاوہ نظمیں بھی اپنا تاثر چھوڑتی ہیں جس نے بھی لکھا اپنی جناب سے اچھا ہی لکھا ہوگا۔ سب کو مبارک باد۔ سرگودھا، لاہور، جھنگ اور ملتان کے نام پڑھ کر ماضی اور بچپن یاد آ جاتا ہے۔

امرناتھ دھمیجہ (لدھیانہ، بھارت)

مدیر محترم، سلام مسنون۔

ادارۂ چہارسو نے تخلیق کاروں اور دانشوروں کو جیتے جی اعزاز و امتیاز سے نواز کے ایک ایسی منفرد روش کا آغاز کیا ہے جس نے ارتقائی پذیر تسلسل سے اب ادبی عبادت کا لائقِ ستائش حد تک درجہ پا لیا ہے اور بقول قاسمی صاحب ''مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا'' کا بہت احسن انداز سے ازالہ کیا ہے۔

اس مرتبہ محترم مہندر پرتاپ چاند صاحب کا قرطاسِ اعزاز ان کی علمی و ادبی، تخلیقی و تحقیقی، تنقیدی و تہذیبی روایتوں و جہتوں کے ساتھ بے حد لائق مطالعہ ہے۔ حُسنِ سیرت، اعترافِ ہنر کا بھرپور اظہار اور بالخصوص یہ شعر:

چاند صاحب یہ خوش نصیبی ہے　　حالی ایوارڈ پا رہے ہیں آپ

انہوں نے ''براہِ راست'' کے لیے قابلِ تعریف حد تک متعلقہ تناظر کے ساتھ جملہ پہلو مدِ نظر رکھتے ہوئے نہایت مدلّل و مکمل جوابات دیئے نیز ان کی شعری و نثری تخلیقات اور ان سے متعلق دیگر ہمعصروں کی تحریریں و آراء بھی قارئین کے لیے تاثر انگیز، دانش و آگہی سے لبریز اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تفہیم و شناسائی اجاگر کرتی ہیں۔

افسانوں میں ''وقت کا طوفان'' مرّ وجہ سماجی و معاشی اقدار کی تبدیلی کا کامیاب آئینہ دار ہے۔ کبھی کبھی جان جوکھم میں ڈال کر بھی سبقت نصیب نہیں ہوتی۔ ''آسانی'' بہت آسانی سے پڑھ گئی مگر نا قابل فراموش یادوں کے ساتھ بہت مشکل تھی۔ عریضہ بنام امریکہ صدر اوباما صاحب بعنوان ''تاجدارِ اَلم'' اپنے روئے سخن، بیانیے، طرزِ تخاطب، بین السطور جرأت مندانہ اسلوب کے ساتھ طنز و تعریض، تضحیک و تحقیر کے امتزاج سے انفرادی نوعیت کا ادب پارہ بن گیا ہے۔ منظومات کا عنوان ''آسمان بولتا ہے'' اچھا لگا۔ فیض صاحب اور تاثیر صاحب پر مضامین بہت اچھے تھے۔

عباسی صاحب کی سفرنامہ نگاری کے حوالے سے ''ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں'' کے عنوان سے محترمہ نیلوفر عباسی نے اُن کی علالت کے آخری دور اپنے کی جس دلسوزی، دردمندی و اخلاص مندی سے لمحہ بہ لمحہ روداد قلمبند کی ہے وہ حقیقت سے قریب تر ہونے کے باعث یوں محسوس ہوتی ہے جیسے ہم اُن کی ویڈیو واچ کر رہے ہوں۔ امید ہے محترم عبداللہ جاوید اور شہناز خانم عابدی صاحبہ اب روبصحت ہو چکے ہوں گے جیسا کہ ''چہارسو'' میں اُن کی پر خلوص شمولیت سے اظہار ہوتا ہے۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

گلزار جاوید صاحب، تسلیم۔

چند روز ہوئے آپ کا اور ہمارا بھی مقبول و معروف مجلّہ ''چہارسو'' ہمدست ہوا جس میں قارئین کرام کے خطوط سے پتا چلا کہ پچھلا شمارہ شباب للت صاحب کی ادبی زندگی پر مشتمل تھا جس میں موصوف کی علمی بصیرت کے علاوہ اور بہت سے اوصافِ حمیدہ پر بھرپور روشنی ڈالی گئی تھی۔ آپ کی نظرِ عنایت سے اور ڈاکٹر رینو بہل صاحبہ کے توسط سے ''چہارسو'' ملنے پر راقم السطور نے حضرت شباب للت کی خدمت میں مبارک باد کا خط ارسال کیا تو جواب میں انہوں نے بھی مذکورہ شمارے کی سبھی اہم تحریروں کے علاوہ اپنی موجودہ صحت اور آپ کی ادب نوازی و بندہ پروری کا اس ڈھنگ سے خلاصہ کیا کہ مجھ کھٹور دل پر بھی اُن کی اور آپ کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا۔ ایسا ہو بھی کیوں نا ''چہارسو'' کے آغاز ہی میں زیرِ سالانہ کے طور پر ''دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ'' جو لکھا ہوا ہے۔ انشاءاللہ اس نیک عمل کا اجر یہاں بھی اور جنت میں بھی آپ کو ملتا رہے گا۔ آمین۔

شمارہ جولائی اگست ۲۰۱۳ء میں پنجابی شعر و ادب کے نامور قلمکار جناب فخر زمان صاحب کی تمام تخلیقات میٹھے گڑ گنّا کی سی ہیں۔ علاوہ ازیں موصوف کے فن اور اُن کی شخصیت پر آراء گرامی بھی پڑھنے لائق ہیں جس میں پنجابی شعر و ادب کی امرادیبہ امرتا پریتم کا مضمون ''جہنم کی آگ'' کو پڑھتے ہوئے دل بھر آیا کہ آہ! اس مختصر تحریر میں اتنا سوزِ درون!! ظاہر ہے کسی حساس ادیب کی کتابیں جلانا اس کے بچوں کو جلانے کے مترادف ہوتا ہے۔ ''زرد

ستارے'' کی سبھی غزلیں رگِ جاں میں نشتر چبھوتی چلی جاتی ہیں۔اس شمارے کی اور کتھا کہانیاں بھی دامنِ دل کھینچتی ہیں۔

اجیت سنگھ حسرتؔ (لدھیانہ، بھارت)

گلزار جاوید، اسلام علیکم۔

ماہ ستمبر کا ''چہارسو'' آپ کے فراخدلانہ طرزِ عمل کی معطّر معطّر خوشبو لئے میرے گوشۂ تنہائی میں آ پہنچا۔ بسا اوقات محبت بھرے رویے بھی آنکھوں کو نمناک کر دیتے ہیں۔آپ کے لیے یہی کہہ سکتی ہوں ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں زمانے میں''۔ اللہ پاک کی لازوال رحمت کی برکھا آپ پر سدا برستی رہے۔ ''قرطاسِ اعزاز مہندر پرتاپ چاندؔ'' اور اُن کے پرستاروں کی دلکش و دل پذیر تحریروں سے جگمگا رہا ہے۔''براہِ راست'' کے سوال و جواب سے خوب لُطف اندوز ہوئی۔ چاند کا سادہ اور مؤثر انداز بیان پڑھیے۔''ماضی کی یادیں ایک حساس فنکار کو ہمیشہ بہت عزیز ہوتی ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات کچھ کڑوی یادوں کی کسک بھی میٹھی اور راحت بخش لگتی ہے۔ لیجیے اپنی ایک غزل کا مقطع آپ کی نذر کر رہا ہوں''

سینے سے لگا لو، اسے پلکوں پہ سجالو
اے چاندؔ یہ بیتے ہوئے لمحوں کی چبھن ہے

''دیکھا جائے تو اس دھرتی پر ہر شخص زخم خوردہ ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسانی زندگی کو متوازن رکھنے کے لیے عیش و نشاط کے ساتھ ساتھ غم و آلام کا ہونا بھی ضروری ہے۔ الم نواز اور دردمند قارئین کو ایسی تحریریں پڑھ کر دلی سکون حاصل ہوتا ہے''۔ گلزار جاوید! چہارسو کو آپ نے اپنے نام کی مناسبت سے چمن زار بنا رکھا ہے۔ مہکتی مہکتی شام جان کو معطّر کرنے والی دل نواز تحریریں۔ مہندر پرتاپ چاند کی ایک خوبصورت غزل میرے دل کی آواز ہے ''تم اور تمہارا چہرہ'' یہ غزل میں نے اپنی دل نشین دوست عذرا اصغر کے نام کر دی ہے۔ یہ چوری تو نہیں ہے محبت و عقیدت میرا شعار ہے۔ اُس غزل کا ایک شعر حاضر ہے:

بکھرنے پائے نہ خوشبو کبھی یہ رشتوں کی
مہک تمہاری وفا کی نہ ہو کبھی بدنام

جمیلہ شبنم (اسلام آباد)

عزیز القدر جناب گلزار جاوید صاحب، خلوص۔

''چہارسو'' کا ستمبر اکتوبر کا بہترین شمارہ میرے عزیز دوست جناب مہندر پرتاپ چاند کی ذات و صفات اور فکر و فن سے منسوب کر کے آپ نے ادبی دنیا پر جو کرم کیا ہے اس کے لیے ادب نواز دوست سرحد کے دونوں طرف ہمیشہ آپ کے بے حد مشکور و ممنون رہیں گے۔ چاندؔ واقعی ادبی دنیا کے ''چاند'' ہیں جس کی کرنوں سے برصغیر ہندو پاک کی ادبی محفلیں ہمیشہ جگمگاتی رہی ہیں اور رہتی دنیا تک جگمگاتی رہیں گی۔ ''چہارسو'' کے اس شمارے میں آپ نے اپنی ادارت کا حق پوری طرح ادا کیا ہے۔ خدا کرے آپ اسی طرح اپنی ان تھک محنت اور بیش بہا لگن کا ثبوت دیتے ہوئے ایسے ہی بہترین کارنامے بار بار دہراتے رہیں تا کہ لوگ مشہور انگریزی شاعر Thomasgray کی اس تلخ سچائی کو بالائے طاق رکھنے کی جرأت کر سکیں جو اُن کے اِن چار مصرعوں کی بنیاد ہیں:

Full Many A Gem of Purest Ray Serene
The Dark Unfarhomed Caves of Ocean Bear,
Full Many A Flower is Born To Blush Unseen
And Waste Its Fragrance On The Desert Air.

ڈاکٹر کمار پانی پتی (بھارت)

جناب گلزار جاوید صاحب، آداب۔

اس بار قرطاسِ اعزاز جناب مہندر پرتاب چاندؔ صاحب کے نام دیکھا تو بے اختیار دل سے واہ نکلی، آپ نے پاک و ہند کے خوبصورت ادیبوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا کیا ہی عمدہ طریقہ چنا ہے سبحان اللہ۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ ہمیشہ ایسی ہی شخصیتوں سے ہمارا تعارف کرواتے رہیں گے جن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا ہماری جستجو رہتی ہے۔

چاندؔ صاحب کا انٹرویو بہت دلچسپ تھا ایک سوال کے جواب میں جب اُنہوں نے تقسیم کے حوالے سے کہا 'کہ یہ سب سیاسی لیڈروں کی ناعقبت اندیشی کا خمیازہ تھا جسے دونوں ملکوں کے عوام اب تک بھگت رہے ہیں'' میں بھی اس بات سے متفق ہوں، کیوں؟ اس کی بہت ساری وجوہات ہیں اگر تقسیم کے عمل کو غور سے دیکھا جائے تو یہ سازش بے نقاب ہو جائے گی مگر ہمارے مزاج میں یہ عنصر پایا جاتا ہے کہ نہ ہم کبھی اپنے بڑوں کی غلطیوں کو مانتے ہیں اور نہ ہی اُن کی غلطیوں سے خود کچھ سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چاندؔ صاحب کے غزلیہ کلام سے انتخاب خوب ہے۔

حصّہ غزل میں جمال نقوی صاحب کی غزل عہدِ حاضر کی بولتی تصویر تھی جب کہ غالب عرفان صاحب کا لہجہ اس بار بھی منفرد انداز لیے ہوئے تھا، جناب خیال آفاقی اور جناب نسیم سحر کی غزلیں بھی خوب تھیں ساتھ ہی غلام نبی اعوان صاحب کی ردیف خود بھی بول رہی تھی، نعیم الدین نظر اور عارف شفیق صاحب کی غزلیں بھی خوبصورت انداز لیے ہوئے تھیں۔

'رشتے خون کے' شگفتہ نازلی اور 'معتبر نامعتبر ہونے کو ہے' ڈاکٹر انیس الرحمٰن صاحب کی نظمیں دل میں اترتی محسوس ہوئیں۔ دیپک کنول صاحب کی تحریر ویسے تو سب سے آخری صفحات پر ہوتی ہیں مگر میں سب سے پہلے اُنھیں کو پڑھتی ہوں بلکہ اب تو انتظار رہتا ہے کہ وہ اس بار کس فنکار پر قلم اُٹھائیں گے۔ اُن کی اس معلوماتی اور خوبصورت طرزِ تحریر پر وہ مبارک باد کے حق دار ہیں، وہ ہر بار کامیابی سے کسی فنکار کے سفر کے آغاز سے شروع کرتے ہوئے ہمیں اُن کے فنی سفر کے عروج اور زوال تک کی سیر کرواتے ہیں۔

رومانہ رومی (کراچی)

---- سُخن آئینہ ----

مظفرایرج ذات اورکائنات کی جانب جوتخلیقی طرزاختیار کرتے ہیں وہ صنعتی تمدن مادّی آسودگی اورروحانی فخر کے عالمگیراور پیچیدہ سلسلوں کے بیانات وہ پیچیدگی اختیارنہیں کرتے جوشخصی تجربہ محض بن کررہ جائیں اورانہیں ذاتی یاموروثی انسلاک کےعلاوہ قبول کرنے میں آمد کی مجبوری محسوس ہوجبکہ موجودہ عہد کےشعوراور وقت کے حصار میں گھرے ہوئے انسانوں کی عارضی الجھنوں سے لےکرابدی الجھنوں کےبعض پہلوؤں پربھی اظہارخیال ان کی شاعری میں ملتاہے۔انسان توانائی کی جانب آزادانہ اورمقصود فی النفس مظہر کی مانند ذہن کوراغب کرنے کے لیےبعض مقامات پرمظفرایرج نے فلسفے کی ہیٔت کوصیغۂ اظہار میں منتقل کرنے کی کوشش بھی کی ہےاورکافی حدتک کامیاب بھی رہے ہیں اس طرح ایک طرف توان کےتخلیقی وجدان کی راہ جدیدفلسفیانہ اثاث کی راہوں سے جاملتی ہےدوسری طرف نئی شاعری جس کے نشانات فرداورسماج کے داخل اورخارج میں گردش کرتے منتشرعناصر میں پیوست ہیں،ان کی تخلیقی غزلوں کاپتہ دیتے ہیں۔

----پروفیسرقدوس جاوید

اشاعت ۲۰۱۳، قیمت ۵۰۰روپے، براق پبلی کیشنز، سری نگر، کشمیر۔

---- صادق سےزُہیر ----

میں نے زُہیر کنجاہی کے شعری مجموعہ جات کاخوب مطالعہ کیاہے، پھران کی نثری کتب کوبھی بغور پڑھا کئی بارادبی محفلوں میں انہی کی زبانی ان کا کلام سننے کا اتفاق بھی ہوا۔میں تو یہی کہوں گا کہ زُہیر کنجاہی فقیرطبع، درویش اورگلی گلی ''الکھ جگانے'' والے جوگی ہی کی طرح ہیں۔تکبر،غروراورخودنمائی جیسی برائیاں ان کی ذات سے کوسوں دور ہیں۔ہاں ان کی ذات میں پیار، محبت، چاہت اورانس جیسا خزانہ بدرجہ اتم موجود ہے۔دھیما لہجہ، سادہ گفتاراور معیاری کردار بھی اس شخصیت کی پہچان ہےاس شخصیت میں ٹھہراؤضرور ہے سستی بالکل بھی نہیں۔احسان فیصل کنجاہی نے اس اہم شخصیت کی زندگی سے جڑے لاتعداد پہلوؤں کو انٹرویو کی شکل میں نہایت مہارت کے ساتھ شگفتہ الفاظی میں یوں پیش کیا جیسے کوئی شاعراپنی نہایت پسندیدہ غزل کواہلِ ذوق کی محفل میں پیش کرتا ہے۔

----طاہروزیرآبادی

اشاعت ۲۰۱۳ء، قیمت ۲۰۰، کامرانیاں پبلی کیشنز، کنجاہ، گجرات۔

---- راہداری میں گونجتی نظم ----

ماضی کے بغیرحال بے معنی ہےاورحال کوسجھے بغیرمستقبل کے کوئی معنی نہیں۔زمانوں کاتسلسل ہی تاریخ کی بنیاد ہے۔فہیم شناس کی نظموں میں یہ تسلسل جہاں اُن کی فکری وسعت کی نشاندہی کرتا ہے وہاں حال کوسمجھنے کی ان کی کوششوں کوبھی اعتبار بخشتا ہےاور مستقبل کے بارے میں ان کے خدشات کا اظہار بھی کرتا ہے۔فکری اعتبار سے وہ ایک مضبوط بنیاد کے شاعر ہیں ان کی نظریاتی حدیں واضح ہیں۔یہ محض جذباتی نہیں بلکہ فکری ہیں۔اپنے تاریخی تناظر کوسمجھے بغیرعصری شعور کوسمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔فہیم کی نظموں کی فکری گہرائی بتاتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے تاریخی تناظر کوسمجھتے ہیں بلکہ اس سے جذباتی لگاؤ بھی رکھتے ہیں۔اوراسی پس منظرکوانہوں نے حال کے زوال کوسمجھنے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش ایک ترقی پسندانہ اندازِفکر کا غماز ہے۔نظم میں کہانی پن اورڈرامائیت نہ صرف اس کے ابلاغ میں معاون ہوتی ہے بلکہ نظم میں دلچسپی بھی پیدا کر دیتی ہے۔فہیم کے یہاں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ان کی اکثرنظموں میں کہانی اپنے تکنیکی مراحل سے گزرکرفکری اکائی بنتی ہے۔اورڈرامائیت کا پہلوقاری کوگرفت میں لیے رہتا ہے۔اس حوالے سے وہ ن م راشد کی روایت کے شاعر ہیں۔راشد کی طرح ان کی نظموں میں بھی کہانی اورڈرامائیت موجود ہیں۔راشد بڑے شاعر ہیں۔فہیم کواس منزل تک پہنچنے میں ابھی وقت لگے گا، سفرطویل ہےلیکن تیور بتاتے ہیں کہ ان کے لیے یہ اتنا ناممکن بھی نہیں۔

----ڈاکٹررشیدامجد

اشاعت ۲۰۱۳، قیمت ۳۰۰روپے، دنیازادپبلی کیشنز، کراچی۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
FIRE WOOD
MICHIGAN